

بہلا دے رنگ کالے

فائزہ افتخار



”پھلاں ہوں رنگ کالے“ میرے خلقی سر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک۔ اسی لیے جب ادارہ خاتون ڈائجسٹ نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے خود امتحان کو یہ ناول تجویز کیا۔

اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتانی چلوں کہ اس کی کہانی واقعات سبب تک فرضی ہیں مگر کردار تقریباً ”حقیقی“۔ بسم اللہ جان، حضرتی، ڈاکٹر خورشید، غٹ شملے، رجم گل، ارباب خلک، یہ میرے بچپن کے بہت دیکھے بھالے کردار ہیں جنہیں میں نے اس بچپن کے ساتھ اس کہانی میں دم لگایا ہے کہ یہ ناول ان کی نظروں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر انکھیں اب لاپرواہی میں سوچ رہی ہیں۔ دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے وہ یہ کہ اس سے قبل میں نے کبھی غویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً ”رسمی“ ہوں اور کچھ کچھ سہل پسند بھی، لیکن اس کہانی نے خود اپنا آپ بچہ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود پے گستا اور سہل پسند کا لکھنا آتا رہی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار ”مومنہ“ کا ہے۔ میں نے کو شش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچا سکوں، جس طرح انہوں نے مجھے حاشا کیا اور لکھنے سے آگیا۔

مجھ سے کہنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مردوں کو ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا بھی ارادہ نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثر انگیز کردار مردانہ ہوتے ہیں اور ان بہت سے کرداروں میں سے ایک ”عاشر ملک“ ہے۔ ”مارے گلاب لے جانا“ ”عاشر ملک“ عاشق کی بارانی کردار نہیں ہے نہ ہی کوئی مثالی مرد۔ اس حاشا کے ایک عام سوچے بہت سی خجانت و جہالت، کشش کے ساتھ ساتھ وہی دوجائی فلسفہ رکھنے والا ایک مرد جو اپنے سے آگے کسی کو دیکھ نہیں سکتا، بالخصوص کسی عورت کو جسے جو رقاہت کی آگ میں اپنے سب سے رشتوں کو بھی جھٹھکتے تیار نہیں ہوتا۔ ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، ایسا مرد جو ”برائی“ ہوئی عورت کے بارے میں وہی غرورہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے حوٹے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے لکھارہنے کی کوشش کی ہے۔

اور میری عام سے خاص اور خاص سے خاص تر بننے کا کیا ہے۔ یعنی خوار خصال کا عمل جس عمل سے گزر کے ہی عاشر ملک میری کہانی کا ہیرو بنتا، ذرہ ابتدا سے اختتام سے ذرا پہلے تک اس کا عام ہونا جن باتوں کا توں برقرار رہا۔

آپ کو یہ کردار عام لگتا ہے یا خاص اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔ میرا کتابی شکل میں چھپنے والا پہلا ناول ہے کہ آپ بچہ میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کسی کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی لیتے ہیں۔

فائزہ اختر کا راجہ اور

پھلاں دے رنگ کالے

پچھلے سال چھٹیوں کے بعد وہ جو یادیں لے کے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، وہی سرد روئے اس بار بھی اس کے استقبال کو موجود تھے، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی بی بی جان کی برقی ٹیڑھے چھوٹی لگاہیں، وہی چچی جان کا ڈھوپ چھاؤں سا مزاج، وہی تانی امی کا لافعل سارویہ، وہی کزنز کا گریز اور وہی درو پوار کی اجنبیت، باچا جان کی طبیعت میں بھی اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی انہیں بستر پہ اسی طرح موت کی آہٹیں سننے دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چپک کر رہی ہوتی اور ان کی کوئی نہ کوئی بہو یہ بیقرہ کر رہی ہوتی۔

”باچا جان اس بار بچے نہیں لگتے، خدائے کرے۔“ اور خدا برسوں سے خیر کرتا چلا آ رہا تھا اور باچا جان فانی، ہارٹ ایک، کینسر اور شوگر کے ہر ہر حملے کے بعد بچا جاتے تھے اور اگر کسی طبیعت بہت پھٹکی ہوئی تو زبان سے چند ٹوٹے چھوٹے لفظ بھی ادا کر لیتے، ورنہ فانی نے ان کا تھلا دھڑوٹا مفلوج کیا ہی تھا، موت کو بانی بھی ستار کی تھی۔ اس بار بھی شاید طبیعت کچھ بہتر تھی، جیسا ساری اولاد کے اکٹھا ہونے پر انہوں نے وکیل کو بلوا کر وصیت تیار کروائی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے پہ تھے کہ ان کا وصیت تیار کرنا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ انہوں نے تو یہ ہوئی کہ انہوں نے تمام اولاد میں برابر ترکہ تقسیم کرنے کے بعد اولاد کی اولاد میں سے صرف ایک پوتی مقدس زریاب کو اختیاری حیثیت سے اپنے پرستار کا ڈنٹ اور خاندانی نوادرات و زیورات کا وارث قرار دیا۔

اکا ڈنٹ کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، البتہ نوادرات و زیورات کا تخمینہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں لگایا جاتا تھا۔ اگرچہ انہیں بچپنا خاندانی حرمت و وقار کے سناٹی تھا

لیکن بڑی بات تو یہ تھی کہ نسلوں سے یہ ترکہ خاندان کے بڑے بیٹے کی ملکیت میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری آئین تھا جس کی زوے تاجا جان افراسیاب خٹک اس کے امین تھے اور باچا جان نے بڑے اور چھوٹے کو چھوڑ کر خاندانی عظمت کی یہ نشانیاں اپنی پوتی کو سونپنے کی وصیت کی تھی، ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں خشک بھی جانی گئی۔ نفرت، کراہیت، گریز، لافلتی کے وار تو بچپن سے سختی چلی آ رہی تھی باچا جان کے پھیلے بیٹے زریاب خٹک کی اکلوتی اولاد مقدس، اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

”داؤ، کتنی بیماری ہے ناں سانقا، بالکل سنڈر پلا جیسی۔“

فارحہ نے لیٹ ایلمینٹ لینے والی اپنی نئی فریج کلاس فیلڈو دیکھ کے کوئی چوٹی بارکھا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سنووائٹ اور بارنی ڈول کے خطاب بھی دے چکی تھی۔ یہ پشاور کا سب سے مشہور کالونٹ تھا جہاں اکثر مالک کے سفارت کاروں کے بیچے زیر تعلیم تھے۔

”سنڈر پلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا نہیں کیا؟“ ریمانے چاکلیٹ سے چپکنے ہاتھ لٹو سے پوچھتے ہوئے رنگ وحدد کے پٹے ٹیلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرنل، فریج فمیلر کے بچوں کو ملنے والی وجہ ہے وہ اکثر مجلس راقی۔

”اور کیا، وائٹ فمیلش ہونے سے ہر کوئی سنووائٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سانقا۔“ شادو ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ کزن کے گلے میں پانچیں ڈال کے اسے گنگٹوں میں کھینچ لائی۔

”لیکن وہ فارنر ہے۔“ فاریہ اپنے پوائنٹ پزور دیتے ہوئے بولی۔

”تو کیا ہوا؟“ شادو چپا چپا کے بولی۔ ”مقدس کی مدر بھی فارنر ہیں۔“

”رینلی؟“ نو عمر کی بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایکساٹمنٹ کے چلا اٹھا۔ جب کہ خود مقدس حیرت سے لگک بنی شادو اپنی چھوٹی زاد کو کھتی رہی۔ خود اس کی نو سالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

”آئی سویر، میں نے خود سنا ہے۔“ وہ مقدس کی طرف پلٹی۔

”یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں تاشا آئی کی اسکول فرینڈ بھی آئی تھیں انہوں نے آئی سے کہا کہ ویسے تو تم سبھی کزن پرینی ہو مگر اس لال گرل کے فچر ز بہت شارب ہیں اور لک بھی انگلش ہے جب تانی آئی تو کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آئی فارنر ہیں اور ماں بھی ہیں مقدس ہو جہاں اپنی مدر جیسی ہے۔“

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے، کتنا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیکٹرانک دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کنبے میں پرورش پاری ہو، لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا ہو، چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شادو اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کی واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریوں سننے کی عمر میں جب شادو اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گھڑ کے سنایا کرتی کہ کل رما پر یوں کے سے سہری پر لگا کے کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گھس گھس تو وہ ادھر ادھر دیکھتے گئی۔

شادو کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بیٹی سے ملنے آتا اپنی شریک حیات کی یادیں تازہ کرتا، ثانی تھی جو انوی گروڈ میں بٹھا کے بیٹی کے کچپن کی شرارتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو پڑتی، ماں کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سرہانے پائیک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی بگلی کی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی زلفات جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتہ جو انوی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور اگر اس گھر کے کمپن اس کی ماں کا نام نہیں لینے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ کچھ ایسی حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود ہے جو ابھی اس عالیشان گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط یہ کیا۔

مقدس زریاب نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ارد گرد رشتوں کا نجوم دیکھا، دل کا نہ کسی مگر خون کے رشتوں کا۔ چچا جان تھے جس کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برا بھلا ویسے بھی وہ اپنی لا باہلی فطرت کے تحت اپنے کے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمینیں، ان کی بڑی بڑی موچھوں اور لمبی لمبی گریں رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی مٹھلیں، گھر میں وہ کم ہی نکلتے یا پھر اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھنے ماحول سے سدا کی بیزاری تھی، بچپن جو بے حد موڈی سی تھی، کبھی تو اپنے بچوں کے نجوم میں اس کا اور شادو کا بے ضرر سا وجود انہیں سے طرح ٹھککتا، بلا وجہ چڑ جاتیں وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اظہار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ بھل کر بد ہتھ بھ ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی۔ البتہ شادو کو بی بی جان یعنی اس کی سگی نانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے وہ جتنا ہی دیتیں۔ کبھی کبھی بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاص مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں

نے محبت و شفقت کے نام پہ نہ کھی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدور بھر خیال ضرور رکھا۔

طرح سے دیکھتے رہتا ہے جد پسند تھا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے باپا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باپ کی کئی قدر اور تعادیر آدیاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ سالوں کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر شقی تو تسکین کے بجائے عجیب سی دشت دل کو گھیر لیتی۔

اسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلوٹا اور شادو تانی آئی کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔ ”نقنی خوب صورت لگ رہی تھیں آئی۔ میرون شرارے میں اور ان کی لائی گردن میں وہ گھو بند کتا چ رہا تھا۔“ یہ پلوٹا کی رائے تھی۔

”اتنے میک اپ اور جیلری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔“ شادو کی متاثرہ آئی کے ساتھ کم ہی ہنسی تھی۔

”خرا کی بات بھی نہیں۔ وہ بے بسی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری فیملی میں صرف انہی کی آنکھیں اور بال بلیک ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔“ مقدس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ اس نے تو تانیہ زیادہ اٹریکٹو ہے۔ میری بھی ہانٹ کچھ کم ہے، لیکن خیر ابھی میری اتنی بھی توفیق نہیں ہے، تھوڑی سی ہانٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری تانی آئی کیا لگیں گی میرے آگے تم دونوں بھی اچھی لگوگی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگوگی دیکھ لینا اور یہ مقدس تو ہے ہی پوئی کوئین۔“

”پتہ ہے شادو، ماما کہتی ہیں انہوں نے پاپا سے سنا ہے، مقدس کی ماما بے حد خوبصورت تھیں، ایسے جیسے کوئی پری، انہوں نے آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، ماما کہتی ہیں ایسی تعریفیں سن سُن کے ان کا اکثر پیچھا چاتا ہے کاش انہوں نے پیچھا ہی نہ کیا ہو ماما کو دیکھا ہوتا۔“

اس نے تانیہ پاپا کے لیے مقدس کی طرف دیکھا جو بے دھیانی میں سبز حیاں اُترتی بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ جگے آگوری رنگ کے چارچٹ کے شلوار قمیض چکن کی کمری کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کسی قدر یادگار لگ رہی تھیں۔ سلیٹے کے کندھے ہالوں پہ باریک نشون کا دوپٹہ تھا۔ کالوں سے لگی ہالوں کے ساتھ موہے کی تازہ اُدھ کھلی کلیاں لٹکی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس پر نہیں پڑی تھی، اس لیے اس کے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے حجب تاثرات ناپید تھے۔ اس نے سنا ہے وہ کیوں اس بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے بھی کبھاری انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اُٹھی۔

”بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی ہے نا؟“

چچا جان اور مرحومہ پھوپھی بی بی جان کی بھی اولاد تھی۔ پھوپھی شادی کے ایک سال بعد ہی شادو کو ختم دیتے ہی مر گئیں وہ اور شادو تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دراب چچا کی انوشہ اور پلوٹا ان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان بڑواں بہنوں کے بعد ان کے اوپر تلے کے تین بیٹے تھے۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خلک اور بابا جان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سیٹل تھے وہ کچھ سیاست وغیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رویہ بھی کچھ مختلف تھا۔ انہوں نے بھی نظریہ رکھے کہ کسی سگے ماں جانے کی اکلوتی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کسی ہمت نہ ہوتی ان سے بات کرنے کی، اگر کسی بھولے بھٹکے ان کی نگاہ اس پہ پڑ بھی جاتی تو سرخ و سفید چہرہ دیکھنے لگا۔ بڑی بڑی بادی آکھیں بھر رنگ ہو جائیں اور وہ لمبے ڈنگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اُٹھتے بیٹھتے، بولتے مسکراتے ہر

اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھلے ایک انکشافات کے ساتھ۔ وہ بدن پہ لگی چٹوں اور ملازموں تک کے سامنے ملے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں یتیم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھوج میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا میری کیا اس کو طلاق مل گئی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا..... وہ دونوں اس دنیا کے کسی نہ کسی میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے لعلق کی ایک بدفما یادگار سے یکسر بے خبر یا بالکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نکل پڑی چٹوں پہ گرم گور کر تے ہوئے شاد منت کر رہی تھی۔
 ”مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رولو تو ہوا سا۔“
 ”شاؤ، کیا میری ماں ہندو تھی..... اور کیا اس کی وجہ سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟“ وہ بولی بھی تو صرف یہ۔

”دیکھو پہلی بات تو یہ کہ تم ماموں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور دوسرا یہ کہ میں نہیں مانتی تمہاری ماما ہندو تھیں۔ شاید وہ عیسائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہل کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔ تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر بی بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کہ ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔“

”تو پھر..... پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے بابا جان نے ان سے..... نک..... میرا مطلب ہے نکاح ہو ہی نہ ہو۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب و دانتوں سے کاٹ لیے گویا یہ بات فقور کرنا بھی کتنا اذیت ناک تھا اس کے لیے۔

”ہائمن..... اپنے خاندان کی روایات کو جانتی ہو تم اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی پاسداری کی جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں تمہاری ماما ایک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس خشک فیملی میں بہو کی حیثیت سے رہی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد ذاتی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لائے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پردادانے چھ چھ سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت..... تو بہ تو بہ ایسا تو سوچو بھی مت۔“ وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

”تو اگر میری ماما مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پھیلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔ کیوں انہیں ہندو، کافر کی اولاد دیکھے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔“ وہ احتجاجاً جالبک اٹھی۔

”اس لیے کیونکہ.....“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم گرم دودھ کا گلاس لے کے اندر داخل ہوئیں اور اس کی مشکل آسان کی۔

”دیکھتے بی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔“ شادو، سدا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے ”ن کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر تب تک وہ بی بی جان کو سیر حیاں نیچے اتر کر آنے کی مہلت دے بغیر شروع ہو چکی تھیں۔

”مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو یہ ہی تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں، لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ بی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ مجھے اس کی اپنی ماما۔ اس کے لیے دونوں ہی.....“
 بی بی جان کو طیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان لنگ ہو گئی اور مقدس کی انجانے جرم کے احساس سے سبھی، لرزتی ناگوں پہ کھڑی ہو گئی۔

”چنانچہ.....“ اگر کھل جہان کی تکلیف کو ہی خدا کا نام یاد جاتا ہے تو بے شک اس کی پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا ٹھپڑ تھا جو اسے ماں کے حوالے سے ملا تھا۔

”تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اصل خاندان کی، عزت دار احمد شاہ کی مسلمان، ساری عمر اپنے دو کارکونینت سینت کر رکھتے گزر گئی۔ اور یہ..... یہ اس حرافہ کی نشانی، مجھے پل بھر میں دو کوڑی کا کر گئی۔ میرا نام اس ہندو کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد اور میں اس بد بخت کی نظر میں ایک جیسے ہی، بتا، کہاں دیکھ لی تو نے اس ہندو (ہندو عورت) کی کالی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے پھونک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کر توت، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی میرے بیٹے کو ذلت سے دو چار کر کے در بدر کر دیا۔ میرا خان برسوں سے اس کے انتظار میں نہ جی رہا ہے نہ سر رہا ہے۔“

تو تین کے احساس سے بھری بی بی جان اس پر دھیسوں کا مینڈل بھی پڑی تھیں اور پھر باچا جان کی حالت پر اُدھنی آواز میں روتے ہوئے نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے درو دیوار نے بھی شاید کسی خان زادی کی اتنی بلند آواز کو نہ سہیلے بارے نہ تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی سکتے ہیں آگئی ہوں اور وہ..... کھنکھنوں کے مل زمین پہ پٹھنی، نچے ہوئے بال، ادھر ہی آستین، سوچے رخصتوں اور ہونٹوں سے نکلنے خون سے بے خبر بی بی جان کا ایک ایک لفظ و ہر اسی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا

”اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رچ بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خلک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی ہاسی چادر اور چارو پوری کی پابندی برداشت نہیں کر پاتی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔“

تمہارے چچا ان دنوں بارہوگ پونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی مہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرن تھیں یا انگریز یا فرنگ۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی گزشتہ آجڑے کی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی لی جان نے بھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ بھانہ سکیں، نہ ہی مشرقی طور اطوار کے تقاضے پورے کر سکیں، شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، لالہ زریاب نے انہیں تو غیرت میں آ کر فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی جگ بھٹائی کے خوف سے کہیں رو پڑیں ہو گئے۔

خاندان کی ناموس پر لگا یہ ختم ہمارے بزرگ بھلائیں پار ہے۔“

”لیکن اس سارے قصے میں میرا قصور کہاں لکھا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ نارمل کیوں نہیں؟“ وہ سراہا سوال کی۔

”میں پھر وہی بات کہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانچے کو فراموش کر دیتے تمہارے ساتھ سب یں کے رچے، اپنا گھر سنا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلا وطنی اس زخم پہ کھرٹ نہیں آئے دیتی۔ ہر ظم کو فراموش کرنا چاہیے۔ جن زخموں کا منہ کھلا رہ جائے وہ نہیں تو دیتے ہی ہیں۔ تمہارا وجود باچا جان اور بڑے لالہ کو لالہ زریاب کی یاد دلاتا رہے گا۔ جو بچانے کہاں ہیں اور کب آئیں گے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں نے ان کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے، میں نے آج تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ الٹے انڈیا ورسون والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو ٹھونچنے کی بات کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں، وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین سچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے لے آئے۔“ انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

”جی نہیں کتا چچی جان۔“ اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔
 ”یہ کچڑو شانو، اسے ملاؤ اور یہ بھھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، میں اتنی ہی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، اسے اس کی عمر گھری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتادے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلانیں جاسکتا۔ اپنی زندگی کی تدر کر دو۔ اسے جیوا پنی پچکان خود بنانا۔“

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کئی ڈکالچ میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اپنی ہرگز اعتماد ہرگز نہیں تھی جتنے کڑے دلوں نے اسے بنادیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ اس کی ذات پہ کچھ اچھا لے والا نہیں تھا۔ کیسوی اور ڈھنی سکون نے اسے پڑھائی کی جانب راغب کر دیا، ساتھ ہی محلی صلاحیت مکمل کے کھر کے سامنے آ گئیں۔ اب وہ کالج کی ہونہار طالبہ تھی، ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو پختا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ دو ڈھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ وہ اس کے سونے در در جگا تا۔

تافیکہ شاد دھمی الف الف اے کرنے کے بعد اس کے چچے چچے لاہور چلی آئی۔ اس نے یہ عرصہ بھی بچانے کیسے اس کے بغیر گزارا تھا۔ بی بی جان تو بھی اسے نہ بھیجتیں مگر اس نے مقدس اپنے باپ جیو افریدی کے آگے پیش کیا جو اکثر و بیشتر اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ چھو پھولی وقت کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ اس گھر سے اپنا رشتہ ختم نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ بی بی جان کے وہ محض داماد ہی نہیں، گئے بھانجے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے والد اور باچا جان پچا زاد بھی تھے۔ یوں وہ ہلا تکلف آتے جاتے رہے۔ اس بار مقدس بھی وہیں تھی۔

”بابا جانی بلیئر بی بی جان کو کبھی نالے، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی ایس میں ایڈمیشن نہ دیا گیا تو مزید آگے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔“

یہ دھکی لی بی بی جان کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے افراسیاب خان کے بڑے بیٹے گل ریڑ خان خشک سے ملے تھے جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شان کو کمرے سے پرہائی کی طرف دھکی ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے ہیں، کہیں تعلیم کی کسی اور شے کے ختم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

”چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھیلنے کے شوق کا۔“ وہ سکرا کے بولے۔

”ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہرگز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تو کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟“

”نہیں وہ تمہارے مٹھلے ماموں، خان زر یاب خشک، وہ دیوانہ تھا تصویروں کا، رنگوں کا، حسن کا۔“ وہ خجائے کیوں اداں ہو گئے آخر چہچہیں، لڑکپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ شان اور ان کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بی بی جان کے سبب چہرے اور بابا کے شکستہ تیور دیکھ کر الجھی گئی۔ ماحول پر ایک بوجھل پن سا طاری تھا۔ مقدس عرسے بعد ابھرے تجسس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال میں پھنسا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک مقصد کی طرف مائل کیا تھا اس نے کچھ بن جانے کا اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شانور کے لاہور آ جانے سے بھی اس کی کیسٹوں میں خلل پڑا۔ وہ اکثر اچھانے میں اس کے خوابیدہ تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بھدھ ہو گئی۔

”تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو سہمی میں غلط نہیں کہہ رہی۔“

”میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔“

”قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو ہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، ورنہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ جچ پو پھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری سما ہی نہ ہوں۔ لیکن خبر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رخسار پر تل گودے ہوئے ہیں، یہ لہجہ گھٹھٹ نکالتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی اس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھو۔“

”لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی ناک دیکھنے کے لیے فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانو اب بڑی ہو جاوے، ایسی ایسی باتیں کرنی ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خواہوا مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس بناء پر کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔“ وہ ہیزاری سے بولی۔

”مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارے نقش نہیں ملتے، جب کہ ایک بالکل انجان عورت، ہمارے ہاسٹل کے کچن میں کام کرنے والی۔۔۔۔۔“

”پلیز شانور جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ چپ ہو گئی۔

”بی بی جان سے بڑی لمبی بحث کے بعد میں نے زر یاب ماموں کے اسٹوڈیو کی چابی حاصل کی ہے۔ چلو اٹھو ملتے ہیں۔“

”کیا؟ بابا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ مگر بی بی جان تو ان کے دونوں کمرے لاک رکھتی ہیں۔ کسی کو جانے کی اجازت نہیں، پھر تمہیں کیوں جانے دے رہی ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”بہت مشکل سے سمجھا پائی انہیں کہ اعلیٰ اسٹائنٹ کے لیے مجھے بالکل فریش اور یونیک (منفرد) آئیڈیا چاہیے اس کے لیے میں ماموں جان کی کچھ پیٹنگ اور ڈو ٹو کر افس دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ کچھ انپائریشن مل سکے۔“

”تو پھر جاؤ۔“ وہ میزین کے لیے کیم دراز ہو گئی۔ اس کی اطمینان بھری ”اجازت۔“ یہ شانور جل اٹھی۔

”کیوں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم کیوں نہیں آستین میرے ساتھ؟“

”وہیشو نا جان، میں چہچیسوں کے چند دن یہاں گزارنے آئی ہوں۔ مجھے سکون سے رہنے دو۔ میں نہیں چاہتی میرے کسی بھی مکمل سے بی بی جان کو میرا سال میں چند دن یہاں گزارنا بھی دو بھر لگے، تم جانتی ہو میری لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی میری کوئی بات ان کا پارہ چڑھا دیتی ہے۔ اس کمرے میں جانے کی اجازت صرف تمہیں ملی ہے

”کیوں تمہارے پاس کیا یہ جواز کم ہے کہ وہ تمہارے بابا جان کا کمرہ ہے۔ عجیب بے حس لڑکی ہو۔ وہ میرے ماموں ہیں جنہیں میں نے سچی دیکھا تک نہیں، لیکن آج پہلی بار ان کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس قدر اکیساٹھ ہوں۔ تم ان کی بیٹی ہو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم اس کمرے میں جاؤ جہاں انہوں نے چہرے بنائے ہو گے، ان چیزوں کو چھو جو کبھی ان کے استعمال میں رہیں۔ ان کی تخلیقات دیکھو۔“ اس نے اکسیا تو مقدس اداسی

سے مسکرا دی۔

”میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوا ہی ہوگا۔ میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے کبھی کو ان کا کبھی جی نہ چاہا۔“

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔ لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ ہر ایک انگشت بدن ان تھا۔ ہر فرد خصوصاً تاجا جان اور چچا جان اسے قہراً دو لنگہ ہوں سے گھورتے گزر رہے تھے۔ چچی جان نے اسے بی بی جان کے قہر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن بی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تاجا جان کے بلند کونے اسے دیواریں چیر کے دھکا رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا اس نے اپنی ذات اس گھر کے کینوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی دھوپ اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زیرِ عتاب تھی اور اس بار گرمی کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ پہلے ان کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حوالہ تھا۔ خاندان کو اس کے ماں باپ کی طرف سے ملے نقصانات کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود انہیں مشتعل کرنے کا باعث بنی تھی۔ اس کی خاطر اس کی بے مول و بے وقت ہستی کی خاطر باچا جان نے صمدی پرانی روایت توڑ ڈالی تھی۔ معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔ وہ خود نہیں سمجھ پاری تھی کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظر اندازی جانے والی پوچھنی کو خاندان بھر میں اہم بنانے جارہے ہیں۔

”لیکن ان کے اس عمل میں میری کون سی بھلائی ہو سکتی ہے۔“ وہ سوچتی رہی۔

”یہ لوگ، میرے سر پرست جو تمام تر کدورت کے باوجود میرے گمران کہلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں سے میری دشمنی پیدا کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ کیا تاجا جان بھی معاف کر پائیں گے میرا یہ تصور، کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا قاتل انجانے میں ہی کسی گھر بڑپ گئی۔ کیا بی بی جان کو گوارا ہوگا وہ باشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی تو ہیں سمجھتی ہیں، ان کے گھر اتنا آؤ نماز تہجد حاصل کر بیٹھے گی۔“

باچا جان تو قلم کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں، وہ مجھے دشمنوں کے گزرنے میں دیے جارہے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنا ہوگی۔ انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یہی بات کرنے کے لیے کہہ دیا ہے تو تھلے بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی

کہ ماں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔ آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آ رہی تھی۔ لیکن بس..... بس اتنا ہی..... اتنا ہی کافی ہے کہ..... میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس..... مگر مجھے دوسروں کی نگاہ میں تو غائب مت ٹھہرائے میں جھلسی ہوئی ہوں، تپتے مزا جوں کی مارے، انجانے جرموں کی سرا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک ماما بے وفائی اور بابا کی بے اعتنائی کی سرا میں جھلسی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت پہنچی پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے ہونا کتنا عظیم فخر اورے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعثِ افتخار ہے چاہے مجھے جہم اک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعثِ شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے برابر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل ہیں، جب کہ میرے خون میں ملاط ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے مجھے، مجھے نہیں جانے پناہ نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پر دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اُدھنی چٹوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم دھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد دھر دوڑ گئی اور یہ سرد دھار اس قدر خالص تھی کہ اس کا کلس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی نے اس کے وجود کو بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

باچا جان کا استخوانی وجود، اپنی بنی کبھی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وکیل صاحب بڑے غور سے اس دم بدیم ہوئی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی چٹان سنبھالی ہوئی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تاجا جان اسے راستے سے ہٹانے کے لیے شاید کوئی سیاسی چال چلنے کا سوچ رہے تھے اور..... اور..... بی بی جان ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا، لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کرے دل سے ایک ایک نیزگی پھسلتی جا رہی تھی۔

دھڑام.....

اس کے گھٹنے بے جان ہو کر مڑ گئے، وہ فرش پر گرنے ہی والی تھی کہ زس نے آگے بڑھ کے اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی قرسی پر ہی پڑ پڑے ہوئے ایک ہمدردی بھری

نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پہ ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

”لو بٹنا، یہاں سائن کر دو۔“ وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔

”یہ تحریری ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پہ کوئی اعتراض نہیں جس کی رو سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آ رہے جتنی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوص نیت سے کرنے کی پابند ہوگی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفہ یا قینا تو دینے کی ممانعت ہے۔“

”ایک منٹ وکیل صاحب“ تایا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”باجا جان ایک بار اور سوچ لیجئے، آپ جذباتی ہو گئے ہیں فیصلہ کر رہے ہیں۔ لیکن باجا جان نے اُن سنی کرتے ہوئے اپنا نیلی اُبھری ہوئی، زخمی رگوں والا ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کچپکا پتا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے ٹھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے ہنس ہوا تو ان کی کچپکا ہٹ بھی بھجھ ہوئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کر اس کی گود میں آگرا۔

”اوخدا، یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ نرس، نرس۔“ وکیل صاحب نے امیر خنی تیل دینے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دیں۔

باجا جان سر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔

”او، بی پی بہت لو ہے۔ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لوبی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیلیفٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوا دیجئے۔“ ان کے ہوش میں آنے پہ وہ دوس کی۔ ”وہ ہاتھ پیر پہلا تے ہوئے ہوئی۔

”یہاں..... اسے..... اوپر لاؤ“ باجا جان ہمت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڑ پہ ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔

”سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔“ وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”خان صاحب مجھے اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ

☆ ☆ ☆ پھر مجھے طلب کر لیجئے خدا حافظ۔

نیرے ہوش کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گہرے سایوں کے نرے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں ترخ ترخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھاتا چاہتی ہے، لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا۔ وہ جھٹی جھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلاتی رہی اور تایا جان، چچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پر کھینچے اڑا رہے تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

”مگر میں..... میں تو..... بی بی جان نے میرے لیوں پہ پھیلی جمار کھی ہے اور..... میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے ٹھمرے دیکھ رہی ہوں۔“

یہ خیال اس کے بے ہوشی میں ڈوبنے و وجود کو ہاتھ قلم کے ہوش کی سرحد پہ کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آتی آوازیں اسے یاد دلانے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

”آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باجا جان۔“

تایا جان کی آواز میں پر ہی جھی، غصہ تھا اور جھجھلاہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر و رسوخ، رعب و دبدبہ نہ رکھتے ہوئے بھی اس خجف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ اُن کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ کہنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

ہمارا خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابل احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ مجھے خشک فیملی کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ ہمارے ہاں باپ اپنے بڑے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آ رہے فتنی درے کی چابی دے کر اس کی جانشینی کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دے گا۔“

”تمہاری..... حیثیت پر..... کک..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ باجا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

”کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی آفت پہ اس وقت میرا نام ایک بے دارغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قاتلی اعتبار نہ جائیں، موصاف کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کرے گی۔ اگر آپ

نے اپنا فیصلہ نہ بدلتا تو اس بار بالکل سن میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری بہنوں برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموں کو اڑل جاتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں ترمیم کیجئے۔“ وہ منت پر اُتر آئے۔

”میرا فیصلہ..... اٹل..... ہے۔“

”پھر پھر ٹھیک ہے۔“ وہ جیوں میں ہاتھ دھونے کھڑے ہو گئے۔

”میں اپنا حق وصولنا بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام ہر حال میں بچاؤں گا۔ اپنے بے ہوشے اپنے سیاسی کیریئر کو میں آپ کی بلا جی کی ضد پر ہرگز قربان نہیں کروں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے چچا جان اور بی بی جان بھی چونک اُٹھیں آخر دراب پچانے ہوئے ملنے میں جاہل کی۔

”وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی

چاہیے۔“ جانتا ہوں، اسی لیے تو..... اس لیے تو۔“ وہ ہنسیاں بھینچنے لگے۔

”ورنہ اس کی صورت مجھے اس نامراد بد بخت عورت کی یاد دلا دیتی ہے۔ بھائی کی یاد نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی تھی میری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی رہتی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پر۔“

”اور انہیں یہ عہد بھمانا ہی ہے۔“ دراب خشک نے بے سوج انداز میں کہا۔

”خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میرا تو خیال ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ صبر و انتظار کریں۔ لالہ کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیجئے گا۔“ ان کی باوقوف پیش گوئی سن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آ گئی، اب اسے اپنا آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

”کہاں ہیں میرے بابا؟“

”کب آنے والے ہیں وہ؟“

”کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟“

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود نفوس کے چہروں سے کھرچ کر پڑھنا چاہتی تھی۔

”اور کیا پتا وہ بھی اس بد بخت کی صورت دیکھنا چاہے گا یا نہیں۔“ بی بی جان کے سفاک تہرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

”ای لیے..... اسی لیے تو..... میں یہ..... یہ کر رہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب

کی وجہ..... کم از کم اب تو..... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرتا ہے۔“ باچا جان کی دشوار اُکھڑی سانسوں میں مدھم فمدھم سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں میں پڑے۔

”بے وفا کی داغ بوبھی نہیں صاف ہو جاتے دلوں سے۔“ دراب چچا تنگی سے بولے۔ ”بھانجے کیا دھن سوار ہو گئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جائیداد میں اس لڑکی کو کھدہ وار بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا تعلق ہے۔ کیا مل جائے گا اس سارے بکھیرے سے۔“

”حلافی۔“ باچا جان کے کیوں کے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر رضا میں ٹھہر گیا۔ لحد بھر کوسب ساکت ہو گئے۔ تاجا جان اور چچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

”کیسی حلافی کیا ظلم ٹوٹے ہیں یہاں اس پر۔“ کچھ دیر بعد تاجا جان گویا ہوئے۔

”کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ رہی بات لاڈ پیار جتانے کی تو یہ دلوں کے معاملے ہیں اور خشک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو وجود آپ کے کھر ٹڈ کھر چتا رہے اسے آپ سر آ کھوں پر تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود اس سمجھ تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی..... پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی نا انصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ بڑھا رہا ہے تو اس کی حلافی کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔“ تاجا جان نے صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی دھمک اسے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

”ہاں ہے..... تم میں سے کون اسے اپنے بیٹے کے لیے عزت دے گا۔“ اس پیش کش پر صرف بی بی جان چونکیں، تاجا جان اور چچا جان محض ایک دوسرے کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر رہ گئے اور خود مقدس..... وہ تو متوجع انکشافات سے لرز رہی تھی۔

”لیکن افراسیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شاد سے منسوب ہے۔“ بی بی جان نے خشکی بھرے انداز میں جتایا۔ ”اور دراب کے دونوں لڑکے۔“ انہوں نے کچھ کہنے سے قبل بیٹے کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے ایسے ہی تھا۔

”نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا جان۔“ تاجا جان نے کہا۔

”ہاں..... اتنا فرق..... یہ تو ظلم ہوگا اس پر..... ایک اور ظلم۔“

”کیوں خان!“ بی بی جان نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا۔ ”میری بیٹی کے لیے کسی کو بارہ سال کا فرق نظر نہ آیا۔ اس بد نصیب پہ کس نے یہ ظلم توڑا۔ کبھی اپنی انگوٹھی بیٹی کے ساتھ کی گئی نا انصافی کی علامتی کا خیال آیا آپ کو۔“ تایا جان کے بھریوں بھرے چہرے پہ وہ آنسو پھسل گئے۔ ان کی سانسوں کا زبردہ پھر پریشان ہونے لگا۔

”خدا کے لیے بی بی جان۔ اس قسم کے مسئلے مت چھیڑیں۔ ان کی حالت دیکھیں آپ۔“ کب سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھے دراب خٹک نے لپک کے باپ کو سنبھالا اور ان کا سینہ بھلانا لگا۔ افراسیاب خٹک نے نرس کو کال دے دی۔

”بی بی جان، خود کو سنبھالیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باچا جان بھی ٹھیک کہتے ہیں اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ بہر حال دراب کی بات میں بھی وزن ہے نہ سب کے آنے میں چندہا ہی رہ گئے ہیں۔ تب تک کے لیے اس مسئلے کو اٹھا کے رکھ دو۔ جو فیصلہ وہ کرے گا، مجھے اور دراب کو اعتراض نہیں ہوگا۔ نتواس خاندان میں وہ دیویاں رکھنے کا یہ پہلا واقعہ ہوگا اور نہ ہی عموں کا فرق کوئی انہونی چیز ہے، یہاں سب ہوتا چلا آیا ہے۔“ افراسیاب خٹک نے تسلی دی۔

”باچا جان کو آکسیجن لگانے کے بعد نرس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اٹھو، بے بی، کیا تم سن رہی ہو..... بیلاؤ اس کے گال کو تختہ تپانے کے ساتھ ساتھ وہ اس پہ پانی کے چھینٹے بھی دیتی گئی۔ اب مقدس کے لیے بے سدھ بڑے رہنے کی اینٹیں کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ ہلکا سا کسمکائی۔ اسے اٹھنا دیکھ کر وہ بیٹیوں یوں چونکے جیسے اب تک اس کی موجودگی سے لاعلم ہوں۔ کمرے میں ایک بار پھر سکون چھا گیا۔ وہ نرس کا سہارا لیے دھیرے دھیرے چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اس نے نبھانے کون سی میبلٹ کھائی تھی کہ سر بھاری ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں بند ہو جھل۔

☆☆☆

”میلوسوئٹ کزن، کمال ہو گیا آج تو، اتنی لمبی ٹینڈ!“ آکھ کھولتے ہی خود پہ شاد کو جھٹکے پایا۔ وہ کلیہ آؤنچا کر کے ذرا سا اٹھ بیٹھی۔ دماغ ابھی بھی نیم خوابیدہ تھا لیکن پورا وجود سبک سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے ہونے کے اس احساس کو سر تک کر پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بارہ سے آکھ بند کرے ہی باچا جان کے کمرے میں ہونے والی کارروائی کی بازگشت سنائی دینے لگی وہ ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟ ابھی طبیعت نہیں سنبھل گیا؟“ شادو ترشوش سے بولی۔

”نہیں اب ٹھیک ہوں میں، پہلے سے بہتر۔“

مقدس نے خٹک لیوں پر زبان چھیڑی۔ ”شادو..... تمہارے پاس بابا جان کی اسٹوڈیو کی چابی ہے ناں؟“

”ہاں..... ابھی تک میرے ہی پاس ہے، کچھ فوٹو گرافس ہیں، ماموں جان کے کھچے ہوئے جنس سے میں لینڈ اسکیپ کے آئیڈیاز لینا چاہتی ہوں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“ وہ حیران تھی کل تک تو وہ کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتی تھی۔

”آج رات کو وہ چابی مجھے دے دینا۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”ابھی لو، رات تو ابھی نہیں، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جناب، آپ پورے پانچ گھنٹے سوئی ہیں۔“ اس نے گچھا اس کے سامنے کھراتے ہوئے کہا۔

”لیکن نہیں، پہلے تم کچھ کھاؤ، وگمہ سے کھانا منگواتی ہوں، وگمہ..... وگمہ۔“ وہ کمرے کے دروازے سے جھانک کر ملازمہ کو بلانے لگی۔

”سنو شادو، مجھے کافی کے ساتھ سکسٹس یا ایک آدھ سینڈویچ منگوا دو، بس اور کچھ نہیں۔“ کافی آنے کے بعد وہ جلدی جلدی سینڈویچ منگولنے لگی۔ گرم گرم کافی کے بڑے بڑے ٹھونٹ بھرتے ہوئے اس کی نظریں بے تابی کے ساتھ لمبی نفرتی چابیوں والے اس گچھے پہ پھسلتی رہیں۔

”میں چلوں تمہارے ساتھ۔“ اسے گرم شال لپیٹتے دیکھ کے شادو نے پوچھا۔ وہ فنی میں سر ہلاتے ہوئے بے آواز قدموں کے ساتھ کبھی راہداری میں مڑ گئی۔ راہداری کے اس طرف سب لڑکیوں کے کمرے تھے اور سامنے کی لائن میں وہ اسٹور روم کے درمیان بی بی جان کا بڑا کمرہ تھا جس میں سارا دن ملازماؤں اور مہمان خاتین کا تھکھٹا لگا رہتا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں جلد سو جانے کی عادت تھی۔

مقدس کو ان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل واپس کمرے میں پہنچنا تھا۔ راہداری کا موزک کٹ کر وہ ایک لمبے کے لیے رکی۔ گولا کی میں، نیچے لاؤنچ میں نیمہ تاریکی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ بائیں جانب باچا جان کے کمرے میں موجود نرس اور اینڈنٹ ساری رات چوکس رہتے ہیں، سامنے کھانے والے کمرے اور ڈرائنگ روم کی لائٹس بھی آف تھیں لیکن ان کے پیچھے وسیع کچن میں اس وقت تمام ملازماں ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ سارے دن کا پھیلا داسیٹ

رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔

انوش اور پلوٹ کے کمرے تو اوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھے، لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی راتیں جاگتی تھیں اس لیے وہ ان کے ہاں ”حجرہ“ کہا جاتا ہے۔ ان کے دوستوں کی محفل عروج بہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف بالکل الگ تھلگ ہے، لیکن مقدس جاتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں سوئی جاتی کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اٹھ اٹھ کر کچن میں جا کر ملازماؤں کے ہاتھ کبھی چائے، کبھی قبوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجوانی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت احتیاط سے چلتی ہوئی اوپر کی طرف جانی سیریزاں چڑھنے لگی۔ اس نے سیزھوں کی لائٹ بھی آن نہیں کی، حتیٰ کہ ہاتھ میں دلی تارچ کی مدد بھی نہ لی۔ اوپر آ کے اس نے اندھیرے میں آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔

سامنے کی طرف میسر سے لان میں جلتی لائٹس کی روشنی اندر تک آرہی تھی، ساتھ ہی رات کے اس پہر کی ٹھنک تمام تر مسافروں کے ساتھ پڑیوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں بابا جان کا بیڈ روم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔ اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چایاں لگا تا شروع کر دیں۔ اگرچہ شناور نے اسے چایوں کے نمبر بتا دیے تھے لیکن تاریکی کی وجہ سے وہ نمبر پڑھنے سے قاصر تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے لائٹ جلا تا بھی نہیں جانتی تھی۔ آخر کار چوٹی چابی ڈالتے ہی لاگ ایک بجلی سی آواز کے ساتھ کل گیا۔

اس نے پینڈل گھما کے دروازہ دھکیلا، کم استعمال ہونے کی وجہ سے دروازے میں چرچر اہٹ سی پیدا ہوئی اس نے سبم کے خود کو ساکت کر لیا اور دم سادہ کھڑکی ہو گئی۔ چند لمبے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کر سرکتے ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جاننا۔ اندر کی ٹھنک تاریکی میں اس کے خیم پر ایک عجیب سا رنڈہ طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لگ کے آہستہ آہستہ رک رک کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی، اس لیے اندازے کے ساتھ ٹھوٹتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور پردے برابر کرنے کا اطمینان کیا تاکہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے پہلے اس نے تارچ آن کی۔ بجلی زرد روشنی میں سفید سفید لمبے چوڑے سامنے اسے خوفزدہ

کر گئے۔ جلدی سے سوچ بھر پڑے ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین ٹپن نیچے کر دیئے۔ ٹیوب لائٹ کے ساتھ ایک لیپ اور پچھلا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سامنے دراصل جہازی ساز کے صوفوں اور بیڈ پر ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ کچھ کی تیز ہوا نے اس کے دانت کرکڑا دیئے۔ پھر سے کچھ اور ٹیوب لائٹس کے بن آف کرتے ہوئے وہ لیپ کی خوابناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شناور نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور ماما کی کوئی تصویر موجود نہیں، پھر بھی اس نے ڈیرنگ ٹیبل اور بیڈ کی سائڈ ٹیبلوں کی ایک ایک دروازہ کھٹکا لیا۔ ان میں برائے اختیار، چند ایک کاروباری نوٹیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود تھے۔ ڈیرنگ ٹیبل پر کچھ، چاندی کا چپکری باکس موجود تھا۔ دروازوں میں ڈھیروں پرانے اور سوکھے گجرے پڑے تھے، لیکن نہیں اس کے ماں باپ کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ شاید کسی نے پورا کرہ جوں کا توں پھوڑتے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی موجودگی کے اثرات کو غائب کیا تھا وہ ٹیبل دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ دیواروں پر کئی قدرتی مناظر مہارت سے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ زمین پر رنگوں کے ڈبوں اور ٹیوبز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کرہ گرد سے آنا پڑا تھا، شاید صفائی کرنے والے نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔

لان میں کھٹنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید بچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے آتی ٹھنڈی ہوا اسے کپکپائے دے رہی تھی۔ شلیف میں ڈھیروں الہز اور ٹیٹھو پڑے تھے۔ اس ایک آدھ ٹھنڈے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار پر قیمت پہ حاصل کرنے تھے جو اس تھی کو الجھا سکیں۔

”لیکن اس سے پہلے کیوں نہ میں اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔“ اس نے سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگرچہ شناور پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی کہ اسٹڈی کی تمام بکس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی الجھن ختم کر سکے، پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام شیلیوں اور الماریوں کا جائزہ لینے لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ لکچن اس کے بابا جان یا ماما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی، کہیں کلاسیک انٹلکٹل لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور مذہب پر بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رک کے کھڑکی ہو گئی۔ شیشے میں

سے نظر آتی سیاہ مجلس جلد والی وہ موٹی موٹی کرسیاں، جن پر کوئی نام نہیں لکھا تھا، ابھر بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چٹائیاں ایک ایک کر کے اس میں گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ ہنچھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کوئی جھٹکے دینے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آگئی۔

ایک کے بعد ایک الم کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سونیزر لینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ سے لے کر ابراہام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیا گرافال کی رفتار تک کیمرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ ابھر کھٹکال بیٹھی۔ لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے باپا جان نہ صرف ایک حساس مقصور ہیں، ایک ماہر فوٹو گرافر ہیں، بلکہ ایک سیلانی سیاح بھی رہ چکے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی ابھر دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بی بی جان کے تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لیے تمام ابھر ترتیب سے رکھیں۔ ایک کونے میں ایک میلا کچلا سا تولیہ کسی کھوپڑی پر لگا تھا۔ تولیے کا ایک کون چند ابھر کو ڈھانچے ہوئے تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی نے ارادہ ان ابھر کو ڈھک کر رکھا ہو، اس نے تولیہ کھینچا اور ان ابھر کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کو نوکر کرنے والے کوہ پیماؤں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے دھول میں اُٹے اس آٹڑے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھنٹی سے لٹکانا چاہا تو وہاں جھوٹی ایک سنہری چابی پڑی۔ اس کی نظر جم گئی۔ ایک ذخیرہ کے ساتھ دوسرے کونے پر وہ نم لاکوئی چیز جھول رہی تھی، اس نے چابی اُتاری اور میکا کی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، متفصل الماری میں وہ سونے کی چابی گھماتے ہی کلک کی آواز آئی اور مقدس کادل جیسے پھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ باپا جان کو مقصوری، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہر صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوتھ، پچھتر، چھیتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انیس سو اسی کی ڈائری پر رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود آخری ڈائری تھی۔ اس نے شمال کے اندر اس کی متاع عزیزی کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

”خیریت تو ہے، بہت دیر لگا دی۔“ شادو حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پر ہی تھی۔

”ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔“ اس نے شمال ایک طرف بھیٹکی۔ وہ جس طرح مختصر تھی ہوئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”کچھ ملا؟“ اس نے پانی کا گلاس ابے تھمایا جسے مشکور نظروں سے تھماتے ہوئے وہ اثبات میں سر ملا گئی۔

”یہ ڈائری؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگالیا۔ شادو نے کچھ اور کہانی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے نوٹس مکمل کرنا تھا۔

حلف میں وہ یک کر کا پتی انگلیوں، دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھولی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھر گزارنے کی ہے۔ پیر کے چکر کہیں تک کے بیٹھے ہی نہیں دیتے۔ ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے لیکن زور سنگھ باجی کی شادی، اتنے ڈھیر دل کام۔ اتنی ذمہ داریاں..... بڑے لالہ کا پہلا پہلا انکیش تھا تو رباب کا لاسٹ سمسز دونوں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے باچا جان نے مجھ پر نظریں لگائیں تو میں نے بھی اپنی سیلانی فطرت کو کچھ روز کے لیے چپک کے سلاوا یاد اور اپنی اگلوئی بڑی بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بے جی، میری اپنی ہاں بھی انہیں سگی بیٹیوں جیسا پیار ہی کرتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی جتنی تھی۔ افراسیاب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو کمزور زیادہ دل جی نہ تھیں اور جب بی بی جان کے پہلو میں بیٹھی ہوتی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک ایسی بیٹی ہو۔ زور سنگھ جیسی پیاری پیاری سی، لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بیٹی کے حسے کی ممتا انہی لپٹائی رہیں، اسی لیے زور سنگھ باجی سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس ٹھٹھلانا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے، وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بہن بیا ہے دکھائی منموہ وہاں میری بہن تھی اس سال شروع ہونے تک میں..... خیر..... شکر ہے

رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پنہم ادبی اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے ایک بھی نہیں۔ اپنے ہی اپوں کا بوجھ ملکا کرتے ہیں، یہ بات بلی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرسا نگہ بانجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے، لیکن آفریدی اور خشک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی نہیں لگتی۔ اب باچا جان کو بھی سمجھئے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے، باچا جان نے میری بے نیکی اپنی چچا زاد سے شادی کے ڈیزہ برس بعد ہی بلی بی جان یعنی اپنے باموں زاد سے بھی نکاح کر لیا اور اس کے علاوہ..... ایک بایا کیا نکھوں۔ رشتوں کی دُور میں اتنے بل ہیں کہ ایک کا ذکر چھیڑو تو دوسرا قصہ نکلتا چلا آئے اسی لیے تو میں سارے ماحول سے الگ تھلک رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر وقت خاندانی مسائل، جائیداد کی تقسیم کے تنازعے، وراثتی جھگڑے، ویرسٹ، وغیرہ وغیرہ..... میں تو بس منہ کا ڈانٹہ بدلے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے چلا آتا ہوں۔ اس بار بھی کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں سخت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔ آج رات سوئے سے پہلے یہ فیصلہ کر کے رہوں گا کہ میرا اگلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مصر، لبنان اور شام سے لے کے چین، ملائیشیا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ سے لے کر سوئٹزر لینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھومتا تھا اور ان ہی جگہوں پہ دوبارہ جانے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کمرے کی آنکھ ہے۔ ایک بار جو منظر دیکھ لوں ذہن کی سلیٹ پہ نقش ہو جاتا ہے اور میں ہو ہوا سے کہتوں یہ آنکھ بند کر کے بھی آتا رہسکتا ہوں اس لیے کئی بار کی دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ بنیں۔ اسی ذہنی کلکشن میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفریاد آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان والی سوات کے خاندان سے ہیں، سوات کے آخری ولی عہد کیشن میاں گل اورنگ زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے، اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ

چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شنواری اور خشک بھی اور وردگ بھی، بعض ٹیپیکل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے، تعلیم اگرچہ اس کی رکھی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور بیخون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابل رشک ہیں، بہت کم دقت میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی میری اس سے۔

میرے سہاحت کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کیلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سن سن کر میں تو تب ہی ارادہ کر چکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کر دیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام رستے مسدود کر دیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کل ہی منج فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ انشاء اللہ ۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے منقل جالی کے پاس بڑے سے گیس لیپ کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دوستوں کی محفل جی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنڈہ دو گھنڈہ آرام کی تاکید کرتے ہوئے گیا ہے، تاکہ صبح کا آجالا پھیلے ہی سفر پہ نکل جائے، لیکن میں بھلا ڈائری لکھتے بغیر سو سکتا ہوں۔

یوں تو میں سات آٹھ بجے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام کو آیا۔ اس کی رہائش سوات کے صدر مقام سید شریف میں ہے وہاں تک پہنچ کے اس کی حویلی جاتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے ان غیر اورمانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اپنا تک اس سیر بان کا شرف بخشے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہوٹل کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سرینا، مرغزار اور پلٹی ٹی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہوٹل بک تھے۔ میں نے نہایت درمیانے درجے کے ”رہلم“ میں کمرہ بک کروایا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پیمانہ زادہ میری آواز سننے ہی دیوانہ ہو گیا۔

اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پُر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پُر تکلف پکوانوں، خوشبودار قبوؤں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بیت گی پتہ ہی نہیں چلا، اب مجھے تھکا دہکتا سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کرسیدگی کر رہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جت کے ایک قطفے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین وادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نہجانے کتنا کتنا لہا سطرے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں، فیروز نے بتایا۔

”سوچیان، قافان، ساگ یون، بیون ساگ اور اویان پاکے سفر نامے کی تلاش کے چپے چپے کے قصبہ دوسرے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بدھ مت کا متبرک مقام بھی ہے۔ دنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ”اجی تابا“ بدھ مت کا مذہبی رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ بھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹے گا وہ بدھ کا اور تاریخ ۲۶ ہوگی۔“

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کالاش سے محروم ہو کر رہ گئے تھے۔ حقیقتاً میں بھی اس وقت ڈنگ رہ گیا تھا، جب سید و شریف سے تقریباً ہولکویٹر کے قافلے پہ واقع مشہور چوٹی ”فلک سیر“ میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تو دل ہی نہ چاہتا تھا اسی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پچھ و دشوار گزار بھی۔

”تم کہاں کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ یوں پھولوں سے لد ا اور گہساروں، آبشاروں سے بھر پڑا ہے۔ لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر نہ سفر کرنا ہے۔“ فیروز نے تنبیہ کی۔

”ایوان؟“ میں اپنی اپنی لیے خاصا شرمندہ تھا۔

”ہاں جڑال سے آگے یہ سبز بگڑوں کا فرستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی وادیوں کو راستہ نکلتے ہیں۔“

”کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔“

”نہیں وادی کیلاش، بمبوریٹ، بریر اور بمبورتاں تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے۔ لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بوداؤن ایک سا ہے۔ لیکن بمبوریٹ نسبتاً ترقی یافتہ پایا جاسکتا ہے۔“ ایوان پہنچ کر فیروز نے جب اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے حوالے کی۔ ”ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔“

”تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔“ اندھرا چھلکنے کی وجہ سے میں فکر مند تھا۔ ”چلو اڈے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار وین آتی ہے اور مسافر بھر کے“ دو باش لے جاتی ہے۔“ اڈے پہ کئی سیاح گروپ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کرایہ ملا کے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا واقعی اس پہ خطر بھاری راستے پہ ڈرائیونگ کرنا اناڑی شخص کے لیے رکھی تھی۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ژان خان، جیپ لیے کھڑا تھا۔ چوٹی سا وجود، سرخ و سفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سپیوں سے بھری ہوئی قلنی والی رواجی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آہستہ دواز میں پوچھا۔

”یارا فیروز خان، یہ بندہ ژان خان خاں کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ژان بھی اور خان بھی۔ ژان تو بدھ مت نام سے پوچھ رہے تھے؟“ وہ زور سے ہنس پڑا۔

”آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔ یہاں ایسے ایسے نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ لوگ بیکار کے لیے کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ مذہب طلب کھانے کی فکر، مذہب و قوم کا خیال۔ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ ویسے ژان خان شیعہ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قصبے کا رہنے والا ہے، بمبوریٹ کی کافر آبادی سے نہیں میں نے کہا تاں یہاں وہ تہذیبوں کا میل ہے۔“

قصباتی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سیکھ اور اکاڈا کا ہندو بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں پشتو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ یہ قدرے تعلیم یافتہ اور تہذیب پسند ہیں، لیکن کلام حقیقی معنی میں کافرستان ہے۔ صدیوں سے چلی آ رہی اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب میں یہ رتی تبدیلی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشوبی اور گاردی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں

ناموں کے سلسلے میں یہ اصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے، کوئی رام لعل، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گوبھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔“

”ڈونٹ نیل یار۔“ میں ہنسنے لگا۔

”ابھی دیکھنا ذرا تم“ اس نے گیٹ سے بیٹھے چوکیدار کو پشتوں میں مخاطب کیا۔

”اگے ایران چاچا؟“ (کیسے ہوا ایران چاچا؟)

”بھیر راسٹے، بھیر راسٹے۔“ (خوش آمدید، خوش آمدید،) وہ اس کے ہاتھ چومتا

ہوا مزاج ہنسی کرنے لگا۔

”یکاندر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔“ اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو

جزواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ژان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ ہے

جمبرے کا نانی، غضب کا ذکا ر ہاتھ ہے اس کا، انجیر نام ہے اور یہ مسٹر جناح بڑے کمال کے

ڈرائیور ہیں، یہی ہمارے گائیڈ کا کام بھی کر رہے گے۔“

اس نے فرخ و آذان سب دلچسپ ناموں والی عسیوں کا تعارف کر دیا اور پھر ہم حجرے

میں چلے آئے۔

رات کے سامنے پھیل رہے تھے، لیکن تاریکی اس حسن کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ

سکتی جو جگ کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

واہی کیلاش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا یا

شاید میں تو سورج کے طلوع ہونے سے بھی پہلے ہی حجرے کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

نیکیوں تاریکی میں بے پستے تک میں حجرے کے احاطے میں موجود بھلیں گھاس پہ ہی نکل کر

دہاں کی فرحت افزا اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر اُتار رہا تھا۔

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا وہ اور دو تین گھنٹے تک جاگنے کے موڈ میں

نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا، یہی کم تھا کہ وہ دوسری اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے

ہوئے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، مجھ جیسے ہر

ذمہ داری سے آزاد، بے فکر سے سیاح کا ساتھ دینے کے لیے۔ اتنی صبح میں اس کی نیند خراب

کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چاچا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد

اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ دُور دور تک کوئی ڈی زورج نظر نہیں آ رہا تھا۔

مرغ کی لڑک دار بانگیں پسکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز

کے ساتھ ہی مجھے سیدو شریف میں گزار دی رات یاد آگئی۔ جب فیروز خود بھی طلق تک بھی

مرغی ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی نے تماشا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے نوکا کہ

”کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی، جو دیگر پکان

چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“ تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف

کیا تھا۔

”کیلاش میں باورچی، نانی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور

کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ

پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوب چھٹی مرغی کھانی ہے

آج ہی کھا لو گناہ اور اور کتنے پختے ڈبے اور ٹپس کھانی پڑیں۔“

اس کا نید سے پن سے مرغی پہ مرغی اڑانا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

دُور کہیں سے فحری اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھانک کھول کے سرنگی چھروں والی گلی

میں آ نکلا۔

سامنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھڑوئی دو بائے قدم بہ قدم

اُبھر رہا تھا۔ نی وی یا نیگزین میں کلام کے اس روایتی لباس اور زور کے ساتھ کئی بار وہاں کی

دو دشاؤں کو دیکھ کھا تھا لیکن..... پہلی بار ایک کالاں دو شیزہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود

بخور دکر گئے۔ وہ بھی لیے لیے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کر کڑی ہوئی۔ ٹپکے سے اُجالے

اور ہلکی ہلکی وند میں اس کے نقوش واضح نہ تھے۔ لیکن تدراسرا پیکل خود اعتمادی کے ساتھ

میرے سامنے تھا۔ اس کے لبوں سے چند ناقابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا تھا شاید اس نے

اپنی مقامی زبان میں گھڑوئی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں احمقوں کی طرح

دیکھنے لگا۔ لڑکی کچھ داتھی، میرے کچھ کبے بغیر بھی کچھ کی ادواب کے پشتوں میں مخاطب ہوئی۔

”بکری کا تازہ دودھ ہے صیب، کتنا لوگے؟“ اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ

کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا کھوم چکا تھا میں مختلف ممالک میں

بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے، بہنوڑا مصفت یا رنگین مزاج کہنا تو کس طور

کا جاز نہ ہوگا۔ بہر حال صحت نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی

نچواسے میری اچھی خاصی دوستی رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں اٹلنے اس خون کی تاثیر کا۔

میرے اندر کا بچپن زائد اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کرد فر سے سر اٹھالیتا تھا۔ اپنی برادری اور خطی کی خواتین کو سانسے پاکے میں بھی بھی سے نگھانے گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرسٹ کزنز سے بھی عمر کے ایک حصے میں آ کے پروہ کر لیا جاتا ہے۔ جو ملی کے زمانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زمانہ خانے میں مرد ملازم کا چانا حامل ہے، اسی طرح بی بی جان مردانہ خانے اور حجرے میں گھریلو ملازموں کا چانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب عمر کی اس اؤ لین ساعت میں، ڈور دور تک پہلے سناٹے اور تہائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ گھنٹہ کے فاصلے پر اپنی مادری زبان میں خود سے مخاطب پاکے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے قصداً ذرا سا ایک جانب ہو کے میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔“ اس نے گھڑونچی سنبھالے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹوٹتی ہوئی عمر سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی۔ غضب کا اعتماد تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے بستی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک مٹی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور اٹھتا ہوا واپس آ گیا۔

ناشتا ڈان خان کے گھر کے اندر دینی حصے میں ہوا۔ میں گھریلو خواتین کی موجودگی میں کچھ ان ایڑی ٹیل کرتا رہا، لیکن شاید ڈان کی ماں، بہنیں وغیرہ فیروز سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے تالید، البتہ فیروز ٹوٹے پھوٹے الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ڈان کے عجیبوں مکالمہ راور جنرل کی مدد سے مسلسل شامل گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازمائیں اندر آتی جاتی رہیں کوئی دسترخوان بچھانے کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہ بیٹھی پھل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نوکر لڑکیاں کونے میں لگیں کھسر پھسر اور کھی کھی کر رہی تھیں اور فیروز کے فخرور پر کھلکھلائی رہی تھیں۔ اس نے میرا کر بڑھاپ کے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

”یارا زریاب تو ان کے نام نہیں پوچھتے گا۔ ذرا دیکھ تو سہی حسن و شباب کے ان شاہکاروں پر لبیل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔“ میں نے مسکرا کے ہانپا چاہا، مجھے خواتین کو یوں تحقیر بھرنے انداز میں موضوع گفتگو بنانا پتا نہ تھا پھر چاہے وہ کوئی آن بڑھ گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑی ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان دو شیرازوں کے ساتھ جھپٹ جھاڑ کے عادی

تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی گھلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا تعارف“ غٹ فٹلے سے کراتا ہوں۔“ اس نام پر میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اچھڑی لڑکی کو دیکھ کے بمشکل اپنی ہلکی ضبط کر سکا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ”برجستہ“ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی کینز اگر نمایاں تھی تو وہ عانی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پہلے دانتوں کو خاص حد تک ڈھانپے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پہلے دانتوں اور مونے لگے ہوئے ہونٹوں کا کبھی نشن اس کی آنکھوں کا حسن غارت کر رہا تھا۔ ”غٹ“ پشتو میں بڑا کاور ”ہٹلے“ ہونٹ کو کہا جاتا ہے یقیناً کسی پشتو دان نے اسے یہ نام دیا ہوگا اور اس کے مان پاپ نے بغیر مطلب جانے اسے تھفے کی طرح اس بے چاری پر سجا دیا۔

”اور یہ ہیں مس لندن“ اس نے بارہ تیرہ برس کی دہلی پتلی سی شرمیلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور ایک مس پیرس بھی ہوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام یہاں آنے والے غیر ملکی ساحلوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ قوم کمال رکھتی ہے۔ ہنا زبان سمجھ جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے کھل مل جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے دیئے نام تول ہی جاتے ہیں اور یہ..... یہ دیکھو۔“

اس نے موٹی موٹی غلافی آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور سونے کی سی رحمت والی ایک دو سالہ بچی کی انگلی تمام کے آگے کیا۔

”کیا اسے دیکھ کے قدرت کی فیاضی پر ایمان لانے کو نبی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟ غریبی“ میں نے نظر بھر کر اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پر سچا نہیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے منہ سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

”اس کا نام ”انمول“ ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔“ اور اٹھ کے باہر نکل آیا۔ نویں کے پاس ”کچے“ میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی بیٹل کی گھڑونچی کھنگال رہی تھی مجھے یو بھئی شہ ساہو کہ یہ وہی صبح والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شہر یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے

دھندلکے میں اس کے نقوش نہیں دکھ پائیا تھا لیکن معلم سرود میں منگنائی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ پیر ارادہ اٹھنے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد ملازم تھے جو پشتو بول سکتے تھے، لیکن نجائے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھانے پر مجھ پر ڈالی۔ گھڑو بچی سے پانی جھارنا، گیلے ہاتھ اپنے گھیر دار کرتے سے پونچھنے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مومن علی!“ پُر اعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب و غریب نام کا منتظر تھا۔ مومن علیؑ اس کے دنگ رہ گیا اور جہاں کہاں کھڑا اس نام پر غور کرتا رہا۔

”کیا ہو؟ کہاں گم ہو؟“ فیروز میرے نزدیک چلا آیا۔
”کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظر یہ لوگ واقعی نام رکھنے کے سلسلے میں بہت لاپرواہ لگتے ہیں۔“ میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

”مومن علیؑ“
مقدس کی نظریں پھر سے دوسطریں اوپر پھسل کر ”مومن علیؑ“ پر پھیر گئیں۔ اس نے زیر لب یہ نام دہرایا۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر“
فجر کی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔

اسے شروع ہی سے صبح صادق کے طلوع آجانے میں اذان سننا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو وہ..... مومن علیؑ فجر کی اذان کے سنے..... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رد بینک پر چرچہاں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کبھی اتنا بقیہ دست نہ محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ دعا مانگنے کے لیے اس کے کفول میں الفاظ کے سیکے بھی نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی کسی عمر کی دعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ لرز گئی۔ ”یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے جس نے انہیں مجھ سے غافل ہو کر اپنی اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے اطمینان کتنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملو اے۔ میں ایک بار..... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔“

میں جانا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جانا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی پھیلی ہوئی ہاتھوں کی پناہ میں ہے۔ میں جانا چاہتی ہوں کپکپاتے لیوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تو سب جانتا ہے..... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم و کریم پروردگار میں ایک بوسہ ذرا سی گرمی توڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔“

رات بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے انہیں مزید چند سیکنڈ کھولنے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دلی خواہشوں کو جب دعا کے ذریعے رستہ ملا تو روح تک شات ہو گئی۔ اس نے مُندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش نہ کی اور جانے نماز کا بھی ایک کونا موڑ کے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔

”ہیلو..... ہیلو زنون و یک اپ.....“

شاور نجائے کب سے اسے آواز دیں رہی تھی۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی۔ سوتلی سوتلی آنکھوں سے گھٹوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی شاور کو خود پہ تشویش سے جھکے پایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے نیم غنودگی کے عالم میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”اُٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں..... بہت سولیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دوپہر چڑھتے تک سونے کی عادتیں کچی کر لیں تو بڑی پراہم ہو جائے گی۔ واپس تو ہاسٹل میں جاتا ہے ناں، اب چھٹیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔“

اس کے اتنا کہنے پہ مقدس کو یہ یاد آیا کہ وہ بائل کے کمرے میں نہیں بلکہ بشادور میں موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پہ رکھا سر اٹھا کے اٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکل گئی۔ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پٹھے گھٹنے سے گئے تھے اور گلایوں تک ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ نماز کی چادر اسی طرح سر کے گرد لپیٹی تھی اور یہ کسل..... یہ یقیناً شانوں نے ہی اوڑھ لیا ہوگا۔ وہ مسکرائی۔

”سنو، کچھ خاص بات پڑ چلی ڈائری سے۔“ اسے کھڑکی کے پاس روشن دھوپ میں قدرے ہشاش انداز میں کھڑا کچھ کے شادور نے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔ ”میرا خیال ہے میں نے فضول اتنے گھنٹے برباد کیے۔ یہ تو ڈائری کم اور کوئی سفر نامہ زیادہ لگ رہا ہے۔“ وہاں اور بھی تو ڈائریاں ہوں گی۔“

”ہاں لیکن مجھے یہ اس لیے متوجہ کر گئی کہ ایک تو یہ میری پیدائش سے ایک ڈیڑھ سال ہی پہاٹی ہے، یعنی تقریباً اس دور کی جب بابا جان نے میری ممانے شادی کی ہوگی یا کرنے والے ہوں گے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی اب تک کی آخری ڈائری ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس میں لکھے حالات و واقعات ضرور ان خاتون سے پردہ اٹھا دیں گے جو اب تک میری نظر سے مخفی ہیں، بار کھے گئے ہیں لیکن.....“ اس نے ڈائری کے اوراق بے دلی سے پلٹے۔

”اس میں تو سوات، کالام اور نجانے کن کن وادیوں کے قصیدے لکھے ہوئے ہیں۔ گھساروں، آبشاروں، ندی نالوں کے تذکرے وغیرہ وغیرہ۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی جسے جھٹک کے وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولی۔

”دیے ایک بات ہے یار..... بابا جان میں ایک اچھا رائٹر بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو بات میں جانا چاہتی تھی اس کا اس ساری تحریر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں کس طرح گھٹنوں اس کے مطالعے میں مصروف رہی یہ میں بھی نہیں جانتی۔ انہیں تو مقصود ہونے کے بجائے مصنف ہونا چاہیے تھا۔“

”تمہارے بابا جان آرٹس ہیں اور آرٹ کے کسی بھی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے فنون لطیفہ سے نااہل نہیں رہ سکتا۔ میں نے ماموں کے پیٹھ کیے ہوئے لیڈن ایکسپ بھی دیکھے ہیں اور وہ خوب صورت لحات بھی جو انہوں نے کیرے کی آنکھ سے قید

کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فطری خوب صورتی بہت اثریکٹ کرتی ہے۔ لازمی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہوگا۔ جس خوب صورتی کو وہ مو قلم کے ذریعے نہ ابھار سکے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خارج خمیں پیش کرتے ہوں گے لیکن تم یہ باتیں کیا جانو..... ایک آرٹسٹ کی فیلنگز دوسرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔“ اس نے شکاری دکھائی۔

”اچھا اب یہ فن اور فنکاری چھوڑ دو اور میرے لیے کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

”بہت اچھے..... مقدس خانم بہت اچھے..... مجھے کیا اپنی کینز خاص سمجھ رکھا ہے۔ رات کو تمہاری دگرگوں حالت پر رحم کرتے ہوئے کافی کا کپ کیا لائتھامیا اور صبح یہاں کارپٹ پہ سکرے سے نکلے دیکھ کے کبل کیا اوڑھا دیا تم نے مجھے ابھی اتنے خادمہ ہی تصور کر لیا۔ چلو اٹھو خانم..... اور اپنی پیٹ پوجا کا انتظام خود کرو، مجھے آج یہ پولش مکمل کرنے ہیں۔“ وہ اسے جھاڑی پھر سے فائل پھیلا کے بیٹھ گئی۔ اسے جب ہی مقدس کو تاؤ دلانا ہوتا وہ اسے ”خانم“ کہہ کے چھیڑتی۔ لیکن آج چڑنے کے بجائے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تو شادور نے مڑ کے اسے دیکھا۔ اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ رات وہ جس حالت میں کمرے میں آئی تھی وہ حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اس کے منہ میں اس کا وقت لگتا۔

”لیکن اگر وہ خود کو ناظر ظاہر کرنے کے لیے اتنی فریش نظر آ رہی ہے تو مجھے بھی اپنے تجسس کو فی الحال جھٹک دینا چاہیے۔ کیا پتہ میرے استفسار پہ وہ پھر سے ٹھہر جائے اور ویسے بھی جب تک وہ خود نہ بتانا چاہے گی میرے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کل باچا جان کے کمرے میں کیا ہوا۔“ اس نے رات سے دوسروں، اندیشوں اور سوالوں سے گھرے دل کو اسے چھیڑنے سے باز رکھا۔

ناشتے کی ٹرے لے لے کچن سے نکلے ہوئے اس کی نظر باچا جان کے کمرے کی طرف اٹھی اور اس کے قدم تقم گئے۔ ذہن پھر سے اس بند کمرے میں ہونے والی بڑے سچے گفتگو کی طرف چلا گیا۔ اسی لیے وہ نیچے آنے سے کڑا رہی تھی۔ وہ کم از کم آج کے دن پھر سے اپنے دل و دماغ کو اس بیکل میں نہیں لٹھکانا چاہتی تھی۔ وہ دل و دماغ جو خدا کے حضور اپنا مقدمہ پیش کر کے سبک دے تھے۔ اس نے بدقت قدم اٹھائے اور بیڑھوں کی جانب بڑھی۔

”آپ کچھ بھی کہیں بی بی جان، باچا جان، اچھا نہیں کر رہے۔ انہیں اور کچھ نہیں تو

۱۷ مئی ۱۹۸۰ء

مکی کا مہینہ یہاں کا سب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہاراں منایا جاتا ہے جس کی اکثر جھلکیاں ٹی وی پر گرگر میں دکھائی جاتی ہیں۔ آگ کا بڑا سالاؤ جس کے گرد دخوش سے دکتے چروں کا سادہ مگر محکمہ قص۔ جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد ہوش ہو گیا۔ آج صبح ہی فیروز مجھ سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں واپس لانے کی تاکید کی۔ میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے حوالے سے، اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا سارا دن میں نے جمہوریت کے اُونچے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزرا، ایران جا جا کر میرے ہمراہ تھا۔ میں نے وہاں کا روایتی تہتر سالہ بھی دیکھا۔ ایک کھلا سیدیاں جس میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، ٹھیکرت استخوان اور پُڑھ پُڑھ ہوئے تابوت ہیبت ناک ماحول پیدا کر رہے تھے۔ ایران جا جاتا ہے۔ لگا۔

”یوں تو ہمارے پاس مردے کو حجام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چار یا پانچ میاں ڈال دیتے ہیں، لیکن کچھ صاحبِ حیثیت لوگ اب تابوت بھی بنانے لگے ہیں، مردے کے ساتھ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔ فرشتے جب مردے کے پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔“

جنگلی جانوروں، چیلوں اور گدھوں کی نوچ کھسوٹ اور بربریت کی نشانیاں وہاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے جھر جھری لی اور آگے چل پڑا۔

عورتوں کے ٹولے کے ٹولے روٹیوں کی چنگیریں اٹھائے، سر پہ پھل کے ٹوکے رکھے، جنگل کی طرف نکل رہے تھے۔

”چاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے، ہر طرح کا زہریلا سانپ اور بخور کا جانور اندم موجود ہے، پھر یہ عورتیں چپکے مٹانے وہاں کیوں جاتی ہیں۔“ میرے سوال پہ چاچا الجھا۔

”پن، کک؟ وہ کیا بلکا ہے؟..... بچہ یہ تو ملوٹ دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے جا رہی ہیں۔ کل تہوار ہے ناں، ہر تہوار میں دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں پھینک دیا

درباب کی کم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ ریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ متوی کر دیں۔ اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، غلط شاہ کے بابا کا تو یہی کہنا ہے۔ ”چچی جان کے کمرے سے آتی تائی جان کی دنگ مگر بھجھائی آواز نے اسے پھر سے دنگ جانے پہ مجبور کیا۔“

”اللہ کرے، ایسا ہی ہو..... زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے اور..... اور..... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا..... سب ٹھیک جائے گا۔“ بی بی جان کی محقر آواز سنائی دی۔

”دیے میں نے سنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو کہاں آئے میں خطرہ ہی خطرہ ہے، وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑیں گے نہیں۔“

”اللہ نہ کرے..... خیر کی بات گھر گل بی بی..... خیر یا عمو خدا سے۔“ بی بی جان نے دہلی کے انہیں گھر کا دروازہ جو خود ان سب مذاکرات سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آئے تھے بڑھتے ہوئے یادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے نام پر سڑ پال کے کرہ گئی۔

فیروز خان..... فیروز خان دروگ..... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواسِ جمیع کر کے دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ کیے۔

”میں تو یونہی ایک بات.....“ تانی جان منٹا میں۔
 ”پھر مجھ بل بھائی آپ کو سو سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔“ چچی جان کے لہجے میں
 تنگی تھی۔

لی لی جان کی دلی دلی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

”کیجئے! میں تو کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ درود بھی ہماری طرف دشمن داروگو ہیں۔ نسلوں تک بدلے کا زہر ان کے ذہن سے نہیں اُترتا۔ اللہ میرے بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا اب میں اس کے یہاں آنے کی دعا بھی نہ کروں؟“ لی بی جان کا کچھلا اور بچہ لگا جس کے لیے چیخ پڑا۔ وہ ہماری ہوتے وجود کو آگے ٹھکٹھک لے گئی۔

فیروز خان وردگ بابا جان کا عزیز تر دوست یا خون کا پیسا دشمن۔ اس سوال کے جواب کی طلب نے اسے ایک بار پھر وہی ڈائری کھولنے پر مجبور کر دیا۔

جاتا ہے۔“

”بڑے بیٹو دیوتا ہیں تمہارے۔“ میں بڑ بڑایا۔
”وہ دیکھو، تمہارا قبر۔“

میں ایک شفاف جمیل کے کنارے اونچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پہ جھکنے پھرنے پھسلنے پھسلنے بجا۔ میں نے مڑ کے اسے دیکھا، شاید اس کے دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے کی یاداش میں میرا دل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو، لیکن اس کے تاثرات ناول ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک دیکھا۔ کچھ فالٹے چٹا روں کے سائے میں ایک اکیلا قبری۔ قبر کی جھکی مگر اس کے گرد پتھر لگے گویا حد بندی کر دی گئی تھی، اوپر چٹنی مٹی کا لپ بچھی تھا۔

”اوہ۔“ اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جسے وہ میری قبر قرار دیتا تھا۔

”تمہیں اللہ سمجھے چاچا۔“ میں نے فطقی سے اسے گھورا اور دوبارہ سے وضو کر لگا۔

اس حسین وادی کے سرسبز قلعے پہ پھولوں بھری سرزمین پہ بچہ ادا کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں جھرمجھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام بھیج رہے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی تھی میرے دل میں کیا آیا کہ پتھروں بعد میں اس قبر کے سرہانے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گیندے کا پھول توڑا اور اس کی پتیوں پر قبر کے سرہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک مرثاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں سخت چمختیلا رہا تھا۔ صبح سے اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کمرے میں قید کرنے کے لیے بے چین تھا اور اب فیروز عائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلارہی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آندھیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد نوائی علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر مجھے رہ رہ کے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

میں اکتا یا ہوا سا چار پانی پہ سیدھا لینا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی جس ساعت اور جس شام سے کام لیتے ہوئے کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اونچے اونچے مڑوں میں انجمنی زبان والے گیتوں کی مدھم

مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ چلتی لکڑیوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم گھٹنے کی اشبا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ چرلی کھیلنے کی ناگوار سی بدبو بھی آرہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زور دار دستک ہوئی یہ اچانک اور زور دار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آئے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں بھرتی سے اٹھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے فطقی اور اپنائیت بیک وقت عیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”صیب، یہ لوگ بہت سخت خطا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان یوں اکیلا پڑا ہو تو کیا خاک تہوار ہوگا۔ بھلا کیا جشن منائیں گے ہم لوگ۔ خان صیب نہیں تو کیا ہوا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو، اگر کوئی کسر وہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جوتیاں لگاؤ لینا۔“

اس کے استحقاق پہ میں مسکرایا اور مزید غرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔ پوری کیلاش عوام اس وقت ایک کھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کے کا پتیتی آوازوں میں گیت گارہی تھیں اور الاؤ کے گرد میں شرموزن کی ٹولی دائرہ بنا کے رقص کر رہی تھی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں دلچسپی سے ان سادہ چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے کمرے میں ان کے مختلف زاویے قید بھی کر چکا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ اتنے آئینہ چہرے میں سے کہیں اور نہیں دیکھے تھے۔ جود میں وہی چہرے کے خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھملا رہا تھا اور وہ تھا خوشی کا محبت کا میری خوبیت کو ایک سترم آواز نے توڑا۔

”صیب میں۔“ میں نے مڑ کے دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کی کیلاش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والا لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

”تم..... وہی ہوتاں..... مریم علی۔“ میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

”نہیں، مومنہ علی..... مومنہ علی ہے میرا نام۔“ وہ ذرا سا مسکرائی تو قدحہاری انار کے رنگ والے اس کے گداز لبوں سے موتی جیسے جھلکے خوب صورت دانتوں نے لشکارا مار کے جیسے روشنی کی میرے اطراف بھردی۔ الاؤ کی کئی فٹ اُونچی ہوئی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں سکھ رہ گیا، جب میں نے پہلی بار اس کا تفصیل جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری رُفص وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح سینڈھیوں کی صورت تھی اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور زخسار پہ بھرے تل گوڑے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی بنزی یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری..... نہیں..... قرمزی یا شاید شہد..... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قندروں کے گرد پھیلی وہ لالائی جیسے شفق..... پتہ نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہو گئی۔

”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتی تھی صیب وہ تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا، میرے دوڑے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے۔ برسوں سے سوائے میرے اس قبر پہ کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔“ وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہو اُٹھا۔ لیکن پانی کی یہ بوندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

”وہ تمہارے والد تھے۔ میرا مطلب ہے تم تو.....“

میں نے اس کے سیاہ لباس، سر پہ رواپتی ٹوپی، اس پہنگی سپیاں اور موتیوں کو بٹھور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

”الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے ابا کا نام محمد علی تھا اور انہوں نے ہی مجھے مومنہ کا نام دیا، تاکہ میرے نام سے ہی یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔“

”اوہ.....!“ میں نے سر ہلایا، اب اسے کیا بتانا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے یونہی ایک خالص مسلم نام ایک کافر لڑکی کو دے رکھا ہے، بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پہ غصہ بھی آیا تھا جس نے میری دانست میں یہ نام مقول حرکت کی ہوگی۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے، مجھے طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پائے مجھ پہ طاری ہو گئی

تھی، پل میں زائل ہو گئی۔

میں پھر سے جشن کے طرف متوجہ ہو گیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دیکھتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں ڈان خان، اس کے علاقے کے دوسرے بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش و خروش سے منا رہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پہ سب سے الگ تھلک کیوں ہو؟“

”نہیں سوائے مذہب کے میں نے بھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کی تلاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خون رشتہ بھی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کرنے پہ مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے گیت، یہاں کے پہاڑ، ندی، نالے، یہاں کا چنچہ اُنکس میں چڑھتا تھا جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھا ہوگا۔“ اس کی آواز بھر اُٹھی۔

”وہ بڑے اہتمام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ اس جشن میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ جب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی گیت فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ بھی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔“ وہ کی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ لگا ہیں جہاں سے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے نامحسوس کی حرکت کر رہے تھے نہایت مدغم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

”میری ماں کا پورا وجود دک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی نانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے پڑ گیا۔ سنپٹتے

سنہیلے بھی اس کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور..... اور ماں..... وہ مت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے.....

اس کے چہرے پہ آتے دڑلے کے آثار مجھے عمل طور پر ارادہ گرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ پہنے پہنچور کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

”وہ جینی..... جینی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اُتار کے روٹی خیتی اس کی طرف لپکی، میرا ہاتھ لگا کر اس کی حالت دیکھتا ہوا، پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنہیلے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ جیتی رہی، اپنے بال بونتی، اپنا سینہ جیتی رہی، پھر اس نے اپنا آپ سب سے چھڑا اور بھاگ گئی۔ اتنا پیچھے پیچھے بھاگا..... بھاگتا گیا۔ لیکن سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھر..... پھر سب نے بہت ڈھونڈا..... مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا ہوا تھا، اتنی تیز لہریں..... اتنی خوفناک موجیں..... نجانے کہاں کہاں بہا لے گئیں اسے۔“ آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آگئی۔ دونوں پھٹیلوں سے آنسو پونچھ کر وہ سر جھکا لے اپنی کچلیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا ڈھک لے لے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کبھی اسے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟“ میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

”پاگل پن..... ہاں وہ پاگل ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک چھڑ جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری استعداد رکھتی رہی، لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہنچور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے یہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ یاد اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا

کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ بھونکا کرنے والی عورت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بد شگونی ہوتی ہے اور جس کا ہاتھ اسے ساسی سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اسی لاکو..... شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا ڈھکنا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم ظفری ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شامل ہوتی ہوں، لیکن اس دائرے میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ گھنٹوں کے گرد بازو پیٹنے ٹھوڑی گود میں ٹکا لے ہوئی رہی۔ گنگی نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے، یکسر واقف.....

”سنو، تم کیا ہر اجنبی سے یونہی گل مل جاتی ہو۔“

بات تو کل ہی چکی تھی منہ سے اب سمجھتے تھے اسے سو کیا ہو سکتا تھا، لہذا اس میں بھی اس وقت اس کا خیالیت سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے خود کو اس قدر نامستقل سوال پر کوس رہا تھا۔ وہ لب کچلی کھڑی ہو گئی، میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کے پلٹ آئی۔

”صیب، تم اجنبی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پہ وہ پھول چڑھا کے اور دُعا پڑھ کے تم مجھے اپنے اپنے سے لگے تھے، میں تو صرف یہاں تمہارا شکر یہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود پتا نہیں کب اور کیسے میں اتنی دیر باتیں کرتی رہی، مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بُری لگی ہو اور ہاں میں ہر اجنبی سے تو کیا کسی بھی اجنبی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ اجنبی ہو تو.....“

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا، ماحول کی ساری رنگیتیں، رقص و سرودی گہما گہما اب افسردگی کی کبر میں لپٹ چلی تھی۔ اس کا بیٹا لہجہ میرے اعصاب بھگور رہا تھا، اس کی کچلیاں آواز میرا دل لرز رہی تھی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شکاف ڈال کے مجھے یہ یاد کر رہی تھیں کہ کسی اجنبی کا ڈھکنا ڈھک نہیں بن جاتا..... اگر وہ واقعی اجنبی ہوتو.....

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی، میرے کچھ کہنے سے قتل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ جب دعویٰ تھی یعنی موسمی خرابی۔

”تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟“ اس کے سوال پہ میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا تنہا ہوں، واقع ہوں یا یوں کہنا چاہیے قطعی نااہل ہوں اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلم کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبہ کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور میں جمولی میں خوشیاں بھر بھر کے تھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ یکدم تنہا تنہا سا لگنے لگتا ہے۔ ہر چہرہ نا آشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ابھی دیکھ میں کسی بہت اپنے نے بڑی گرم جوشی سے یہ راہ تھام لیا ہو۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی جھکن سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانتیں جھکن سے تو مجھے جیسے آوارہ گرد کا بھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز مجھ رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بات کہہ کر تو اس نے مجھے چونکا ہی دیا۔ ”یار ازر یاب جاؤ لالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہنا فیروز نے اپنے گھٹنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا۔ کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔“

”دوبارہ..... ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے.....“ میں یوں طرح چونک گیا تھا۔ اپنے ہی الفاظ پہ..... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس حقیقت کو کیسے فراموش کر بیٹھا اور کس کے لیے..... میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

”یارتو تم تو بخارے چمڑے ہو، میں ٹھہر ازمیندار تسم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پٹھانی کا شوہر..... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پرکرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن زکے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے لی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نویمت کے کام وہاں زکے پڑے ہیں۔ ہفت دو ہفت بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ ٹیکٹیں اٹھاتے پھرد گے۔ ابھی بات ہے کچھ دن اور رہ لو، اگر دل

لگ گیا ہے تو.....“

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکا تو کیوں رکھا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟ وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تلاشا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم اٹھنے نہیں پڑھانے دیتی؟ میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو خستہ جہر جہر کرتے ہوئے پہنے لگے، میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے غلو میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دوباش تک میں اور ژان فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے دین میں سوار کرا کے میں نے ژان خان کو بصد اصرار اس کے کام پہ بھیجا، ورنہ وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک پل کو جدا کرنے پہ تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے خود کو محل علی فیض کی قبر پہ موجود پایا۔ نچانے کون غصص تھا یہ..... اور کتنا بڑا زور عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ذریعے ایک عورت کے حواس پل بھر میں ضائع کر دیئے، اسے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پہ لا کھڑا کیا اور وہ عورت..... کتنی کشش ہوگی اس کی محبت میں، جس نے ایک غصص کو اپنا خاندان، رشتے تاتے، ذات پات، وطن، کاروبار سب بھلا کے اس حسین مگر پسماندہ وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا۔ میری عیوب تو ٹوٹی، جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پہ گلاب کے پھولوں کی بارش برس گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ تنہائی کے لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا، لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ بھینا اس کے گریز کا جب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پہ غصہ آنے لگا۔ میں کاش کی آرام دہ ٹراؤ زرد آؤ پر کھینچ کے اس کے نزدیک دو زانو بیٹھ گیا۔

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزیدہ دراز بگلوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بیٹھنا گستاخی محسوس ہوا، میں ڈراساں لگا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”اچھا وہ صبح تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر اجنبی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔“

”لاحول ولا قوۃ“ اس کی جلی کی بات یہ مجھے تازہ آگیا۔

”مومنہ مجھے گھما بھرا کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ یوں کہو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں وہ تھا دراصل تم اتنی اداس تھیں اور روری تھیں، مجھے کسی لڑکی کو چپ کرنا نہیں آتا اور نہ ہی تسلی دینا۔ میں نے اس وقت صرف یہ سوچا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس بیٹے والے سے نہ ہوتا کہ تمہیں اداہی کی اس کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جلدی میں انتہائی فضول بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں برا لگتا ہی چاہیے تھا لیکن اگر میں معافی مانگوں تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟“

وہ کوئی جواب دینے بغیر قبر کی گرد سے سوکے پتے اور پھنیاں اٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دینے بغیر لوٹ جانے کی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

”مجھے صرف یہ برا لگا صبح کہ تم نے خود کو اجنبی کہا۔“ اس کی سادہ سا جملہ مجھے سن کر گنیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا۔ آج پھر طویل تاریک رات ہو گی، چیتے چٹھٹاتے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل کا خوف ناک سناٹا۔

آف..... میں کیوں رکا..... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، فیروز کے ساتھ مجھے بیڑیاں پسند نہیں۔ الجھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے..... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم کھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں کیوں رکا..... کیوں..... آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں لوٹا۔

مجھے لوٹنا بھی نہیں تھا۔ کم از کم اکیلے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور طیلے بھانوں کے پرچے اڑتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ڈراسی ضد پہ..... جو..... جھک جھک کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ..... بس وہ..... اور کوئی نہیں..... اور کچھ نہیں..... صرف وہ.....

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے وادی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا۔ لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اُسے جمیل سہوک کے پاس پایا۔ وہ سونا پائیاں شہنے سے پانی سے وجوہ کے ٹوکرے میں رکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا سکرنا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن ہونے والی کئی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

”کہاں تھیں تم، مومنہ میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔“

میں لہجے کی بے چینی چھپانے میں قطعاً ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپانا ہی کب چاہتا تھا۔

”کوئی کام تھیں؟“ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

”مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، خان زریاب خٹک ہے میرا نام۔“

”اچھا نام ہے۔“ وہ منہ پہ زور زور سے چھپا کے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر کے ایک سرے سے پک گئی، جس پہ میں ناگہمیں پارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر پھر کے اس کے شفاف چہرے سے دیکھتے ہوئے پانی کے قطرہ کو دیکھا۔

”تم نے بتایا نہیں کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری سستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔“ اس نے میری بات کو تالی اور لہجے کی تڑپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

”میں..... میں.....“ بٹا لپٹی، گئی تھی۔ میرے ساموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خبر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رہی تھی۔ آج میری خالد وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے بیٹھ، اٹھنے اور بچنے لے کے جا رہی ہوں۔“ اس نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

”کیا تم اور کچھ دن وہاں روکی۔“ میرا دل تنگ پڑنے لگا۔

”نہیں تو..... بس دے کے آ جاؤں گی۔“

”تو یہ کیڑے، میں سمجھا وہاں رہنے جا رہی ہوں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ ٹوکرا کر پہلے لکڑی کھڑی ہوئی۔

”میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اٹھالیتا ہوں۔“ میرے ہاتھ آگے

بڑھانے پر وہ گھبرائی۔

”نہیں، نہیں..... تم کیسے جاؤ گے، تم نہیں جانتے، وہاں کوئی.....“

”بہت دور ہے کیا، یہ بٹالینی گاؤں“ اس نے بے ساختہ مسکراہٹ روکی۔

”بٹالینی۔“ گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو پھیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان

نظر آ رہا ہے ناں اسے بٹالینی کہتے ہیں اور اب خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“

وہ زچہ سی ہوئی، اس کے چہرے پر پھٹکی سرخی مجھے لطف دے رہی تھی، پھر بھی میں

نے اس کی حالت پر مزید تم نہ ڈھاتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

”اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ ضرور آنا اور مجھے

بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔“

وہ جاتے جاتے چونک کے پلٹی اور میرے شرارت بھرے چہرے پر ایک خفگی بھری

نظر ڈال کے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور مجھ کے میرادل موہ لیا۔ باپ کے

مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ جس نے اسے یہاں کی دیگر

دو شیرازوں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا یہ

تذبذب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بٹالینی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس

کے سامنے انجان بنارہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی ساخت کے دوران میں اس جمیل پہ بھی آیا تھا اور اس

کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کسی کھڑکی اور روشن دان کے پختی چھت والے اس

کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ

تھلگ کیوں ہے۔

یہ ”بٹالینی“ ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام

کرتی ہے، اپنے مرد اور اہل خانہ سے کٹ کر، ناپاک والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی

اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رہ سکتی ہے اس کے ساتھ یا پھر گھر کی عورت ملنے آ

سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رات کے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس

لائی ہے جو بٹالینی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہی۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ پھیل کے پانی

سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوئی ہے، اور صاف لباس پہننے کے بعد ہستی میں قدم

رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عمارت کے قریب جانا منع ہے۔“

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پر فیروز نے رینارکس دیا تھا۔

”تو عورتوں کا کیونٹی سینٹر ہے یہاں۔“

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اس سے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے

چینی چھائی اور ناشتے کے بعد تو مجھ سے ایک بل بھی نہڑکا اور میں جمیل سوک کی طرف

نکل پڑا۔ وہاں پہنچنے کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرسبز کھنڈے پر

مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

”تم کب آئیں؟“

”بس ابھی.....“ وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پر چلی سی تھی۔

”پھر..... کیا خبر ہے؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بتانا ہو،“ اس نے خوشی سے پورے لہجے میں بتایا۔

”چھ بیٹیوں کے بعد۔“

”مبارک ہو۔“ میں اس کی بڑھاپوں اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس

کے دل میں خود سے وابستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

”اور بچہ ہے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔“ ”زریاب خان۔“ اس نے جھپکتے

ہوئے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سن کر میں سحر زدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس

نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پر پھول ہی پھول جن دے دیے ہوں۔ میری خاموشی محسوس

کر کے وہ الگ الگ کے بولی۔

”کیا اوصاف..... برا لگا تمہیں..... تمہارا نام میں نے ایک..... میرا مطلب ہے

کہاں تم کہاں وہ..... شاید میں نے غلط کیا ناں۔“

”بالکل غلط کیا..... مجھے دوبارہ صاحب نکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل

ہی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا۔ سخت بُرا لگتا ہے مجھے۔“

”اس میں بُرا لگنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا..... میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔“

”مجھے تم سے اجترام نہیں..... محبت چاہیے۔“ میری اس بات پر اس کا رد عمل وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ حسین تھی..... یہ تو میں جانتا تھا، مگر اس موقع پر چہرے پر سچانے کے لیے اس نے رنگ اس نے کہاں چھپا کر رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم وا کھینچتے کیوں سے سانسوں کی مدھم آوازیں اٹکے اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹائی جھلی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پہ اٹھی تھیں پر جھکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

۴ مومند کا ایک اور وصف کھلا مجھ پہ۔ وہ اچھا لگتا لیتی ہے یہ تو میں پہلا ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اُس کا سنا ہے یہ بھی لگتا ہے یہ تیار نہ ہوئی۔

”میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دو شیزائیں اسے محبوب کے لیے گیت لکھتی ہیں اور گاتی ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دیکتا ہے ان فضاؤں کی رنگینی کا۔“ میں نے جھوٹ موٹ منہ پھیلا یا۔

”اچھا تمہیں۔“ ”برہ“ سناٹی ہوں، مگر تم میری طرف دیکھنا مت، بالکل بھی نہیں ورنہ میں گپیں پاؤں گی۔“ وہ ہار مان کے بولی۔

”کیوں..... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں..... ایسا ہی مشکل لگتا ہے، تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں ایک لمبے کے لیے بھی اس سمت رکتے چہرے کی وید سے خود کو محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھلیوں پہ لٹائی پوٹوں کے بادل گرا لیے۔ پکے سُرد اور سادہ سی لے میں ابھی الفاظ کا جادو میرے ارد گرد پھیلنے لگا۔ اس کے پوٹوں اور شفاف گردن پہ بیک وقت ہلکی نیلی رگیں ابھر اُڑ رہی تھیں؛ زخاؤں پہ بکھوڑے لیے بھینروں میں، میں ایسا کھویا کہ وہ کب خاموش ہوئی پتہ ہی نہ چلا۔

”کیا لگا؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔ ”برہ“ یہاں کا لوک گیت ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے غو اختصار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر

میں اٹھائی جانے والی اس کی صوبتوں پہ بھی فکر مند ہے۔

اے میرے محبوب

میں ہر روز تمہارا لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔

میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں

تم نے چہاہ ڈکھ اٹھایا ہے

اے میرے محبوب

لوٹ آؤ

میں تمہاری ناگوں کی تھکن، اپنے ہاتھوں میں سمولوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت کا ترجمہ پشتو میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

”سنو تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟“

”تھوڑا بہت، جتنا پتا پڑھا سا۔“ یہاں کتا میں عام نہیں مانتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کھلے بھی یاد کرادیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی وادی کے اکثر لوگوں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا مذہب اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں رنگنا مناسب سمجھا، یہ بات بہت سے لوگوں کو غصہ نہ ہوئی انہوں نے اس پر اسی وادی میں رہنے کی شرط عائد کی اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً اسے برداشت کرتے رہے۔

ماں کے بعد ابا چاہتا تو مجھے لے کے یہاں سے جاسکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے، مگر بہن بھائی ذات برادر سب تھا۔ وہ کہیں جا کے سنے سرے سے زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں گیا، اس وادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہی جو اس کی محبت کی مہر مان گودھی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک ڈرا پڑھے لکھے جوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو سمنی میں صبح بھاڑ لگوانا بھی ابا نے سکھا یا۔ بہت سی عورتیں اپنے شہر خوار پیچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ قصبے جا کر اکسیرن، کھابھی کے شربت اور درد وغیرہ

کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قہیے لے کر جاتا، علاج کے لیے۔ میری بوڑھی مائی کا سارا خرچہ اٹھایا، اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بٹائی لیا، آج میں بھی صرف اس کے کمروں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ بچہ مجھے تنظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے عمل پر اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔“

”تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”لاہور مانا تھے اچھے شہر کا۔ ساہے بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔“ وہ فرط اشتیاق سے بولی۔

”ہاں کئی بار، واقعی بڑا ہر وقت شہر ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اسے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رہ سکتا ہے۔“

”عشق..... صرف عشق.....“ وہ جذب کے سے عالم میں کہنے لگی۔

”ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ اس کی بات پر میں گھٹنایا۔

ہر بھی اڈائیں خاک بیاں اوست ہے تم گزر دو کسمی

ہم بھی دکھائیں چاک کر بیاں لیکن جاں دیکھو تو

”دیکھیں گے۔“ اس کے منہ سے پہلی بار شرتہ اردو کے الفاظ سن کر میں نرمی طرح

چونکا۔

”تم..... اردو بھی.....“ اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو میں ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

”تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ.....“

”تم بھی صاحب.....“ وہ کھلکھلائی۔

”ابھی میں نے بتایا تھا تاں کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔“

”ہاں بس وہ.....“ میں جھلسا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب

تھا کہ ہر بات کی باریکی میں جا سوں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۸ء

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اسے مہینے لگتے گے، خبر ہی نہ تھی۔ چہرہ اس کے ساتھ ہٹا کے بھی پھڑکتے وقت اداسی دل پہ بچنے کا ڈھیلی ہے۔ گھٹنوں اس کے ساتھ اچھڑا اچھڑا دھڑکا ہوا تھا کہ اس نے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے کہ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولنا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک بنا رقیق مل گیا ہے تو.....

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ گھٹنوں سننے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جائے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چمپڑا ہوں۔ غصہ بھی تو اسے اس قدر جلد آتا ہے کہ وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے کہ وہ بولتی رہے، میں سننا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں اضافے کے لیے اداسی کے مختلف رسم و رواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

”یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ تو تدریس سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے اسے عقائد پر یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔“ ”مگر“ یعنی جودہ کا مقدس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جاسکتا، البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کرنے کے لیے یہ دن مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ پیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے، انہیں بال کٹوانا اور سر رنگا رکھنا منع ہے۔ مرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر فرموشی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ، ہر آسانی آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے کچلنے کا مطلب ہے پریاں لڑائی کے دوران کھوار چلا رہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آ جاتی ہے۔ پھاڑوں پر پریاں رکتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے، پریاں اس کی زندگی پر اچھا نرا اثر ڈال سکتی ہیں۔“

وہ چپ ہوئی جیسے میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی لے تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اس کے سامنے کے لیے میں نے چمپڑا۔

”یہ تم بار بار۔“ وہ لوگ، وہ لوگ، کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کوں کی کم ہو۔ یاد نہیں اس دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکھرے دو سیگ اور چنگر رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگنا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔

”نہ نہ ہاتھ مت لگنا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً پتھر پڑ جاتا ہے۔“ حسب توقع اس کا منہ پھول گیا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر نہیں چڑھاتی، قربان کا نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ بارش، آندھی، طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھ سے برواشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں کن کن حالات میں اپنا ایمان بچائے بیٹھی ہوں۔“

وہ زیادہ ہی گرم ہو گئی۔

”اوہ تم تو ایمان رکھیں۔ میں نے ایسا کہا کہ تم خدا خواستہ..... وہ تو اس دن تم نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلا دی۔“

”تو کیا ہوا..... ان لوگوں میں پہلے بڑھنے کا کچھ اثر تو ہوتا تھا۔ میری فطرت نہیں بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چار پانی شام سے پہلے پہلے جہاں بچھانی ہو وہاں بچھانی جاتی ہے، شام کے بعد کہیں اور پھٹل نہیں کی جاتی۔ گھر کی باقی لوگوں کی طرح میں بھی اسی معمول پہ قائم ہوں۔ لیکن یہ اور اس جیسی دوسری بے ضرری باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ میرا اتنا تو پکا مسلمان تھا۔ لیکن گھر سے نکلے ہوئے اگر کافی لمبی راستہ کاٹ جائے تو سب کام چھوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تو بے چارگی سے کہنے لگا۔

”پتہ نہیں، مگر ماں ہمیشہ کہتی تھی کافی لمبی کارستہ کاٹ دینا محض ہوتا ہے۔“

”اچھا تمہارے اہتمام سے اپنے گھر کی، اپنے شہر کی باتیں کرتے تھے۔“ بمشکل میں موضوع تبدیل کر سکا تھا۔

”ہاں کبھی کبھی انہیں شہر سے زیادہ اپنا گاؤں یاد آتا تھا، جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا۔ اپنے اسکول کی باتیں اور ایک گیت تھا اردو میں نہیں، کسی اور زبان میں شاید ان کی مادری زبان میں وہ اکثر گنگماتے تھے۔ مجھے بہت پسند تھا۔ سمجھ میں نہ آنے کے

باد جو دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد اب کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔“

”پنجابی میں ہوگا۔“ میں نے قیاس کیا۔

”پتہ نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عموماً کالیا۔“ وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

”عموماً لنگیاں پیاں پاؤں میں بھانپ گیا۔“

”ہاں..... ہاں وہی۔۔۔“ وہ اچھلی۔

”پنجابی کا گیت ہے، بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا، میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ ترجمہ جب سے مجھے بتایا مجھے اس گیت سے اور مجھے ہی محبت ہو گئی۔“

”مجھے سناؤ ناں۔“ اس کی فرمائش پہ میں نے صاف انکار کر دیا۔

”میں گاؤں کا نہیں۔“ مجھے گانا نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں، مطلب کے ساتھ۔“ تب میں نے اس کے بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ دوبارہ فرمائش کر کے منی۔

عموماً لنگیاں پیاں پار

ہالے نہ دس او کا لیا

یعنی ساری عمر بچوں کے بل رستہ کھنکھرتی گئی۔ کچھ بل اور ضمیر جا لے کالے بادل۔

ابھی نہ برس شاید وہ آتا ہی ہو۔

پھلاں دے رنگ کالے

سرخ گلاباں دے موسم دج

پھلاں دے رنگ کالے

جداں میں گزری بھر بھی ویران دکھتی ہے، اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔“

یہاں اس نے مجھے نوک کر دو بارہ اشعار اور مطلب سنے۔

”مجھے کچھ طرح سمجھ نہیں آئی۔ جداں کا کرب اپنی جگہ، لیکن پھولوں کا تو جو رنگ ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آتے لگتے ہیں۔“

”بھئی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں، کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اتر کر معنی چرا لوں۔ اتنی شاعرانہ جس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کر سکوں۔ ہاں اگلے بول سنو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جائے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تان دو رخ سزاس

جے میں کھ ماہی دلوں موزاں

”اگر کبھی میں نے تم سے ٹکھٹھٹھائی میں تمہارا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کا سوچا بھی تو خدا مجھے دو رخ میں پھینک دے، مجھے آنک دل جلنے کے لیے.....“

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہد سے بھری جھیلیں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور ایک گلابی پھلی میرے لبوں پہ ٹھہری۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بخشل ایک ہفتہ کے رد کو واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا متفقہ رویہ اور کھوتے انداز ابھی مجھے متوجہ کر گئے اور پھر اس نے خود ہی ذکر پھیر دیا۔

”لالہ میں کیا سن رہا ہوں، تم اور..... لڑکی؟“

”لڑکی؟“ میں چونکا۔ ”تمہارا مطلب ہے مومنہ۔“

”ہاں وہی۔“ مجھے سوا تھک اطلاع مل چکی تھی، مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے یونہی دن رات گزرنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں..... یعنی اگر معاملہ یہ نہیں ہے تو..... پھر“

”پھر؟“ اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چا چا سے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ وادی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پر کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں، اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے نضال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کبھی والے اور یہاں قصبے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا ٹیٹل لگ چکا ہے۔ ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آئے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔“

پتہ نہیں تم اتنا بولڈ اسٹیپ لینے کی جرات کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کبھی لینے ہو تو یہ پتا نہیں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرتا ہے، تم کس حد تک انوالو ہو؟ اگر یہ کھل وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پاتے تو یہ اچھا مشورہ ہے اس تمام قصے کو نہیں ڈن کر دو اور میرے ساتھ واپس چلنے کی تیار کی کرو۔ کیونکہ ایران چاچا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا تھا اور اس انٹی بیٹم کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ماموں کے پاس رشتہ بھیجا جائے، ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔

اپنی لڑکی اور وہ بھی ایسی لڑکی جسے انہوں نے کسی مقدس امانت کی طرح رکھا ہو، اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کی اجازت وہ نہیں دے سکتے۔“

اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تھے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

”بہت بہت شکریہ.....“

”کس بات کا؟ خبردار کہہ نا۔“ وہ میرے رد عمل پہ حیران تھا۔

”نہیں میرے جذبول کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موڑنے کا، اور یہ جو کی دن سے ایک بے نام سی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا

ہوگا..... کیا کروں گا میں..... کیسے واپس جاؤں گا..... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر.....
اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بھرپور "میں کھل کر رہا۔"
"ہاؤ اسٹوڈنٹ آئی ایم (کتنّا احمق ہوں میں) اتنی ہی بات تھی اور کبھی میرے ذہن
میں آئی ہی نہیں۔"

"واقعی؟" "فیروزہ تجب سے بولا پھر تہجد مار کے نپس پڑا۔"

"کمال شے ہے ٹو بھی پارازیاہ۔"

"اب راہ بھائی وے ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے ورنہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کل ہی
چلیں بات کرنے؟" میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو "کل" ہے وہ
کچھ عجیبہ ہو گیا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بازوؤں سے بات کرلو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات
ہوں۔"

"شاید نہیں بھینا وہ کبھی نہیں مائیں گے کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔"

"پھر کئی..... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو۔..... اپنی مرضی سے ہر کام کرو۔"

لیکن کئی طور پہ ہی سبھی، تمہیں ان سے بات تو کرنی چاہیے۔ یہ عمر بھر کی بات ہے نہ تو تم
ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو نہ ہی بیوی کو پوشیدہ رکھ سکتے ہو، اگر تم نے
ان سے چھپا کے شادی کر لی تو۔"

"میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں، نہ چھپا کے بیوی کو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال
انہیں اطلاع دے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر کے رہوں گا۔ کئی طور پر بھی ان
سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الٹ کر دینا۔ جب ان کے انکار کے بعد
بھی میں نے اپنی مرضی سے یہ شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، کم از کم ابھی کسی کی مثل
اندازی کا اندیشہ تو نہیں، لیکن اگر باجہ جان اور بڑے لالہ کو بھنگ بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن
کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور ارادے سے باز رکھنے کی اور پھر لی بی جان..... تم
جاننے ہی ہو یہ خون رشتوں کی ایسوسی ایشن بلک میٹنگ، میں بغیر کسی دباؤ اور پریشانی کے
اپنی زندگی کا یہ سہرا دو شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری
مدد کرو گے۔"

میں نے اچھی طرح اپنا نقطہ نظر اس پہ واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا

اور جوں جوں اس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں سمجھ لیا تھا۔
یکم جون ۱۹۸۰ء

مومن کا طرز عمل میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے
کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل
میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے بے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری
بات سن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے
اُٹھ گیا جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کوونے کی
دعوت دی ہو۔ اس کے دلوٹک انکار یہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کر سکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا
کہ کیا کی ہے مجھ میں۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ہر
کئی اور خامی سمیت مجھ سے محبت کر سکتی ہو تو شادی کیوں نہیں....."

"بس نہیں کر سکتی، کہا ناں بالکل نہیں کر سکتی۔" اس کے مسلسل نفی میں سر ہلانے پر
غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

"میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی نہیں تصور
کر سکتا کہ تم مجھ سے محبت کا ڈرامہ کیا، مجھ سے بھوٹے اقرار کیے، نہیں..... نہیں کیونکہ
میں جانتا ہوں مومن ایسا نہیں کر سکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی
جھوٹ نہیں بول سکتیں۔"

اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں
میں تھام کے اسے اپنی آنکھوں میں سمجھتا ہے مجبور کروں، لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور
ودناؤ اس کے رو برو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

"مومن خدا کے لیے کچھ سوچو..... وہ کیا وجہ ہے کہ کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس
شادی سے انکار پہ اکسار ہے۔" میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان
دینے پہ تیار ہو گیا۔

"تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے
اپنا لینا۔ سارے جہان سے مگر لے کر اپنی من مانی کرنا۔ ایک فرد کی محبت پانے کے لیے
دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی کھل نہیں۔ یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔" بعد میں

دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی کیا ضمانت ہے تمہارے پاس۔
ہوسکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن، بھائی، نہ خاندان، نہ
جانیباد۔“

”اور تم..... تم تو رہو گی ناں۔“

”فرض کرو میں بھی نہ رہی تو۔ ابانے بھی ماں کے مجھ سے سب کو چھوڑا۔ لیکن ماں کو
تو زندگی نے بس کچھ سال کی مہلت دی۔ اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔ میری
صورت میں ایک مستقل و مرداری اور بس..... میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی
عذاب سے گزر رہیں۔ انہوں کی بے اعتنائی کا کرب کہیں۔ ماں کے پاس تو پھر بھی اس کے
تمام رشتے موجود تھے۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ میں خود ہی دامان، مہیں کیا دے سکوں
گی۔“

”مجھے صرف تم چاہیے ہومومنہ، صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے
کو تیار ہوں۔ تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے
کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔“

”اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں کتنے خسارے میں رہوں گی۔ کل بھی
تمہی دامان، آج بھی، اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری
اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تازہ ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی،
تم مجھے بھی نہ بھی ملے تب بھی میرے دل میں تمہارے لیے وہی مقام رہے گا۔ تم دنیا کے
کسی کو نے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔ اس بات کا یقین ہے
مجھے۔ پھر میں صرف محبت کے نام پر تم سے شادی کیوں کروں۔“

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوئی تو وہ ایسا نقص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے
متعارف نہیں کر دے گا، جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھانجی بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے
پرے کنبے میں بسائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر
چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک ہی بار
ہوئی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ درنہ بے نام و نشان تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے
ساتھ جا کے بے سائبان نہیں ہو چاقی۔“

”تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ علی، ایک خشک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم

پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا
پڑے۔“

”تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں
کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سروں پہ
تھوپ کے اور بھی بے وقور کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل
نہیں۔“

اس کے لیے میں جتنی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند
دبانگ دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی نہیں کیا میں واقعی باجا جان کی نظروں میں
اسے ہو کی حیثیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے
خشک فیملی کے باعث فرد کی طرح محترم اور عزیز جائیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو
کر اس شادی کو تسلیم کر لیں، مومنہ کو خشک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے،
لیکن وہ اسنے وسیع القلب ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے
ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ ہی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا
چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

۲ جون ۱۹۸۰ء

اس اذیت ناک رات کی تمام تر سفاکی میرے چہرے پہ قلم تھی۔ رت چلے اور
تذنب کے خون آشام سائے آنکھوں سے ہو رہا تھے، ٹپکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں
کانٹے چھ جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے پُر غلوں
استفشار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے
پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

”فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان
ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باجا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی
وہ اسے اس طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس
کے نام کے آگے لگا سکوں، مجھے اس کی ہر ای کا اعتبار آ جائے تو میں تمام دنیا کا سامنا
کر لوں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔“

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گنگنا رہا اور ٹکٹ و بے تابی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

”اٹھو خان خانان..... اٹھو جان جانان..... آؤ تمہیں بنا میں سنواریں..... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لٹکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خاں سے حجامت وغیرہ بنواؤ، کچھ شکل پر رونق لاؤ۔ میرے پیار کی بارات نکلی ہے آج۔“ اس کی بے ربط گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا سارا؟“ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔
 ”میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی چکی تھیں، اس کے اپنے اندیشے اپنی فکریں تھیں بڑی خووار اور ناموس والی لڑکی ہے۔ ایک بچتون زادے کو اور کیا چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں اصلی ہو۔“
 وہ نمجانے اور تکی ویر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ میں نے ٹوک دیا۔

”تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔“
 ”قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پر تیار ہے۔“ اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی،
 جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پر بے تاب۔

”اوہ ہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کیا کہا اس سے؟“

”اے اعتماد دیا ہے، جس سے اس کی ذات آن آ شامی۔! سے وہ رشتہ دیا ہے جس کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب ہنجر ہے۔ محبت کے بارے میں بڑی حرص ہے اس کے اندر، چاہتی ہے ہر شے، ہر حوالے سے چاہی جائے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ چھین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیز یار بن کر کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔“

اور پھر وہ اپنی ذات اور تقدس کے حوالے سے بے حد حساس ہے بڑے بڑے خراب حالات اور نامساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سفیال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پر غرور کی حد تک ناز ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم

تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت ہے کہیں کسی مسجد میں ہوگا۔ صبح، ہم سب سید و شریف روانہ ہوں گے اور میری حویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس مسئلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔“
 ”لیکن تم نے یہ فیصلہ۔“

”صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے گا اور اسے پیار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب گفتگو ختم کرنا بند کرو اور اٹھ کر ڈھنگ کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر جین تو.....“ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔

میں..... میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا ٹھکر یہ تک ادا نہیں کر سکا اور چھایا ہوا۔ بھلا الفاظ اس کی محبت اور خلوص کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ سر میں اٹھار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیریز کرنے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار ڈسٹرب کر رہی ہے۔

۳ جون ۱۹۸۰ء

اور بالاخر مومنہ علی، مومنہ ذریاب، ٹنک بن ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ شادی ہو تو گئی۔ مومنہ کی ضد کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری مجبوری کہ باپا جان کی صورت بھی کا فرستان اپنے بیٹے کی دلہن دھوٹے نہیں آ سکتے تھے اور کا فرستان سے اسے بغیر کسی تعلق کے میں لے جائیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہوئی تھی..... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں شہد کی دو جھیلوں کو بس پیاسا ہی بکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی مٹھاس سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ارباب ٹنک کا سب سے لائق فائق اور لاڈلا بیٹا خان ذریاب ٹنک، سرحد کے مشہور خانوادے کا جیشم و چراغ سینکڑوں میل پہنچلی امراضی اور کر دڑوں کی ساید اودکا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹولی کے کر مانگے کا شلوار سوٹ پہن کر پیدل، کا فرستان کی ہستی میں ٹھگ گئی کے آخری کو نے یہ موجود لکڑی اور پتھروں سے بنے اس دو منزلہ مکان تک چل کے جانے گا۔

مقدس ہے جان لینے کی بے تاب سواری تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریک کا چودھوی اُسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا دائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دھڑکتا ہوا سانسنا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکھڑی اور دشوار سانسوں کی آمد و رفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دہلی دہلی سکسوں کی مدھم آوازیں۔ ضبط کر رہی ہے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید بڑے جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے سختی کے ساتھ چمچے لب سکسوں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خٹک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹھٹھکا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خٹک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے وہ اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”آپ کی وجہ سے باچا جان..... صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہوا ہے اور اس کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز کے ذمہ دار آپ ہیں۔ آپ ہی ہیں اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے والے، اس کے ہر روایت شکن اقدام سے ہوشیاری کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے کمزور پڑنے والے۔“

خان ارباب خٹک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے پہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی اونچی آواز سنی تھی۔ پہلی بار کوئی ان کے سامنے ان کے جرم گوار ہا تھا اور انکی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا بیٹا بنا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خٹک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں ابھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے اٹھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آنکھیں کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سر ہانے کھڑی بیٹھنے کے دانے

دروازے پہ موجود چند بزرگ خورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پردیا ہوا ایک بار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی پچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آ سکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا، تاکہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ کہیں اس قدر فضول اور بے زار کن ہو گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے اتروا کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھونی دی گئی۔

میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چا جانے بتایا۔

”بچہ یہ تمہاری نظر اتارتا ہے۔ جب دو محبت کرنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی زوہیں تڑپ جاتی ہیں۔ جنہیں دنیا میں اپنی محبت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہ ماں جنہیں دھونی دے رہی ہے۔“

اور کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں..... جی ہاں میں حسدوں کے خوف سے دیک کے بیٹھ گیا اور چپ چاپ نظر اتروانے لگا۔

کون کہتا ہے محبت دیر ہوئی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے سم جاتی ہے۔

☆☆☆

خان زریاب خٹک۔

مومنہ علی۔

اور.....

فیروز وردگ۔

ایک سیٹی سادی کہانی کے آسان فہم سے کردار۔

پھر ابہام کہاں ہے؟ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

شاید جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان ماما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن تب اس وقت فیروز وردگ کا کیا کردار رہ جاتا ہوگا اس سادی کہانی میں، کیوں ان کا نام ابھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے..... کیوں؟ آخر کیوں؟

گرانے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ملا متی نظروں سے گھورا۔

”بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجئے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی تندہ تیز باتیں سہہ سکیں۔“

”باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر۔۔۔“ بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دکھایا۔

”مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔“

”یہ ہی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھانا تھا بس مجھے درس لگ اور دراب کو سکھایا سارے حدود و قیود کا احترام، بزرگوں اور ان کی مرضی کو ہر حال میں مقدم جانا، خاندانی حرمت و ناموس کو بتایا ہر چیز پر اویٹ دینا..... کاش..... کاش..... زریاب کو کبھی کچھ سکھایا ہوتا۔ لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی کب ملا۔ وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات و خاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچا جان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بخارہ بن گیا تھا وہ..... جگر گھر گھومنے والا..... اور بخارن ہی آغلا یا گھر میں۔“

”الہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ جاگیر اور قواعد و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو مورد الزام ٹھہرا نا غلط ہے۔“ دراب نے کہا۔

”اولاد کو لگام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کیسی ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی زندگیاں واؤ پر لگا دے۔“ افراسیاب کسی طور اپنا غضب دبائے یہ تیار نہ تھے۔

”نہ اس کی سوچ لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر بھٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پہاڑان سے ملتی..... اور اگر یہ سب ہوتا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے بارمان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔

کیوں اس کی ناخلفی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر کر کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

کناج کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوادیتے۔ لڑکی کو مروا کے کلام ہی کے پہاڑوں میں پھنکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اُتر ہی جانا تھا ایک دن۔“

”بعض جادو سرچنے کے بولتے ہیں۔“ بی بی جان نے سرد آدھ بھری۔

”اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا آسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا نامکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھو دینے کے ڈر سے خانہ جی اس لڑکی کا بال بھی پکا نہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ اعلیٰ تعلیق اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے کا ڈراوا بھی لیکن سب بے سود۔ وہ پچھلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ دینے پہ تیار تھا۔ خانہ جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو۔“ انہوں نے شوہر کی طرف سے صفائی پیش کی۔

”میں صرف ایک باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں۔“ افراسیاب جھکے جھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں کھٹکتی۔

”اس کی جوانی براہ دہیوں کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے بیس سال اس گھر کے کسی بھی فرد نے پرسکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انگڑوں پہ نہیں لوٹتا ہوگا، یہ سوچ کر کہ خانہ زریاب خشک جیسا نفیس اور حسین شہزادہ.....“ دراب کی آنکھوں میں پھیلنے لگی تھی ان کے قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

”میں صرف باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں، ایک بیٹا بھی ہوں۔ یہ بے بسی مجھے ترپاتی رہی کہ میں اتنا اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی اپنے باپ کے سینے میں ٹھنڈک نہیں پیدا کر سکتا۔ جب میں اور دراب ان کے آگے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی نگاہیں ہمارے پیلو میں کس کو تلاشی میں کیا میں نہیں جانتا۔..... اور اب..... جب ان کی برسوں کی امیدیں پوری ہونے والی ہیں تو یہ فیروز کا مسئلہ..... دروگ خاندان اس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔“ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں منھیاں کھول اور ہنسنے لگا رہے تھے۔

”اسی لیے رہ رہ کے مجھے بس یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت ہی اس مصیبت کا سد باب ہو گیا ہوتا۔ اس نے کناج کر ہی لیا تھا تو کم از کم اس کی اس حرکت سے خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈال دینے چاہیے تھے۔ اس ذلیل عورت کو کھلی چھوٹ دے دی ہم لوگوں نے

زریاب کی زندگی سے کھیلنے کی۔“

”گزرے وقت کو کون سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً یورپ، یا انٹینس پیچھا جاسکے۔“

”ہوں..... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔“

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے جینے کی سکت
رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹا رہتا ہوں میں
وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ
خود کو کس کس کے ہر وقت بانہٹتا رہتا ہوں میں
ہر دن پہلے سے کہیں بڑھ کے پڑا کرں اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر۔
ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیزے چھوٹی اذیتیں سیٹھ لاتا ہے اور ہر شام کی پھلتی
تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔

یادیں۔

جو اور بھی ٹھہر کر دیتی ہیں

یادیں.....

جو اور بھی تھکا کر دیتی ہیں۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے سڑتے جلتے وجود کی پرچھائیں
بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی جدت آمیز آغوش میں منہ
چھپا لے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے میں
نہ ملوں۔ یادیں..... ان بوسیدہ دیواروں سے کمریں مارتی پھر میں لیکن اس دل دو ماغ تنک
پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں وہاں بو لیتی ہیں۔ کاش.....
کاش..... آہ.....

لمبی سرد آہ کھینچنے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس
مختصر سی چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس
کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھوکنی کی طرح چلنے لگا اور طلق سے عجیب آوازیں

نکلے لگیں اس نے اپنا دھندھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا
لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کر سر اُونچا کر کے سانس بھرا کر نکلے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہتا
ہم نفس، سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆

اور یہ آخری چند صفحات

مقدس نے چونک کے خنیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔

”آج سے پہلے میں کس قدر انجان تھی، کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا۔

جان..... کیسی ہیں میری ماما..... کون ہیں وہ.....

اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پر نقش ہے اس حسین چہرے کا..... وہ چہرہ جو

میری ماں کا ہے۔

اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اُتر چکی ہوں..... اس کے دل کے اندر..... جو

میرے باپ کا ہے۔

کتنا انوکھا تجربہ ہے یہ بھی ان احساسات کو لفظ بہ لفظ پڑھنا محسوس کرتا۔

ان تجربات کی گہرائی سے گزرتا۔ وہی امید و بیم کی کیفیات، وہی انتظار کی بے

تابیاں، وہی اظہار کی دشمنی..... وہی کرب کے عالم..... ہر چیز میں نے خود محسوس کی

ہے۔ ہر چیز میں خود شامل ہوں۔

وہ میرے کسی جذبے، کسی احساس، کسی تجربے میں شامل نہیں۔ اس دکھ کا کچھ مداوا

تو ہوا ہے ناں۔

اور یہ آخری چند صفحات۔

نجانے یہ کیوں سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ بھید دفن ہو، شاید

ابھی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔“

اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پہ آمادہ کیا۔

اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح کھو گئی تھی کہ یہ بات ذہن سے

نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جانتا جانتی ہے، لیکن اب آخری دو تین صفحات نے اس کی

بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ یہ ڈائری بھی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی

میرادل کرتا میں زرساگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دینا کی سیرکراؤں لیکن ان کے پاس اپنی بیٹیوں اور کزنز کے بھتیجیوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ..... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ..... وہی احترام جو مجھے باپا جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اولاد کے درمیان بھی حاصل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخر دراب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، بارود میں بڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم میں انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بارود سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوں کی لڑائیوں کے کھیل کھیلتا ہے، جنگی سوروں کا شکار کرتا ہے، باپا جان کی شوقیہ دشمن داریوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور پھر پھنچیاں ختم ہوتی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی بھی تو لگتا ہے ہم تینوں بھائیوں میں سے وہی اصل خازنہ ہے کہ باپا جان کے بقول اس کے تیور ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندو آٹھائے رکھنا، سنگلاخ پہاڑوں پہ خاک اڑانے پھرنا اور پرہیز جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو شروع ہی سے رنگ، خوشبو اور فضا افریقہ کرنی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرائے گیا۔ جہاں سے خوشبو آئی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی..... اور میں جو سچے بیٹھا تھا کہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارہ ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو پشاور سے آگے صرف چارسدہ اور نوشہرہ تک گئی ہو۔ وہ میرے پڑگے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی..... لیکن مومنہ..... اس نے میرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا باچا معائنہ بھی نہ پڑھی ہوئی تھی..... جو اس بیٹوی وادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا

تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔ وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد بابا جان کو کتنا وقت لگا باپا جان کو رضامند کرنے میں اور کیا کیا چھیاں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تایا جان کی ناراضگی کا ذکر بھی تھا اور پچھلے ہی جان کی برہمی کا بھی۔ ماما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا بھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد جو بی بی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

باپا جان نے ناپسندیدہ، بہو کو تسلیم کرنے کے لیے بابا جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوقیہ یا باندی لگا کر باور میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو بردستی تسلیم کرانے کے باوجود بابا جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہل خانہ کے کچھ کچھ رے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگرچہ بابا ڈائری میں خاصی بے قاعدگی آگئی تھی، کہیں جا ر و ز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے لکھی تھی لیکن کہیں سے بھی دنوں کے مابین ہلکی پھلکی سی چھٹکلی اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی انڈر اسٹینڈنگ کے بعد آخر وہ کیا بات تھی جس نے یکا یک دنوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر نظر جمائی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مجھے یقین نہیں آتا کہ میں پورے ڈیڑھ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ نے میرے اندر کسی تنہائیوں کو یکسر محکم کر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں فٹ محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر میں خود کو ان سے بہت فاصلے پہ پاتا تھا۔ چلو بی بی جان، زرساگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی، وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن کر کے بور ہوتا تھا۔

کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی بہن بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا..... پھر..... پھر کیسے میں اسے کھودیتا۔ مجھے اسے باپا تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن بھکرے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھو یا تو محض اپنی آزادی۔ باپا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکارہ ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باپا جان آپ نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ یہ صحرا نوردی تو یوں ختم ہونا ہی تھی۔ مہینوں بعد جب بھی لھر لوٹا تھا تو باپا جان کے سینے سے لگ کر ٹھنڈک سی اتر جاتی تھی وجود میں، بی بی جان کے ہاتھ سے ہنسی بوسے پر سکون کرویتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکے نہ مجبور کرتا۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈالتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سمندر پار کیا کھونے جاؤں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھنگالنے پہ اکسایا اور ہاں اک اور تجھ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خاصی مشکل سے دل و دماغ دونوں کو اس جانب راغب کیا تھا لیکن اس کے ننھے سنے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی انگلی چھڑکے گھر سے نکلتا کس قدر دشوار لگتا ہے۔ پھر بھی..... نکلتا تو پڑے گا۔ سیاست میں بری طرح مشغول ہوجانے کے باعث لالہ کارنجان کاروبار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا مکمل دخل بس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باپا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا بھی ضروری ہے ورنہ ایک بڑی ذیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تہا پھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پر ہمت نظر آ رہی ہے اور مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلارہی ہے کل ہی میری فلائیٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً تین روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔“

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کر لی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔

”تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ ممانے باپا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے..... نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے کل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری ماما غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزاد ورثہ رکھتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہوگا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ چن لیا ہوگا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ لیکن..... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔

میری ممانہ تو غیر مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی..... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرنگ ان کا ”مومنہ“ ہونا ہی تو بابا جان کو چوٹا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں مر کے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں..... پھر..... پھر کیا وجہ تھی..... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں..... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے؟

یہ وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔
”کیا میری یاد نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟“ اسے ان آخری صفحات سے ڈیڑھ ماہ پہلے لکھی وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے صرف چھ گھنٹے بعد لکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

۵ ستمبر ۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آ کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادھوری تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا..... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا بھرپور..... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھلیں مجھے دیکھا..... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا مکمل ساتھ چہرہ چھوا، پہلی بار جب وہ سننے سے گلابی ہونٹ بسور کر روئی۔ اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی، جیسے روئی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

”دیکھو، مومن، دیکھو اس کا چہرہ..... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔“

”نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔“

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا لگدلا کر اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کیا۔
”ارے ہاں واقعی، اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید اس طرح کسمائے جانے پہ نر امان لگی تھی۔ پھر سے صفحیاں ہینچ کر رونے لگی۔

”دیکھو، مومن! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنکھیں نکلتے، صرف آنکھوں کا رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رورہی ہے۔ تم بھی جب رونی ہو تو شہد کے قطروں کے گرد جیسے کوئی زوج افزا گرا جاتا ہے۔“ میری مثال پہ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

”اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ اس کی گیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔

مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا، وہ غم تھیں۔

”بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی تڑپتے پھرتے ہیں۔“

☆☆☆

وہ دیوار سے سر ٹیکے اکڑوں بیٹھا تھا جب ہڑ برا کے رہ گیا۔ اس نے چوک کے چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سناٹے میں اس آواز کو ٹھونچنے کی کوشش کی مگر بے سود..... وہ بے چین ہو کے ہلنے لگا۔

”کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو پڑتا ہے۔ میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو..... پھر وہ آواز.....“

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں

سے

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بجز نہیں ہوتا

”یکس دراز سے اس کی یاد پھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کر لیا تھا۔“ وہ سینے مسئلے لگا جہاں دو نیلی کانچ سی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

”اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔“ کسی نے سرگوشی کی اور تاریکی میں دور دروزی بسوزنی آنکھیں ہزاروں شکوے لیے

اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف ٹکڑے آنسوؤں سے نم ہو کے چمک رہے تھے۔ پلکوں پہ ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے عقب سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور.....

”تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رورہی تھیں۔“ کسی نے ان بھوری آنکھوں میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خوفزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے چلانے لگا۔

”اسی لیے..... اسی لیے مجھے بری لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلادیتی ہیں، جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔“

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

”کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح صبح“ خان دراب ٹنک کو صبح صبح جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی نیلم نے حیرت سے پوچھا۔

خاہر ہے ان کا اتنا سوراخ جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ باہر نکلنا، خلاف معمول جو تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ خام بھینچلا گئیں۔ جیسے ہی وہ گن لوڈ کر کے پلٹے تو بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

”اب کیا ہے؟“ وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولے۔

”شکار پہ آپ نہ تو اکیلے جاتے ہیں نہ ہی اتنی راز داری کے ساتھ پھر.....؟“

”بڑے لالہ کے پاس جا رہا ہوں، اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجا ہے مجھے۔“

”انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں

بھلا اور پھر نہ رانیو نہ گاڑ..... یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے۔“ ان کی کسی طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زچ ہو گئے۔

”گاڑ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ راز داری کے ساتھ

پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمتن تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلتے

کا۔ خود وہ بھی سارا دن آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں

بھائی سارا دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو.....“

”کہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟“ زبیدہ بے تاب رہی اور آگے بڑھیں۔

”آہستہ زبیدہ آہستہ“ وہ ڈپٹ کے بولے۔

”ابھی نہیں آئے وہ، کل آتا ہے انہیں۔ لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھاٹ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو کئی روز سے جو کئے ہیں اس لیے آج بھی انہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔“

”ہائے اللہ۔“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

”اب کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں ایک بار لالہ خبریت کے ساتھ حوٹلی پہنچ جائیں۔ پھر کس کی جرات ہے جو انہیں نقصان پہنچائے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ نے کافی کچھ سوچ رکھا ہے وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دور بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ صرف انہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لا رہے ہیں۔“

”اور آپ..... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام.....“

”کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خشک خاندان اب چوڑیاں پہننے کے بیٹھ جائے۔ میرا بھائی آ رہا ہے اور میں اسے حفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ نف ہے تم عورتوں کی بڑولی پر اور خردار.....“ وہ پھر پلٹے۔ ”خبردار ابھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔“

☆☆☆

”کیا کہا؟ پھر سے کہنا.....“ شاور چوک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری ماما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالا ش کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خٹے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیدا کنشی مسلمان..... مومنہ علی..... مومنہ زریاب خشک۔“

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شاور کھوٹی کھوٹی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا رد عمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی

تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا جب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

”بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں چھٹی کا شکار کرنا اور جمیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کا لام میں داخل ہوا جاتا ہے، وادی، بیہوریت پر داخلے کیس پندرہ روپے ہے اور.....“

”ہیں..... ہیں..... یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔“ وہ مشتہ نظر دلوں سے اسے گھورنے لگی۔

”اور سنوٹا..... وہاں کی اپنی زبان میں بیہوریت کو مرمیت، برداور بری لاکہتے ہیں اور وہ جوان کا روایتی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو۔“ پوش“ کمر کی چٹنی کو“ مشوش“ اور ٹوپی کو“کوسی“ کہتے ہیں اور.....“

”اسٹاپ اس مقدس تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفر نامہ تو مت سناؤ۔“ وہ باقاعدہ ناراض ہو گئی۔

”جو پڑھا ہے وہی سنار ہی ہوں، ڈیزر، میری ماما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔“ مقدس نے مختصر ختم کہانی اسے سنا ڈالی۔

”مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ.....“ شاور بے یقینی سے بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سر جھٹک کے کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مقدس حیرت سے اس کا اضطراب نوٹ کر رہی تھی۔ شاور کے چہرے پہ فیصلہ کن اثرات پیدا ہوئے اور وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”سنو مقدس! میں پورے دھوکے سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہاری ماما کو جانتی ہوں۔“

”کیا.....؟“ وہ فرط حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شاور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

”آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہاٹھل میں ایک ملازمہ..... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل و صورت تم سے حد درجہ مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور مسکراہٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق

میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیر کی نہیں لے رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو وہ رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رنگت آنکھیں، سروقد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، اس کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔“

”کیا واقعی؟ پھر تو وہ..... کیا پتہ وہی.....“ اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

”ہاں شاید وہی..... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔“ شناور نے اس کے کپکپاتے وجود کو بھلایا۔

”میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچا رہی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ وہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ رواں اور خشتر اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب و لہجہ جھلک مار جاتا ہے اور پھر ان کی شکل و صورت، سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو عموماً سرحد کی پہاڑی دوشیزاؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتہ نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک ہی شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں شناور نہیں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شناور کہ وہی ماما ہیں وہی میری ماما ہیں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”مگر وہ فنان..... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ان کے چہرے پہ جملے کے نشان ہیں۔ ایک طرف کا رخسار اور آٹھ کا ٹیچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔“

”جو بھی ہو..... میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور ایسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔“

”ابھی..... ایسی وقت؟ مگر کیسے؟“ شناور بولی۔

”ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپسی کی تکنیں بنوائیں۔ تو میں نے انہیں اگلے ہفتے کسی بھی دن کی تکنیں بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔“

”لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔“

”اتنی جلدی تکنیں کیسے ملیں گی تمہیں؟“

”بائی روڈ چلے جائیں گے۔“ وہ مضمری۔

”بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹے کا سفر۔ ناپا بانا۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پلیز شائو..... پلیز..... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ منتوں پر اتر آئی۔

”میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہائی

بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤ گی۔ بی بی جان کہیں بھی بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت

نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا ریزن کیا دیں گے۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ کم از کم تم ایک کوشش تو کر سکتی ہو۔ ویسے بھی بی بی جان

تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بھانہ بنالو پلیز۔“

”اچھا بائی!“ اس کے مسلسل اصرار پہ وہ بارمان کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

”بی بی جان اور کیا وجہ ہوتی ہے دراصل میں نے اور میری دوسری فرینڈز نے جس

ایگزیمیشن میں امطلب ہے تصویری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی

ہے اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تاکہ اپنا نام کھواسکوں

ورنہ پھر میں اس مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے

ساتھ سمجھا دیجئے۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں

باقی ہیں لیکن مجھ سے اکیلے سفر نہیں کئے گا۔“

وہ جانتی تھی اس کا بھانا ایک دم بوکس اور فضول ہے، پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول

گئی کہ مقابلے بی بی جان تمہیں جنہیں اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔

انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے

والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام کھسوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ

پُر یقین نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضرور نہیں کہ اکیلے جانے

کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال

کے کہہ دیا۔

”تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نیچے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ

گی ورنہ تیاری میں دیر ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور

رات گئے ہاسٹل پہنچو۔“

”جھیک یو بی بی جان! ابھی نو بجتے میں پورا سوا گھنٹہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلو دیجئے،“ وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلے اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکھا ساٹس خارج کیا۔

”اچھا ہوا مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ ذریعہ کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ.....“

☆☆☆

”لالہ.....“ دراب نے بے تابی سے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگایا۔

”دراب تم؟“ وہ حیران تھا۔ اس قید تہائی میں کسی اپنے کی موجودگی؟

اذیت و کرب کے تھپڑ سہتے وجود کو کسی کی مہربان ہانپوں کا سہارا۔

اس نے حیرت سے خود کو اس کی ہانپوں کی گرم جوش پناہ میں محسوس کیا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں لالہ.....“

”مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا۔“ وہ حیران تھا کہاں تو سرچرچ کے بھی ایک رات نہ گزرتی تھی۔ کانٹوں پر چل چل کے ایک ایک پہر بتایا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے..... کہیں سال گزر گئے۔

”چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔“ اس نے بھائی کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہا۔

”گھر؟ چلو۔“ وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کیا مطلب

زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اڑانا ہے

اور خان ذریعہ خٹک برسوں بعد گندی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور سنگلاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”سینزل جیل پشاور۔“ کی تمام تر اذیتیں، تنہائیاں جیسے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھی..... کچھ اور استحسان..... کچھ اور اذیتیں.....

☆☆☆

عراس نگلیاں پیاں پار
ہالے نہ دس او کالیا
عراس نگلیاں پیاں پار
”یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔“

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی ہر سوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شنادر نے الف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

”کسی ایک جگہ تو تک جاؤ۔“ مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی کوفت ہوئی۔

”میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اجازت سنسان سرکوں پر تم بھی منہ لینے بیٹھی ہو۔ پتیلیک بھی اس قدر افراتفری میں کی کہ لکٹش بھی لانا بھول گیا۔“ آف کس طرح کئے گئے.....

یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔“ اس نے باقاعدہ وادیا پلا چاہا۔

”تو کوئی رسالہ ہی پڑھ ملو۔“ اس نے سائیڈ پر رکھے بیگ میں سے اکٹھے دو تین ڈائجسٹ نکال کے اس پر پھینکے۔

”یا پھر کچھ دیسوں کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاؤ۔“ وہ اس وقت واقعی بے حد اُلجھی ہوئی تھی، اسی لیے اس لیے اس لیے اس سے بات کر گئی، ورنہ شنادر کی طبیعت کا بے مبرا پن اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن کچلا بیٹھنا اس کی فطرت میں بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے اچھٹے لگی۔

”یہ کیا ہے لالہ! اس قدر کہو اس کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اسنے ہولناک ہیں۔“ پختہ پڑہ کسٹم۔“ اور یہ کیا ہے ”شرنگ دا بنگلو۔“ مائی گاڈ کیا تصویر بنی ہے اس کے گور پہ نام ہے۔“ خنزیر۔“

”وہ دو بیٹھے۔“ سرہ لو پند۔“

”واللہ کیا ظالم ظالم کا نام ہے اس میں۔“ اس نے سر ڈھٹتے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

”رہنے دو لالہ! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر سردار نگر کو سننے کیوں مقدس؟“ اسے آنکھیں موندے دیکھ کر وہ یائوس سی ہوئی۔ ”اب کس سے سر پھوڑوں۔“ ایک آدھ سینکڑ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی

طرف بھی۔

”اس سے تو اچھا ہے ایف ایم دن ہنڈرڈی لگا لوں۔ غریبیں اور کانیاں ہی کسی۔“
گاڑی میں پھر سے دھن پڑے دم دم ہم ہی ابھرتے گئے۔

کدے نہ سکھ سنیا کہا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

”خانہ خراب“ ایک جھکے سے گاڑی کے رکنے پر اور نگریب ماما جھنجھایا ہوا سا باہر

نکلا۔

”کیا ہوا؟“ وہ دونوں بھی متحیر ہو گئیں۔

”ٹائز پتھر ہو گیا ہے بی بی!“ وہ چپک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔

”چلو، کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ لگیں گے ٹائز صیغ ہونے

میں۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

”اوتے خانہ خراب کا بچہ۔ کسی چڑی کی اولاد پھر دعا دے گیا۔“

”اب کیا ہوا؟“ وہ دونوں بیک وقت ششے پیچھے کر کے باہر سر نکالتے ہوئے

چلائے۔

”وہ غیبیٹ رمضان نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چپک کرنے کے واسطے،

یہ چپک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پھالتو (قاتلو) ٹائز مائز بھی نہیں رہی۔“

”تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کی، کار تمہیں

ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ چڑی ہے تو تمہارا سوار کا ناند کب

ہوا ہے؟“ شاد کے ڈپٹے پہ وہ چپ چاپ سر جھکا کر کھڑا ہوا۔

”ظالم ظالم گانوں والے یہ عالم ظلم کیسٹ بھرے یاد تھے، ایک اسپتیر مائز نہیں رکھ سکتے

تھے۔“

”اب بس بھی کرو۔ یوں سر راہ چھاننے سے کچھ ہو جائے گا کیا؟“

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ جما کے بازو

نچاتے ہوئے اور نگریب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی گاڑیاں کچھ دیکھ کر کے

لیے آہستہ ہو جاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی فکر تو خرد رہی

لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے
اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کرولا کی اسپڈ بھی سلو ہو گئی ان
کے پاس آتی ہی، مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورت حال کا
جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھالے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے

سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

”اپنی براہ کرم؟“ بے حد شائستہ انداز میں اس نے شاد سے پوچھا۔ جو غصے سے

تمتھایا چہرہ لیے اسلسل کر رہا نیو کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے ڈھنگ سے اس

اجنبی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ محض بڑبڑا کر رہ گئی۔

”وہ ٹائز پتھر ہو گیا ہے صیب اور پھالتو ٹائز بھی نہیں۔“ اور نگریب منسایا۔

”اوہ آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی سیٹ پہ آرام سے بیٹھیے جا کر، میں ٹائز

دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیو کو۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے ہاتھیں پھیلاتا

ہوا اور نگریب بھی لپکا۔

”ماما ایک منٹ“ مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ”شاد یہ ماما کو پکڑا

دو۔ ٹائز کی قیمت ادا کر کے پھر لیں۔“

”ایک سیکنڈ می س آئیہ آپ نے بھجوائے ہیں؟“ وہ ٹوٹ لہراتا پھر شاد کے سر پہ

موجود تھا۔ ”میں ٹائزوں کی خرید و فروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ ہائی پروفیشن، میں

ایک ڈانکر ہوں۔ اگر آپ کو ٹائز خریدنا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیو کو چند میل آگے

سروس اسٹیشن پہ ڈراپ کر دیتا ہوں۔ لیکن..... یہ سوچئے کہ آپ کا یوں تھا اس کے انتظار

میں کھڑے ہونا مناسب ہوگا؟ یہی بہتر ہے کہ آپ یہ ٹائز لے لیں پلیز۔“

”دیکھیے، ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پہ مجبور ہیں، لیکن پھر بھی..... بغیر قیمت

ادا کیے یہ ٹائز لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔“ مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کر وہ یوں چونکا

جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

”اس طرح آپ کا یہ عمل مد نہیں احسان کہلانے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری

روایات کا حصہ نہیں۔“

اس کے مضبوط لہجہ اور پُر اعتماد انداز سے محفوظ ہو کر وہ مسکرایا۔

”اور خواتین کی مدد کرنے کا معاوضہ وصول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہر حال

آپ کے اصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجئے میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ ہو جائے میرا تار مجھے واپس لوٹا دیجئے گا۔ شکر ہے کے ساتھ۔“ وہ اس کی یہی آنکھوں کی آنکھیں محسوس کر کے مسکرایا۔

”نہیں خیر، شکر یہ تو ہمیں ابھی بھی آپ کا ادا کرنا چاہیے۔“ شاد کو آداب یاد آ گئے۔

”اوئے خانہ خراب۔“ اورنگزیب نے پھر دہائی دی۔ ”یہ تو دو تار بچ کر پڑے ہیں۔“ ”اوہ نو!“ ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شاد و ذرا آگے ہوئے گاڑیوں کو امید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک تار دینے کے لیے رک جائے۔

”بی بی۔“ اورنگزیب تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ”مجھے تو تم اپنی شکل ہی نہ دکھاؤ ماما۔“ اس کے دھاڑنے پہ وہ سہم کر مقدس کی طرف بڑھا۔

”بی بی تم ہی سن لو امارات۔“ ”ہاں بولو۔“ موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن سننے لگی کہ اب کیا مڑوہ سناتا ہے، ماما اورنگزیب خان۔ شاد بھی سن گئی لینے پاس کھڑی ہو گئی۔ ”وہ ڈاکٹر صیب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں۔ وہ آگے کوئی ہوٹل مائل ہے وہاں تک چھوڑ دیے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ کے اور (ادھر) چائے پئے گا اور ام تار لے کے واپس یہاں آئے گا، تار لگائے گا پھر تم کو اور لینے آئے گا۔“ اس نے پانچ لاکھ کی منصوبہ سے تفصیل سے دہرایا۔ ”چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔“ شاد نے سکون بھری سانس لی۔ ”لیکن ہم کیسے کسی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔“ مقدس کو اعتراض تھا۔

”بی بی کوئی چندہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ۔“ اس نے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے مقدس یہی بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موٹر وے پہ کھڑا ہونا بھی تو ناممکن سی بات ہے۔“ اس کے کہنے پہ وہ مزید بس ویش کرنے کے بجائے اپنا شولڈر بیگ

اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

”بی بی تم لوگ ہلکے (فکر) مت کرو۔ ڈاکٹر صیب شریف آدمی ہے اور بہت بخشنے (پشتو) بھی بولتا ہے۔“

وہ بہت بخشنے بولتا ہے یا نہیں یہ تو ہمارے نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صیب واقعی شریف بندہ ہے۔ بار مٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسٹیکس کی پیش کش شکر یہیے کے ساتھ واپس لوٹا دینے پہ وہ چپ نہ رہ سکا۔

”یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو محسوس پہنچا رہی ہیں محترمہ۔“ ”لیجئے خواجواہ ہی۔ میں بھلا آپ کے مہمان کیسے ہو گئے۔“ شاد و بحث پہ اتر آئی۔ ”کوئی آپ کے گھر قہور اہی بیٹھے ہیں۔“

”ضروری نہیں کہ گھر آنے والا ہی مہمان ہو۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھ کر یہاں تک آئی ہیں۔ میری نظر میں اس وقت آپ میری معزز مہمان ہیں اور آپ کی تواضع کرنا میرا فرض ہے، اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

”معاف کیجئے گا، آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکر گزار ہیں، لیکن یہ ہماری مجبوری تھی ورنہ جس خانمان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کرواتی پھرتیں۔“ اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دونوں انداز میں بولی تو وہ مطمئن ہو کر یوں مسکرایا جیسے اب تک کی بڑا مقصد بحث شخص اسے بولنے پر افسانے کی ایک کوشش ہو۔

”بجائے فرمایا آپ نے۔“ اجنبیوں سے گریزاں بھیجوں کا شیوہ ہے لیکن.....“ وہ لطف لینے لگا مقدس کی برہنی کا۔ ”اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....“

مقدس سر ابل گئی اس کے فقرے سے، اس نے پہلی بار نظر اٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت و خوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کے وہ مسکرایا۔

”آپ کے بیگ میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اجنبی نہیں کہنا چاہیے۔“ مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیگ کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیگ کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

”مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جا رہے ہیں۔“ ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملتے پر خاموشی سے کافی بیٹے لگا۔ اگرچہ اس نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح ان کے بیٹے پر ہتکمہ ازم شاد سے گوارا نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا تھکا ہوا مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس تیس طرح شخص کو دیکھا جو اس وقت گرد و پیش سے لاپرواہ نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرما رہا تھا اور جس نے تنکھاف بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں کا نام اوچے نہیں جانتا چاہتا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑاتے تھک کی طرف اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اورنگزیب سامنے سے آتا نظر آیا۔

”گاڑی آگیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں نے ام کو لفٹ دیا تھا انہوں نے ٹائر بدلنے میں بھی مدد کروا لی لیے ام جلدی واپس آگیا۔“

”شکر ہے اللہ کا۔“ دونوں جلدی اپنے بیک اور پرس سنبھالنے لگیں۔

”آج زندگی میں پہلی بار میں نے اورنگزیب ماما کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا ہے۔“ شادور اس کے کان میں گھس کر بولی تو باوجود اس قدر تناؤ کے بھی وہ مسکرا دی۔ خوشنود نے دلچسپی سے سر منی گرم شال کے بالے میں لپٹے اس صبح چہرے پہ پھونکی مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

”جئے اُس کے؟“ (جائے چو گے) اس کی آفر پہ اورنگزیب تو پچھیل کے بیٹھ جاتا چاہتا تھا، لیکن شادور کی گھوڑیوں سے گھبراہٹ کی نفی میں سر ہلاتا ہوا بیک اٹھانے لگا۔ خوشنود ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈسپوزر اسٹیل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا۔ اس نے زبردستی اورنگزیب کو چائے پکڑائی۔ شادور کے دوبارہ شکر یہ ادا کرنے پہ بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھیک یونیک نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

”کون؟ وہ پٹھانی؟“ ان کے پوچھنے پہ ہاشل وارڈن نے سوال کیا۔

”جی میڈم وہی، کیا آپ بتا سکتی ہیں اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟“

”تم تو لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟“ انہوں نے الٹا نقش شروع کر دی۔

”کتنی بار تم لڑکیوں کو تائید کی ہے کہ شادور کے ساتھ اس قسم کی عنایتیں وغیرہ مت کیا کرو۔ یہنا تم نے اسے کچھ رقم ادھار دی ہوگی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔“

”نومیدام کی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔“ شادور ان کی مسلسل جھٹ پہ زچ ہو گئی۔

”آپ ہائیز انہیں بلوادیں یا مجھے بتادیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔“

”وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔ برسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمار وغیرہ ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔“ وہ گول مول جواب دے کے ٹیلی فون پر کوئی نمبر پل کرنے لگیں۔

”کون سے ہاسپٹل میں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس جواب تک خاموشی سے کھڑی دونوں کے چہرے باری باری تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اٹھی۔ وارڈن نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ماتھ پٹیں پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”میں نے کہا تھا، مجھے علم نہیں۔ تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔۔۔۔۔ ہاں عرفان۔۔۔۔۔ کسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے۔۔۔۔۔“ وہ رخ موڑ کے مکمل طور پر فون پہ متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔ شادور نے شانے اُچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلے کا اشارہ کیا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ وارڈن کی آواز پہ وہ چونک کر مڑیں۔ ”اماں برکتے۔۔۔۔۔ یہاں آتا۔۔۔۔۔ ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شادور یہ اماں اس پٹھانی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔ بڑی جگت میں انہوں نے ریسیور کان سے لگائے ہوئے معاملہ بھگتایا۔

”کی گل ان کے کرے۔“ اماں برکتے شادور کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ دیتوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے گزر کر بیرونی دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے سامنے آ کر آنکھوں کو چنہا دیا تھا۔

”اماں وہ جو بچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟“

”کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟“ اُف پھر وہی سوال۔

”کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں“

”اوہ تاں پیارا ہے..... (وہ تو پیار ہے)

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ مقدس کو اس آن دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

”ایہہ.....“ (یہ؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھپا بنا کر اسے بغور

دیکھا۔ اس کی سخت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شاور نے

اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟“

”میں نہیں سمجھتی۔“ وہ یکایک واپس مڑنے لگی۔

”ایک منٹ اماں..... رکیں تو سہی.....“ وہ رک گئی لیکن شاور کے مقابل کھڑے

ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے پریشان اور الجھے ہوئے وجود پر ہنک

جاتی تھیں۔

”آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ سمجھتی ہوں، کہ وہ کہاں

ہیں، کس حال میں ہیں؟“ شاور کے جرح کے انداز پہ اماں برکتے کھڑکیاں۔

”اپنا کام کر کر ڈیے۔ تمہارا مطلب پٹھانی سے وہ کد رہے کد نہیں، تجھے کیا؟“

”اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آ رہی ہوں۔ ہم ہاسپٹل

میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں

ناں۔“ وہ چالو سی پائز آئی۔

”بس ان کی بیماری کا شاور پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ

شاید انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتا دیں

کہ وہ کس ہاسپٹل میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے

میں کچھ مذہبی کر دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔“ اس کے چہرے پہ پہلی کمال محسوسیت

اور لہجے کی انتہا رہے کی مٹھاس شاید اماں برکتے کو موم روٹی، لیکن سامنے کھڑی مقدس کا

مشکوک چہرہ اور مضطرب انداز میں چٹختی انگلیاں باور کر رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

”صیغوں کی جگہ نہیں پتا، اوہ کیسے نوں دسدی وی نہیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال

اے اوہ بن واپس آن نہیں ہے گی۔ ہووے اپنے پنڈ چلی گی ہوئے۔“ (مجھے واقعی نہیں

پتا، وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات۔ لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے

والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیر تیر قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

”کیا کد رہی تھیں؟“ اسے ایک لفظ نہ ملے پڑا۔

”شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔“

”نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش

کر رہی ہیں۔“ لگ تو شانو کو بھی رہا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اگر پتا ہوتا تو بھلا وہ ہم سے کیوں چھپاتیں۔“ وہ ہر صورت اس کا دھیان بنانا

چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار اماں برکتے کی تھوچتی نظروں پہاٹتی ہوئی تھی۔

”پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے

تاثرات بدل سے گئے تھے، شانو تم کہہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں

بے حد مشابہت ہے تو کیا اس لیے؟“

”ہو سکتا ہے..... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں، خصوصاً وہ جو

تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو

اس چہرے کے میں نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت

رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں برکتے، اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے راتنی چلی

آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں پہچننا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا

دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا

ایک تہائی حصہ خاصا جلا ہوا ہے۔“

”اور..... اور..... یہ چہرہ کس نے جلایا ہوگا؟“ اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی

تھی۔

”پلیز مقدس..... ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی

ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے آئے ہیں۔ اچھے ہوئے دھاگے کا ایک سر اڑھوٹنے نے

لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مٹھ بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری ماما

ہیں۔“ اسے تابعداری سے سر ہلاتے دیکھ کے اسے ذرا تسلی ہوئی۔
 ”اور ہاں اکیلے مت جانا ہاسٹل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو آکھٹے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزٹیشن کے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔“

اسے آڈیو ریم کی سنسن میز ہوں کہ ہم بٹھنے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک پیوں کے کرانے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔
 ”السلام علیکم“ اس نے گرد آلود میز ہوں پر انگلی سے لائنیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آگئی۔

”آپ.....؟..... یہاں؟“

”جی..... میں ڈاکٹر خوشنود..... اور یہاں۔“ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رنق پائے کہ وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا غافل پڑ گیا۔ ”بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے بخوبی گئی۔“

”جی نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ اب اسے کیا بتاتی کہ ذہن اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔ ”دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔“

”میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں۔“ اس کے سوال کا جواب چھپے سے آتی شانور نے دیا۔

”جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم فنکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔“

”السلام علیکم“
 ”شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔“ مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا“ اس نے لائٹ براؤن کڑھائی والی آف وہائٹ چادر میں سلیپے سے لپٹی اس مختصر اوجو لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور پُر وقار طریقے سے اوڑھے چادر کے باوجود بھی کم عمری میں ایگری نظر آتی تھی۔

”تقریباً“ اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شانور نے ہی دیا۔

”نیزیر تیسرا ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے، سنگ اینڈورڈ کالج میں۔“ اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا، ”اور میں شانور گل، مقدس کی فرسٹ کزن اور اکلونی فرینڈ، یہاں مئی ایجنیز ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔“

”بے حد خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی نبھادی۔

”آپ لاہور میں کب تک ہیں؟“
 ”کچھ عرصہ اندازہ نہیں کب تک رکنا پڑے، لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انوٹیشن ہے آرٹ گیلری میں، ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایگزٹیشن ہے پرسوں۔ ضرور آئیے گا۔“
 ”جی ضرور“ اس نے فوراً ہاں بھری۔ بعد میں سارے راستے ہی مقدس اس سے بحث کرتی رہی۔

”کیا ضرورت تھی اتنے تفصیلی بیان کی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ سنگ اینڈورڈ کالج۔ مئی ایجنیز ڈیپارٹمنٹ اور تو اور فضول میں انوائٹ بھی کیا۔ یہ نہیں کب عقل آئے گی ہر کسی سے ملاؤ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے کیا سمجھ رہا ہو گا ہمیں۔“

”اوہ تم کیوں اس قدر پٹنی ہو جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا اگر میں نے اخلاقا اسے انوائٹ کر لیا آخر پرسوں کی ایگزٹیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کاری تو نہیں ہوں گے۔ انجینئروں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر..... دو ملاقاتوں کے بعد کوئی

اجنبی نہیں رہتا۔“ شادروا اس کی انتہا رہے کی احتیاط پسندی سے چڑھتی۔

”اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو نہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پولاٹ، کچھڑا اور ویل میئر شخص کم از کم میں تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خاتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں جو چھپا۔ یہ نہیں جانتا جاہاں سے ظاہر ہوتا کہ وہ.....“

”پلیز شافو، پلیز اسٹاپ اٹ۔“ اس نے تنک آ کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نہ جانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سننا چاہتی تھی، لیکن بھلائی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزٹیشن والے روز شادروا سے کچھ ٹھیک کر کے اپنے ساتھ لے ہی گئی۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کیا تھا۔

”یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر دگی۔ اب چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے آئی ہیں، محض تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زارا اور احمد نے ایگزٹیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا ورنہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔“

”کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ آ کے۔ جس مقصد کے تحت میں یہاں آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار ہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پچھ چلیں گے پتا کرنے۔“ اس نے کسی طرح بہلا پھلا کے اسے جانے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذاتی کیفیت سے دو چار ہے۔ ادھوری معلومات اسے نکلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی تو یوں امید و بیم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شادروا بھی بے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آریا پارکوی توصل نکلے۔ وہ مقدس کی ماما ہیں یا نہیں، یہ معہر تو کھلے۔

”السلام علیکم“ اس بار شادروا نے خوشنود کو دیکھ کر پکے کے سلام کرنے میں پہل کی۔
 ”علیکم السلام۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شادروا کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“ اب اتنی بداخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی۔ لیکن مزید

گفتگو سے بچنے کی خطر دانستہ زرخ موڑ کے پیٹنگنز دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شادروا جھکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ چپٹن کی جیبوں میں ہاتھ پھنسانے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پر وقار وجود افرادیت کے احساس سے دو چار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہرقت ڈھانپنے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اونچا کر کے پیٹنگنز دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سہرے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف بانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے رنگ اس کی شخصیت میں کتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب و دُراغزرقری جلد پہ یاقوت کی مانند رک رہے تھے۔

”اور آنکھوں میں ترشے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔“ خوشنود نے سوچا۔

”پھر کیا ہے..... کون سا تاثر ہے جو اس اہمول تکینے کو محروم ظاہر کر رہا ہے..... اداسی کی اس کہہ کا سبب کیا ہے جو اس نکھر ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے..... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد و پیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔“ وہ اس کی کھوئی کھوئی کسی کیفیت کا راز کھونے میں خود بھی کہیں کھوسا گیا۔

کچھ دیر کی خاموشی محسوس کر کے مقدس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ شادروا غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود ہنوز اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم زکے پہ بھی جھٹک کر کھڑک گیا۔ ان آنکھوں میں سراپا کی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔
 ”آپ کی کزن غالباً آپ کے کلاس فیلوز کے ہمراہ ہیں۔“

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آیا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب اجنبی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کی بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی، جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اٹھا۔

”آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈپینڈ کیوں کرتی ہیں؟“
 ”ڈپینڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں، اس لیے اس کا میرے پاس

رنگت پہیلی کی نسبت سنو لا چکی تھی۔

”شاید شکار کا شوق مردن پہ ہے۔“

زریاب نے اس کے کھر دورے ہاتھوں اور سانولے ہوتے چہرے کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔ دراب ایک بار پھر کرسی پہ بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ پچھلے دس منٹوں میں وہ چار بار اٹھ اور بیٹھ چکا تھا۔

”تو خان دراب خنک اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی ایک چیز ہے جواب تک دیسی کی دیسی ہے۔ تمہاری طبیعت کا بے صبر اپن اور بے چینی۔“

”کیا سوچ رہے ہو لالہ؟“ اس نے سوال کیا تو زریاب دونوں کے چہرے باری باری دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

”آپ دونوں بھی تو کہتے بدل گئے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لگ رہے ہیں۔“

”صرف بڑے.....“ افراسیاب نے اسے احساس دلایا۔

”کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے زریاب بڑھے دیکھنے لگے ہو۔“ زریاب نے بھائی کے ہاتھوں کی مضبوط اور محفوظ گرفت سے اپنا استخوانی ہاتھ آہستگی سے نکالا۔ لمبی لمبی انگلیوں پہ زرد کھال منڈھی تھی اور فراخ و پتیلی مشقت کے تمام ثبوت سجائے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے یہ سچ محسوس کرنا چاہا وہاں پھر یاں ہی پھر یاں تھیں۔

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ تو حیرت کیسی

زندگی نے مجھے تم سے زیادہ ہے پتا

☆☆☆

خوشبو ہے، دھنک ہے چاندنی ہے

وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے

بیٹکے ہوئے پھول حرف اس کے

وہ دم جھم کی زبان میں بولتی ہے

باتوں میں تھکن ہے شام جیسی

لہجے میں سحر کی تازگی ہے

جہرے پہ جانا کا روپ جیسے

دریا میں شفق گھل گئی ہے

برسا ہے خمار چاندنی کا یا

اس کی جبین دھک اٹھی ہے

کیا جانے وہ کیسے مسکرائی

چہرے سے کرن چمن پڑی ہے

چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی

سورج سے خراج مانگتی ہے

مل بھر کر سرک گیا جو آنکھ

کلیوں کی طرح سٹ گئی ہے

اے مشتریان حسن عالم!

وہ دونوں جہاں سے قیمتی ہے

خوشنود نے ”طلوع الحک“ بند کی اور بیٹنے پہ دھر کے یونہی نیم دراز سو پنے لگا، خوشبو ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے۔.....

خوشبو، دھنک اور چاندنی کا احتجاج بھی بھلا کہیں ہوا ہے..... ہزار بار یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی اس غزل کو پڑھ کر اور ہر باری وہ سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ لیکن اب کون سی بات ہے جسے وہ جھٹلا سکا ہے۔ کیا اس کے مسکرانے کے سر نہیں چمن پڑی تھیں؟

کہ اس کے لہجے میں سحر کی تازگی نہیں ہے؟ کیا اس کی جبین چاندنی میں نہائی ہوئی نہیں لگتی؟

اور کیا وہ..... دونوں جہاں سے قیمتی نہیں لگتی؟

اور یہ آخری سوال وہ خود سے کر کے چونک گیا تھا۔

”کچھ تو اس میں سے خوشنود جس نے تمہیں اتنا بے خود کر دیا ہے ورنہ جن حالات میں تم یہاں آئے ہو ان کی سنگینی کیا اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ تم سب کچھ فراموش کیے آرٹ گیلری میں ایک مشکل سی الجھی ہوئی لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے رہے؟“

اس کے دل نے اسے مزید کر دیا تو وہ چپکے سے اقرار کر گیا۔

”ہاں..... کچھ نہیں بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے اس کی جانب کھینچتا ہے۔ جو مجھے وقتی طور پر ہی مگر بھلا دیتا ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ کاش کہ وہ بھی یہ جان لے کہ

وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔“ اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حدود درجے بہ نیازی اور لاطین سارویہ خوشنودی ہستیں پست کر دیتا تھا۔

پردہ ہی نہیں اسے کسی کی اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے وہ غنچہ دہن سکوت زادی کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

”تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو۔“ شادو اسے اپنے انتظار میں ٹھٹکا دیکھ کے جل ہی تو گئی۔

”پھر کیا کروں میں؟“ وہ نے کسی سے بولی۔
”تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کوئی خبر نہیں ملی۔ آخر تک میں“

”وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجھلاتی ہے میرے سوال پر۔ اس سے مجھے تمہارا شب کچھ کچھ یقین میں بدلتا نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے ہو مجھے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبح بھی مجھے دیکھتے ہی رخ بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسل سے باہر چلی گئی ہے۔“

”اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تھا تاں اس کا کیا پتہ وہ انہی سے لگنے لگی ہو۔“
”پیچھا کرنا چاہیے تھا، بالکل ہوتی ہو کیا، اب میں مائیوں کا پیچھا کرتی پھر دو۔“ وہ

گجڑ کے بولی۔
”تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو..... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اگلا کر رہوں گی۔ بس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ..... میری ماماں ہیں یا نہیں۔“
”اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟“ شادو نے اس کا دھیان

بٹانا چاہا۔

”میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شانور نہ جس وقتی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا کھس وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہیں میرا یہاں آنا ایک کارزیاں نہ ثابت ہو۔“

”آف خدایا، کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم۔ غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تمہارا لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔“ وہ تھد تھد کے لیے لڑی۔

”تو مائی ڈیزیز کنزین یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً.....“ وہ رک کے سوچنے لگی کہ کہے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شادو اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنی اڑتی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

”مثلاً ڈاکٹر خوشنوو۔ نہ تم لاہور آئے کا اتنا اچانک فیصلہ کرتیں، نہ ہم بائی روڈ سفر کی مصیبت مول لینے اور نہ ہی وہ..... مانوس انجینی کمراتا۔“
”واٹ ریش؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟“ حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت غصے کی حدت پا کے اناری ہو گئی۔

”سب پتا ہے۔“ وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔

”اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔“
”تو تم بھی سمجھتی ہو کہ میں تم پر ڈپنڈ کر رہی ہوں۔“ اس کے اس قدر درست اندازہ

لگانے پر مقدس تھلا گئی۔

”میں بھی.....؟“ شادو ”بھی“ پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

”تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو میری ہو تمہیں ضرور سچ میں اپنی بے ہودہ

”کدوں؟ میں کدوں گئی کتھے؟“ (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں
شائیں کرنے لگیں۔

”آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے
میں۔“ وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شاد بھی قریب چلی آئی۔
”اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ۔؟“
اس نے بھی اماں پر رکتے کو گھیر لیا تو وہ ہتھے سے ہی اکڑ گئی۔ اچانک مقدس کے حلقے نے
اسے چونکا ضرور دیا تھا، لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آ گئی۔

”پراس ہٹو کر پو، قانے دارنیوں، کتھوں آسکیاں میں میرے نال پچھ پریت کرن
والیاں، سمیزای تمیں دی کے نہیں، ماما لگدا ایے او بندہ تہا ڈاتے نانی لگتی آں میں سمیزوی
تہا توں تلی کر اوں۔“ (مرے ہٹو کر یوں، قانے دارنیوں، کہاں سے آ گئی ہیں، مجھ سے
پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کسی نے تیر نہیں سکھائی تھیں۔ وہ تمہارا ماما لگتا ہے یا میں تمہاری
نانی لگتی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ یہی طرح چھڑکتی آگے چلی پڑی۔
”لوکر والی عزت افزائی۔“ شاد نے اسے جتنا یا۔

”ویسے بیلہ، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟
تمہارے پاس تو کاروبھی تھا ناں ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم
انہی سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سراہا تھ لگ جائے۔ نہی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے
گی۔ ہو سکتا ہے وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر اسے لفٹ دے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی
عزیزہ کا مفت علاج معالجہ کر رہے ہوں۔“ شاد کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے
کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ایک حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و
منفی پہلو دونوں ہی سامنے رکھ دیتی تھی۔
”ڈاکٹر خوشنود بلی وردگ۔“

کارڈ پر لکھے نام پر سرسری نگاہ ڈال کے وہ نیچے فون نمبر کی جانب متوجہ ہونا
چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے ٹھنڈ کر دیا۔ خوشنود کا ”وردگ
“ ہونا پھر اسرار خاتون کا مومنہ ہونا ثابت کر رہا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر خوشنود اسپیکنگ۔“

”ہیلو۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

ریسرچ پیش کرتی ہوتی ہے۔“
”تم چاہے اسے بے ہودہ ہو یا فضول۔ لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو
فیصد درست لگتا ہے۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے ٹکراتا ہے مقصد نہیں ہے۔“

”مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔“ اس نے باور کرایا۔
”میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے
ساتھ، میں بھی ہوتی ہوں۔ بلکہ وہ تو مجھیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔“
”تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھرا اور جسکے لے کے سوچو
جو بھی سوچنا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں
ہوگا۔ سمجھیں۔“ وہ بیک کا نہرے پہ لٹکا کے کھڑی ہو گئی۔

”ارے..... ارے رکو تو۔“ اور وہ رک گئی۔ شاد کی آواز پہ نہیں پار لگے۔ میں
کھڑی سلور گرے کرولا سے اترتی اماں پر رکتے کو دیکھ کے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ اور کوئی
نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اس کا درواز
قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شاید دلا رہے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا
بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہو گئی۔ اماں کا رے نکلنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے
کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔
ڈاکٹر گرے ٹوپیں سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ہی بن گلاسز میں وہ واقعی خوشنود
تھا۔ اس نے جھک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاہجہان بیگز میں زنانہ سوٹ
تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے۔ باسکٹ میں تھرا اس اور چند برتن، ایک ٹشو پیپر
کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اچانک رکی، جیسے کچھ یاد
آ گیا ہو، پھر اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں پوچھ گئی۔

”میں سمجھا پڑا، اے اسے اسے کج کھانا پینا تے محس، کہ میں سویرے بخنی تے دلیہ بنالیا
واں؟“ (میں نے کہا بیٹا، ابھی اس نے کچھ کھانا پینا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح بخنی اور دلیہ
بنالیاؤں) (نہانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ
کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صبح طرح سن نہیں پائی۔

”کون سے ہا پٹیل سے آ رہی ہیں آپ اماں؟“

مقدس نے اچانک سامنے آ کر اماں برکتے کو گڑ بڑا کر رکھ دیا۔

”آپ.....“ اسے گمان سا گزرا لیکن اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ پورے وثوق سے اس کا نام لے سکتا۔

”السلام علیکم“ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنا تعارف کیسے کرانے۔

”علیکم السلام، مقدس؟“ اس نے آس و امید سے چور چور لہجے میں پوچھا۔

”جی.....“ اسے اپنے ہونے پر شرمندگی تھی یا پھر شاید فون پر ہونے کی۔

”زے نصیب، کیسے کیسے یاد کیا؟“

”مجھے آپ سے ایک کام تھا۔“ وہ براہ راست اپنے مدعا پر آ گئی۔

”میری خوش نصیبی کس اب آپ کو بھی مجھ سے کام پڑنے لگے۔“ اس کا چکنا مقدس کو

ایک آنکھ نہیں بھارا تھا، اس نے چڑ کے موہاں آف کر دیا۔ خوشنود کے مسلسل سکرانے

لب یکدم سکر گئے۔

”تف ہے تم پر ڈاکٹر درگ، ایک لڑکی کا فون کیا آ گیا، باجیس چیر چیر کے

ڈائیا لگ بھانڈنے لگے، یہ احساس کیے بغیر کہ مخاطب ایک مقدس ہستی ہے۔“ اس نے

اپنے اندر گنگنا تے جذبے کو ڈھاندا پھر سے اپنی سوریہ سنجیدہ جون میں آتے ہوئے سی ایل

آئی پی بھر چیک کیا۔

”پیلو“ زندگی سے بھر پور واز شادور کی تھی۔

”مس شادور میں ڈاکٹر خوشنود بول رہا ہوں۔ ابھی چند منٹ قبل اس نمبر سے مس

مقدس نے مجھے کال کی تھی۔“

”جی جی..... وہ بس..... اچھا آپ بات سمجھتے۔“ اس نے زبردستی مقدس کے کان

سے موہاں لگایا۔ شادور کی بے موقع ہنسنے کا اسے زہر لگ رہی تھیں۔

”جی مس مقدس، کہیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ دوسری طرف سے

آتی سنجیدہ آواز نے اسے دوبارہ بولنے پر آمادہ کیا۔

”میں صرف یہ جانتا چاہتی تھی ڈاکٹر خوشنود کہ اماں برکتے..... شادور کے ہاسٹل کی

ملازمہ کے ساتھ آپ کون سے ہاسٹل گئے تھے؟“ بغیر کسی تہدید کے اس نے سوال کر دیا۔

”جی.....؟“ حیران تو وہ پہلے ہی تھا کہ ریزروسی رہنے والی اپنی مخاطب حراج کی لڑکی کو

اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں موجود استعجاب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مقدس

کا یہ اچانک سوال اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ اس کو سننے میں چند سیکنڈ لگے لیکن وہ

دوسرے سوال سے خود کو روک نہ پائی۔

”اگر میرا سوال بہت زیادہ ڈالتی نہ ہو تو کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ اماں برکتے

ساتھ رہنے والی خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس کے پچھتے ہوئے لہجے پہ وہ مزید

ٹھٹھکیا۔

”یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن چونکہ آپ نے پہلے پوچھا ہے تو میں بتا دوں

کہ میں شیخ زائدہ ہسپتال میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمود غوری سے ملنے گیا تھا، وہاں ایک

مریضہ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میرے علاقے کی ہیں اور ہم لوگ اپنے علاقے کی

رعایا کا خیال رکھتے ہیں، ہمارے بزرگوں کی روایات ہیں۔ محض انسانی ہمدردی اور کچھ

اپنی ذات قبیلے کی ہونے کی وجہ سے، میں نے ڈاکٹر محمود سے ان کے علاج معالجے کی

خصوصی درخواست کی اور ان اماں جی کو بھی صرف اخلاقی ہاسٹل تک لفٹ دے دی تھی۔

اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اسل امتزاحی کس بات پر ہے، ان اماں جی کو لفٹ دینے پہ یا

ان اماں جی پہ توجہ دینے پہ۔“

وہ شاید اس توجہ کو مان ہی لیتی اگر خوشنود کا درگ ہوتا اس پہ کل نہ گیا ہوتا۔ اس

لیے قصداً اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شیخ زائدہ ہاسٹل میں کس وارڈ میں مل سکیں گی.....

پلیز.....“ اس کے بے تاب لہجے میں محنتی اچھا ڈاکٹر خوشنود کے کھلے ہوئے دل کو پھر سے

چونکا گئی۔ اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

”ایسا سمجھتے ہیں مجھے وقت بتا دیں میں آپ کو لے چتا ہوں ان کے پاس۔“

”نہیں..... میں صبح دس بجے ہاسٹل پہنچ جاؤں گی۔ آپ بس مجھے ان سے ملوادیتے

گا۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنکٹ کی، دوسری جانب ریسپور

ہاتھ میں لیے ڈاکٹر خوشنود کے چہرے پہ تعجب اور الجھن کے اثرات نمایاں تھے۔

☆☆☆

”زریاب.....!“

آج فجر سے سے علی بی بی جان کے دل کو جیسے پیٹنے لگے ہوئے تھے۔ کبھی ادھر کبھی

اُدھر۔ ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے وہ آج اوپر اپنے

کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تھیں، ورنہ ہمیشہ ہی وہ مغرب کے بعد اپنے کمرے کا رخ

کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاؤنج میں بچاؤ جہازی ساز تحت ہوتا جہاں سے وہ با آسانی دن میں کئی کئی بار اٹھ کے پاچا جان کے کمرے تک ہوا کرتے۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خانہ جی کے کمرے میں بس بیچ ایک ہی بار جھانکا تھا۔ بستر پہ بے حس و حرکت پڑے لائے مگر خفیف سے وجود کی گدلی آنکھیں جھٹ پہ لگے چمکے پہنچی تھیں۔

”خانہ جی!“ انہوں نے آواز دی۔

”زریاب!“ کھلی تھکی سانسوں پہ ڈولتا یہ تاہم ان بوڑھے لوں سے آزاد ہو اور خضر بے بس آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار..... پہلی بار وہ خانہ جی کے کمرے کو کوئی دلا سوئے بغیر، کوئی خوش آمد نہ فرمائے بغیر واپس لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کی تسلی بھر سے ہاتھ کی ضرورت تھی، چلتے تڑپے پہلو پر اپنے بچے پہ سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور مٹا دیا۔ مومن آفریاب کے آنے پاس طرح بھٹک رہا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ گاڑا زور دے گا کہ ایک ریلوے بھی تو ہوتا تھا انہوں نے لینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کے بیٹھ گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پہ ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ دگمہ حواس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر آئی۔ بی بی جان نے اس کی جسات کو تالپہ بندہ لگا ہوں سے دیکھا۔

”ولے ہے؟“ (کیا ہے لڑکی؟)

”زریاب لالہ رانگلے۔“ (زریاب صاحب آ گئے۔)

”ولے؟“ (کیا؟) ”اٹھ کھڑی ہوئیں۔“ (سوئچ زریاب؟) (کون زریاب؟)

”خانہ جی۔“ (اے بی بی)

انہیں کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کمرے سے نکلیں کب سیرھیاں اتریں اور کب وہ اس کے رو برو تھیں۔

”زریاب.....!“

انہوں نے سامنے کھڑے شکوہ و جود والے ہارے ہوئے انسان میں وہ شہزادوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکورے لیتا وہ معصومیت بھرنا جس سے تلاشنا جاوہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی چریاں تھیں۔ وہ تہذیب سے کھڑی رہ گئیں دل کی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خانہ جی تھا کہ وہ آٹھ بھر کے دیکھتے بھی

گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کمرچ کرچی و جود خود ہی سیٹ کے بی بی جان کے گنگے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا مٹا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے اُبل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رویا تھا، کب سے نہیں بٹھا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حشر بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھما اور کپکپاتے لہجے میں کہا۔

”میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خانہ جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب مجھ سے ٹالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پہ کرم کر دیا اب میں خانہ جی کے پاس جاؤں گی، ان کا زریاب لے کر۔“

☆☆☆

طویل کوریڈر سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ خود سے دو قدم کے فاصلے پہ موجود مقدس کا سنا سنا و جود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوال بکلا رہے تھے، لیکن ان بہم سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے لٹکانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے سگاپور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تہہ کی۔

لاہور پہنچنے سے قبل ہی اس اتفاق ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پہ اکسایا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے مسلکام ہوتے دیکھنے کا خواب.....

اس کے ہمراہ قدم پہ قدم چلنے کا خواب.....

اور..... اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اقتضا قدم اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوئی

ہے۔ آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس

ہستی سے مل پائے گی۔۔۔۔۔ اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔

اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اٹھتے بیٹھتے، جاتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی،

اس کے بیکر کو قصور میں تراش رہی تھی اور آج۔۔۔۔۔ آج محض چند قدم کے فاصلے پہ۔۔۔۔۔

چند ساعثوں کے بعد وہ اس کے زور و ہوگی۔ خوشنود کے تھمتے قدموں نے اسے بھی زک

جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی کسی

یونکی گلاس وال کے آگے کھڑی ہو گئی۔

ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین اور نمبر تین بیٹہ پہ اس کی متلاشی نظریں جم گئیں۔ آکسیجن

ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رخ سے نظر آ رہا تھا لیکن مقدس کو اس چہرے سے

آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کا ہی تھا۔ وہ دھشتے سے چبکتی ہوئی چند قدم آگے

سر کی لیکن وہاں سے یہ ادھورا عکس بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ گایا وہ پلٹ کے پھر سے اپنی جگہ پہ آئی۔

خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے باکیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا کے

ڈیوٹی پہ موجود سز سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس

کے پیچھے چلتی بیٹہ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گھماؤ گھماؤ دار لبوں والے چہرے پہ عمر نے اتنے اثرات

نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیماریوں نے، یہ اس چہرے کی جھریوں سے پاک شفاف جلد

سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں

پیروں کا لاغر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا حمل نہیں تھا اور ایک طرف کا

زخماں۔۔۔۔۔ جلے ہوئے نشانات لیے بنجانے کن کھانڈوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے

ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے کرزتے پیروں کے نیچے کیا

اب بھی شہد کی جھیلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

”ممہا!“

اور۔۔۔۔۔ خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔

اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلہ رنگ دیکھ سکی، نہ جھجک

کے وہ قدم پیچھے ہٹا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حسیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف

متوجہ تھیں اپنے پیچھے لیے لیے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا
دھیان ہی نہ کیا۔

☆☆☆

”سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف۔۔۔۔۔ بنجانے مجھے سمجھنے میں وقت کیوں لگا۔ اتنا

وقت۔۔۔۔۔ اتنے وقت میں تو اب۔۔۔۔۔ اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔“ بی بی سی میں بک

اپنے کمرے میں آ کر خوشنود نے سرے سے اس سارے قصے کو بھٹکا چاہا۔

”تو وہ ان کی بیٹی ہے، یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان زریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

اور ضروری تو یہ بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا چھوڑ کے تمہارا دل ایک اسی لڑکی پہ آتا

ڈاکٹر خوشنود علی وردگ۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔

نقد پر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے چھپے گیاں

پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں غیا مومن لانا تو قسمت کی

برائی عادت ہے۔“ وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی

کوشش کرنے لگا کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا۔۔۔۔۔ خون کا

نرنگ بلا سا کسکا ہے نہ تاثر۔

مقدس کی رنگوں میں دوڑنے والا خون اس شخص کا تھا جس کے ہاتھوں میں فیروز علی

وردگ کا خون لکھا تھا۔ اور فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں تھا جس

مار رہا تھا۔

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لائی بی بی نے اسے اپنی

آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سید و شریف کی فضاؤں میں موجود

فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوحے کہیں کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ

چلا دیں جس پہ چلنا پختون اپنی شان تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت

مند پختون کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں،

کسی کی گود کا بچھل بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

لائی بی بی خود بھی ایک کچی بچھون زاوی تھی، آن، بان اور قار پے سب کچھ سمجھا کر دینے والی لیکن منہ کا جذبہ کب اس کے سارے جذبات پے حاوی ہو گیا اسے پتہ نہ چلا وہ شوہر کے بعد اب جینے کو کھوئے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی، پھر فیروز کے ساتھ سات سال رفاقت نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ خود فیروز اپنے فیعل کے دیگر مردوں سے کس قدر مختلف المزاج ہے۔ اپنے بھائیوں کی بانست وہ اپنے کس بنے کے پہلے بار فائر کرنے پے چشمنہ منانے کے بجائے اس کی تعلیم پر زیادہ توجہ دیتا۔ اس نے جینے کو اعلیٰ تعلیم دلا کہ کچھ بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ اس حقیقت سے سب ہی واقف تھی۔ لائی بی بی نے سسر اور باپ کے آگے گڑگڑا کے فیروز کے خوابوں کو پورا کرنے کی بجیک مانگی، انہیں احساس دلایا کہ فیروز جیسے بھتیوں سے گندہ حساس شخص کی روح کی تسکین اس کے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہے، نہ کہ خون کی ندیاں بہا کے جذبہ انتقام کو پورا کرنے میں، لڑکیوں میں ہی بیرون ملک حصول تعلیم کے لیے چلے جانے والے خود شوقی تمام تر حقیقتوں سے آگاہ تھا۔ اس کا باب عین عالم شباب میں محض ایک عہد کی پاسداری میں اپنے سب سے قریبی دوست کے ہاتھوں، غدار اور بے وفائی کا محرمہ الزام لے کر مارا گیا۔ لیکن وہ عہد کیا تھا اور وہ الزام کیا تھا۔ اس سے وہ اب تک انجان ہی رہا۔ اس کی ماں اس سے ہر بات سے انجان ہی رکھنا چاہتی تھی، وہ تو شاید یہ سب بھی اس تک نہ پہنچنے دیتی لیکن داد اور پچاؤں کی جانب سے اسے ہمیشہ اکسادیئے والی معلومات ملتی رہتیں وہ خود بھی ایک سب دل میں بدلنے کی پندگاری سلگائے بیٹھے تھے اور فیروز کے اکلوتے بیٹے کی جانب سے بھی ایسی ہی خاندانی شان و جلال کی توقع رکھتے تھے۔ لیکن لائی بی بی کا فیصلہ بروقت تھا اور اقدام بالکل درست۔ آ زافضاً کی وسیع انٹری نے اس کے اندر جذبہ زیادہ پیپنے نہ دیا۔ وہ سبیاں کا وصف لے کر وطن لوٹا تھا۔

تخمین پیش کرنے کا اسے اسے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا۔ اسے تو باپ کے قاتل سے کوئی سرور تھا نہ ہی بدلہ لینے کی تپ تھیں اور یہ تو اس دن بچا تھا کہ مظاہر انجان بنے رہنے کے باوجود اس کے اندر کہیں بہت اندر نفرت کی جڑیں موجود ہیں۔ وہ کچھ مشینری کے سلسلے میں سٹگا پور روانہ ہوئے والا تھا کہ سید و شریف سے جان محمد اپنی خان بی بی کا راز دارانہ پیغام لے کر پہنچا۔

میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی بس تمہیں اس عزت کا واسطہ ہو فیروز لالہ نے مجھے دیکھی تھی اور اس محبت کا واسطہ جو اس کے حوالے سے میں نے تمہیں دیا تھا، مجھے بے بارود مددگار مرنے مت چھوڑنا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہاڑوں کے بیچ یہی سہی سہری بھی ایک قبر ہو، اپنے باپ کی طرح۔ جہاں چند لوگوں کو یہی سہی سہری گھر کسی کو خبر ہو کہ اس مٹی کے نیچے میں سو رہی ہوں میں۔۔۔۔۔

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے ہاتھ مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ دلاتا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت تو پھر اس کی بیوی کا ذکر اسنے اچھے الفاظ میں کیوں؟

اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے وہ اُلجھ گیا۔ اسے لائی بی بی کی یہ بے مقصدی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب گور پڑی اس عورت کے ٹخنوں کا بندوبست ہی کرنا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابلِ اعتماد لڑکے کے ہاتھوں یہ فیضانِ ادا ہو سکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس نے فون پہ بلکا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسٹر کر دیا گیا۔

”اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشنود اور بھائی کے بعد اس کی اولاد سے زیادہ اور کن اپنا ہو سکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور پہنچو، ہو سکتا ہے اسے تمہاری ہی ضرورت ہو اور اس کی سانسیں کچھ دن اور رہ جائیں۔“

بڑی ہی بے دلی سے وہ اپنا سارا پروگرام اپ سیٹ کر کے لاہور جانے کے لیے نکلا۔ وہاں دیے گئے ایڈریس پہ پہنچ کر ایک اچھی زبان والی کرخت مزاج عمر رسیدہ خاتون سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سروسز ہسپتال لے آئی جہاں کوئی دور میں زمین پہ پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ”مفت علاج“ کس طرح ہوتا ہے، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کسمپرسی اور لاواری بھی ہو تو مریش کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پہ مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریش ہے جیسے مریشوں کے لیے اس نے فیروز ہسپتال بنانے کا خواب دیکھا

ہے، شیخ زائد ہسپتال میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ وہ بچی کبھی سانس لینے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا رہا تھا۔ اس نے ایک پہنچنے کی طرح اس مریش کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جلد کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی ہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک آمر دشوار تھا، لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی، یا اس کے جسے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے خدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سنگ پور جانا، ہسپتال کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی سہی کسر اتفاقاً ملنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں بیٹنے والے نئے نوپے سہانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی جلیوں میں ڈولے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پایا تھا کہ یہ ایک بھگنا.....

اس کی ذہنی روپرور سے چند منٹ پہلے ہسپتال میں پیش آنے والے واقعے کی طرف چلی گئی۔

”مہما.....!“ یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی اپنی اپنی لگتی تھی۔

جب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا ہل لگتا تھا۔ اور اب جب وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے تو اسے سوچنا بھی ایک ناگوار امر محسوس ہو رہا ہے۔

یہ تو تھک کے کہ بدلے اور انتقام کی تپش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی سیمانی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و خفارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی..... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پاسکے گا کہ وہ اپنی باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔“ اس نے زور زور سے ٹکی میں سر ہلایا۔

”میں کچھ بھی کرلوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے خود سے ہار مان

کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔

نرن..... نرن خون کی بہل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پر جوش آواز سنی ”خوشنود علی، مجزہ ہو گیا..... میں اسے مجزہ ہی کہوں گا۔ تمہاری پچھت سو منہ خاتون آج آئی۔ سی یو سے پرائیویٹ دم شفت کر دی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کوئے میں نہیں سگیں اور نہ ہی ان کی ذاتی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی اس سے مل سکتے ہو۔“

نذہال سا بڑا خوشنود سرے سے پڑ عزم ہو گیا۔ وہ یہاں ایک مرقی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ اس موقع کو گونا گونا گونا چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گھنٹوں میں سر دیئے زارہ قطار روئے جاری تھی اور شنار سے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دینے والی ہو رہی تھی۔

”مقدس، اپنی جان لے لو گی تم تین روزہ کے۔ آخر بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا؟ کہاں گئی تھیں تم؟“

”میں ہاسپٹل گئی تھی شانوارہ..... اور وہ میری ممانی ہیں۔“ اس نے بدقت چند الفاظ کہے اور پھر سے بچپیاں بندھ گئیں۔

”وہی میری ممانی ہیں..... میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتیں ورنہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں..... پہچانتے تو انہیں ہیں جنہیں یاد رکھا جائے، وہ بھلا کہاں یاد رکھ پائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر..... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ..... میرا مطلب ہے آئی کو؟“ اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابلہ شنار دل گئی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھوج لاتی۔ مسلسل سوال

کر کر کے اس نے یہ اگلو ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز درگ کا بیٹا ہے، اس فیروز درگ کا جس کے بے لوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز درگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی دہشت سے بی بی جان اور تایا جان اپنے لاڈ لے زیریاب خشک کی خیر مانگتے ہیں۔

”واٹ، ہاؤ سر براؤنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں بچ در بچ اتفاقات کی کڑی ملتے جانا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے، وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بے وقوف یوں منہ اٹھاتے واپس چلی آئیں کہاں تو ماں کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب جھوڑ چھاڑ یہاں اندھیرے میں آسو یہاں نہیں مگن ہو۔“

”تو کیا کرتی، میں جانتی ہوں اس اسرار کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش ماما مجھے کتنی ہی نہیں یا پھر..... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔“ اس نے بے رحمی سے کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ خاندان بھری باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک باوقار اور باوقاف خاتون کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن..... شانوارہ..... تم خود سوچو..... سارے زمانے سے کٹ کر..... اولاد اور شوہر کو بھلا کے..... زندگی کے اس انتہائی موڑ پہ آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو اسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ تھی ذات کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں شنار کہ کہیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔“

”خوشخواہ کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زیریاب کہ اور حوا علم ہمیشہ تکلف دیتا ہے۔ اگر تم اس کتنی میں ہاتھ ڈال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سرسے سلجھانا تم پر فرض ہے۔ اب سچ چاہو جو بھی نکلے اسے ہمت اور جو صلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ورنہ ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل

برخلاف ہے۔ پھر اب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ خود سے ہی منفی انجام فرض کر کے بیٹھ جانا حماقت ہے اور ماں جیسے پرستار رشتے پر بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بدگمانی سراسر گناہ ہے۔ اس کے سمجھانے بجھانے پر وہ پھر سے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے پر تیار ہوئی۔

☆☆☆

”فیروز لالہ.....“

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود اونچے لمبے سراپے کو دیکھ کے اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مانوس چہرہ تھا جو اس نے دیکھا اور جسے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ شاید ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی ہے۔ بے یقینی سے پلکیں جھپک کے اس نے دوبارہ غور کرنے کی کوشش کی، وہ چہرہ اور تربت آیا۔
”میں خوشنود علی ہوں اور میری ماں نے کہا تھا کہ میں آپ کو پھوپھو بھی جان کہہ کے پکاروں۔“ بیڈ کے کنارے بیٹھ کے اس نے آہستہ آواز میں کہا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی ہوش میں ہے۔ ڈرپس لگے نا تو اس ہاتھ اٹھا کے اس نے اس چہرے کو چھونا چاہا۔
”خوشنود..... اتنا بڑا..... کتنا وقت گزر گیا..... آہ“ اس کی ہلکی بھوری شہد رنگ آنکھوں کے گوشوں سے چند آنسو پھسل کے اس کے اچھے بالوں میں جذب ہو گئے۔
دھندلائی آنکھیں مسکرائیں۔

”تو تمہیں لالائی نے بھیجا ہے۔ میں نے اس سے کیا مانگا تھا اور اس نے کیا بھیج دیا۔ تم نے میری سزا اور بدحوادی ہے لالائی۔ مجھے زندگی نہیں چاہی تھی۔ مجھے چار پھولوں اور ایک عدد دعا سے مغفرت کی حاجت تھی تم نے تو سمجھا بھیج دیا۔“
اس کا لہجہ حد درجہ صاف تھا۔ خوشنود کو حیرت ہوئی۔ خود اس کی ماں واجبی سا بڑھنے لکھنے کے باوجود اتنی صاف اور دونوں پائی تھی جب کہ یہ پہاڑی علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی رواں اور شستہ اردو..... شاید لاہور اتنا غرور مند رہنے کی وجہ سے ہے۔
”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں پھوپھو جان۔“ غشی بھر پڑیوں والا یہ بے بس وجود خود بخود اسے تکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”آہ..... میں جانتی تھی کہ زندہ رہی تو ضرور کوئی نیو کوئی کچھ پوچھنے والا آئے گا۔ لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں، میں تو اب تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔“ اس کی دہنی ردغیاں کہاں بھیک گئی۔ وہ کچھ

نہیں سمجھا پھر کچھ لمبے رک کے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”میں نہیں جانتا کہ خود کو چھپا کر رکھنے میں آپ کی کیا مصلحت تھی، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں مجھے چند حقائق بہت سی زندگیوں کو بھٹکنے سے بچا لیں گے۔ سالوں سے یہ سوال مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ مختلف لوگوں کے پاس اس کے مختلف جواب تھے میں صرف سچ جانتا جانتا ہوں۔ فیروز علی کا بیٹا ہونے کے نا۔ تے مجھے اتنا حق تو ہے نا۔“ اسے بولے پلے آدہ دیکھ کے خوشنود نے مزید کہا۔

”سب ڈاکٹر زکیتے ہیں کہ آپ کا کچ جانا ایک معجزہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ معجزہ صرف اس لیے رونما ہوا ہے کہ آپ سچائی کو دنیا کے سامنے لائیں۔“
”ہر سچ سامنے لانے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سچ کروے گھونٹ کی طرح پی جانا پڑتے ہیں۔“
”نہیں، کرواہٹ کو پی جانا دانشمندی نہیں۔ اسے تھوک دینا چاہیے۔“ خوشنود نے کہا۔

☆☆☆

وہ کرہ جو عرصے سے موت کی آہٹیں سن رہا تھا یک بیک چپکاروں سے گونجنے لگا۔ خان ارباب ٹھک کا ابراہا ہوا بہا کر وہ آج آیا تھا۔ ان کا ملڈ پریئر ٹیٹ جگر کو سانے پا کے خوشی اور جرات سے بلندی کو چھو رہا تھا۔ بوڑھا بھریوں زدہ چہرہ سرخ ہو کے دھکنے لگا تھا۔ جذبات کی زیادتی ان کی کلفت زدہ زبان کو اور بھی مجبور کر رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔ زریاب باپ کا ہاتھ غم لہوں سے چوم کر رہ جاتا۔ ہر بار اس کی آنکھوں سے معافی کے خواستگار چند پشیمان سے آنسو ان کے ہاتھ تر کر دیتے۔
حضرتی بی بی کے چہرے سے وہ گھبراہٹ مفقود کی جس نے غزشتہ کئی دنوں سے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ خان افراسیاب اور خان دراب سرخرو سے کھڑے باپ بیٹے کے والہانہ ملن کو دیکھ رہے تھے۔ غشی نسل کے بہت سے نمائندہ جنہوں نے اپنے ہونٹوں میں پہلی بار خشک ہلکی کے تھپنے کی نوک دیکھا تھا، غریب اختیار سے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔

ان میں خان دراب کی بیگم بھی تھیں، واحد وہ تھیں جنہیں اس موقع پر مقدس کی غیر حاضری بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ بار بار زریاب کے چہرے کی جانب دیکھتیں شاید اب وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھے۔ انوشہ اور پلوشہ کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں

تجسس اور اشتیاق کی ایک لہر آئے ضرور دیکھی گئی تھی لیکن اب باچا جان کی ناگفتہ بہ حالت شاید اس کا دھیان بخشنے نہ دے رہی تھی۔

”جی باچا جان، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں، میں آپ کا مجرم ہوں، جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے۔ میں اس سے بھی زیادہ کا متحمل ہوں۔“

لاغربا پ کی بے بسی اور بے چینی محسوس کر کے زریاب نے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھام کے خود کو سزا کے لیے پیش کیا وہ باپ کی اس حالت کا سراسر قصور وار خود کو سمجھ رہا تھا۔ باچا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہ۔۔۔ میں تم۔۔۔ تمہارا۔۔۔ تمہارا مجرم۔۔۔ بس اس لیے زندہ۔۔۔ تم۔۔۔ تمہیں بتا دوں۔۔۔ معافی۔۔۔ معاف کر دو۔“

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ تمام افراد کو ساکت کر گئے شاید باچا جان کی فنی کیفیت قابل نہیں۔ اس کا اندازہ کر کے افراسیاب ٹنک نے انہیں آرام کا مشورہ دیتے ہوئے بی بی جان اور زریاب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اب رباب ٹنک نے التجائیہ انداز میں بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور منت کے ساتھ اپنی شریک حیات کو دیکھنے لگے۔

”نہ۔۔۔ نہ جاؤ۔۔۔ میں ایسے نہیں مرنے۔۔۔ پہلے یہ بوجھ۔۔۔ موت۔۔۔ آسان۔۔۔ کر دو۔۔۔ حضرت۔۔۔ حضرت۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ حضرت۔۔۔“

بی بی جان کا نظریں چماتا بیٹوں کو ٹھٹھکے۔ مجبور کر گیا۔ زریاب تو ابھی خود سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا البتہ افراسیاب نے کسی انہونی کے خدشے کے پیش نظر بچوں اور خواتین کو باہر جانے کا حکم یہ اشارہ دیا۔ ثانی باپ کو لے کر خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ بی بی جان لرزتی انگلیوں پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر گر گئیں۔

”باچا جان کیا کہنا چاہتے ہیں بی بی جان؟“ خان افراسیاب ٹنک کے لہجے میں کچھ تھا جو حضرت بی بی کی سرخ و سفید چہرے پر زردی چھا گئی۔

”حضرت۔۔۔ بتا دو۔۔۔ تم۔۔۔ تم کو اللہ کا واسطہ۔۔۔ یہ اولاد۔۔۔ کھلا۔۔۔ گناہ۔۔۔ گناہوں کا کف۔۔۔ کفارہ۔۔۔ سب بتا دو۔۔۔ اب تو سب۔۔۔ کچھ۔۔۔ بتا دو۔۔۔“ بولتے

بولتے وہ ہاتھ نہ لگے۔ اچانک بی بی جان دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ زریاب چل کے اٹھا۔

”بس کریں بی بی جان۔۔۔ خدا یوں مت روئیں اور آپ لالہ۔۔۔ آپ بھی

بس۔۔۔ باچا جان بیمار ہیں۔۔۔ کمزور ہیں، ہم نہیں جانتے وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ بی بی جان پر تو دواؤست ڈالیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔“

”نہیں زریاب، میں پریشان نہیں، شیشان ہوں۔۔۔ خان جی ٹھیک کہتے ہیں کم از کم اب تو۔۔۔ زندگی کے ان آخری دنوں میں اب تو مجھے سچائی سب کے سامنے لے آنی چاہیے۔ کاش میں نے پہلے ہی ان کی بات مان لی ہوتی تو اتنا کچھ نہ کھوتا پڑتا۔ اک ذرا کچھ بچانے کے لیے میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنا گھر، تمہارا گھر، تمہیں، خان جی کو۔۔۔ اب ابھی شاید میرے بتانے سے کچھ بچ جائے میرے پاس نہ کسی تمہارے پاس ہی سہی۔“

ان کی نظریں بیٹے کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔

”بی بی جان۔۔۔ میں بہت شقت ہو چکا ہوں۔۔۔ کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہی یہ دل اب اور کوئی گھاؤسہ نہ سکا ہے۔ مجھے مزید مت الجھنا میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔“

☆☆☆

”میرا سب سے پہلا رشتہ اجنبیت کا تھا۔“ مومن نے بتانا شروع کیا۔

”سب سے پہلے جو احساس میرے دل میں جا گا وہ اجنبیت کا تھا۔ جو فضا میرے آس پاس موجود تھی وہ اس فضا سے الگ تھی جس کی ہاں مجھے اپنے باپ سے آتی تھی۔ میرا باپ جس زبان میں مجھے گلے بکراتا تھا جو اس زبان سے الگ تھی جس میں میری ماں مجھے لوریاں دیتی تھی۔ اپنے گرد و پیش سے یہ اجنبیت اور بڑھ گئی جب پہلے میری ماں کا انتقال ہوا میرے باپ نے میرے گرد اپنا دائرہ اور محدود کر دیا وہ مجھے انتہی ہواؤں، اجنبی صداؤں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

میری ماں کا لاش کے پہاڑوں کی رہنے والی تھی، کافر قبیلے سے تعلق تھا اس کا اور میرا باپ بیجا ب سے تعلق رکھتا تھا، اپنی جوانی میں لاہور سے کالام گھومنے آیا اور میری ماں کا امیر ہو کے کنبھیں کا ہو رہا۔

یہ وادی پیار محبت کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ دیوار نہیں بنتی فقط چند پائندیاں لگاتی ہے۔ میرے باپ نے یہ پائندیاں قبول کر لیں جو اس وقت اسے بہت سہل معلوم تھیں ہوتی تھیں لیکن میری پیدائش سے وہ سہم گیا اس کے اندر کا مسلمان باپ مگر مند

ہو گیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں لگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن بجائے وہ کوئی نایاد یہ چیز یاں تھیں جنہوں نے اس کے پیر بمبوریت کی وادی سے باندھ دیئے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جو اذیت ہے اس کا مزاج میں آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لٹ کی طرح مجھے بکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہو گئی جب ابابھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی نہ مرنے لے آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے اباباپنے عشق کو غلطی کہنے پر مجبور ہو گیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی صرف میری وجہ سے اس لازوال عشق پہ یہ دھبا۔

ابا بچھٹارہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کیوں نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ کو لوگوں میں اپنی بنی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین دلا دیتے پر کہ میں ہر حال میں اسلام پہ قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابانے سکون سے انھیں موندیں بعد میں مجھے لگا ابا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے، ہستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیارے ہی کہا جاتا ہے ناں۔ کسی نے میرے ایمان کو ٹیس نہیں پہنچائی۔

میں انجنیوں کے درمیان بھی بڑی بھولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روزِ فجر سے مانگی اپنے دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور پکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے، بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی صلے کے..... میں اسے چپ چاپ جانتی رہتی تاجر، چاہے وہ چاہتا یا نہ چاہتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہو گئی۔ لیکن وہ کسی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک خندی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر من چاہی چیز کو اپنا

دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بخارِ محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شا کر محبت اور اُس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ بنی اپنے ابا کا شہر دیکھ چکی تھی۔ مرنے دہ بھی اس کی آنکھوں میں جو بچھتاوے تھے اس نے مجھے جتنا دہ کر دیا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی سلسلے، عشق ہی اُس عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ وصال کے بغیر عشق کو سوچنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک حسرت لگا کہ اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے ابا کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دیوانہ تھا کہ سب عشق و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بے کلوزی اور گارے کے مکان میں زندگی گزارنے پہ تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال بعد ایسے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان بنادے گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ تو شاید میں بھاری کڑواؤں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سر بلند پہاڑوں اور اونچے پہاڑوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی میری نظر میں برداشت ہوئی تھیں نہ ہی کسی کی انھی انگلی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے دقا نہیں دلا سکتا۔ بے تو قیر ہو کے رہنا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست

فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی دلولے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی وکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی ہو، وہ دوبارے فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آج انجمنی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی ناوارث اور بے سائبان کھلا دوں گی۔ زریاب کے دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں اپنی جگہ کس بل بوتے پر بناؤں گی۔ ہمیشہ نبھانا آسان ہے لالہ رشتے نبھانا مشکل، میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے مشکل چیز اور سی ہے جسے سائن لینے کے لیے مجھے عزت کی ضرورت ہے، عزت میری بھوک ہے لالہ، وقار میری پیاس ہے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے بغیر جا سکتا ہے بھوک اور پیاس سے کوئی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں ہوں جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل بھی کچھ نہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلایا جائے۔ ان پہاڑی کم حیثیت لوگوں میں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں، میری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں بڑے وقار کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خوئی رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں میں کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔“

”فیروز علی دروگ کی بہن کی حیثیت سے۔“ اس کے فیصلہ کن اعلان نے مجھے چونکے یہ مجبور کر دیا اور انجمنی میں سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا۔

”تم نے جتنی بھی بار مجھے لالہ کہہ کر پکارا مجھ خود پہ فخر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن خود تم مل کر احساس ہوا کہ تم کیا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ جو آسائشات سے بھری زندگی محض وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جاسکتی ہے۔ آج اس لمبے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت و احترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔“

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

”لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔“

”لالہ.....!“ سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ

میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابا کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتار کر میں شانت ہو گئی تھی لیکن رشتہ اور مان محبت سے کہیں بڑھ کے طمانیت بخش ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معتبر کر دیا تھا۔

”اور ایک بھائی ہونے کے ناتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب خٹک سے کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دوں گا میں اس کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلوں گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آکر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔“ اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

”میں یہ عہد کرتا ہوں مومنہ علی کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ سیکے کی طرح آباد رہے گا، چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔ اس گھر سے تمہیں سیکے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی دروگ کا بھاری بھر کم حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہے فرد کی حیثیت سے داخل نہیں ہوگی۔ یہ میرا، ایک خالص بچتون زاوے کا عہد ہے۔“

اور میں اس عہد پہ ایمان لا کے ہای بھر بیٹھی، عورت بھی کتنی عجیب چیز ہے، بچتوں کے بارے میں لاکھ شدت اور انصاف پسندی کا دعویٰ کرے، کہیں نہ کہیں ڈنڈی ماریں دیتی ہے، میری ماں اسے عشق میں اتنی جتنی بھی کموت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابا کے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں..... زریاب خٹک کے لیے..... اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور انا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محروم کرنا گوارا کر لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بار میں کتنی خود غرض بن گئی..... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ اس نے میرا اعتماد بھال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا

ہر اچھا برا اسے سو نہ کر خود کو بے فکر کر لیا۔ پھر وہی سب ہوا جیسا اس نے طے کیا تھا۔

چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی جو بی بی آگئی اور پھر وہ دودھ شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔

تم جانتا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھر بھری ریت کی دیوار بنات ہوئے۔ یہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے با آسانی اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سردہری بھی، اجتناب تھا۔ زریاب کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازما میں تک باقاعدہ مجھ سے کٹراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن جانتے ہو حیران کن بات کیا تھی..... وہ یہ کہ یہ تمام اہانت آمیز رویے بھی مجھے بھڑکانے سکے۔ میں جو اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں مرد رویے مجھے بے موت نہ مار دیں ہر کسی سے انجان ہو کر رہنے لگی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا، کچھ سنائی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندنی کہہ کے پکارتا ہے کون کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا۔ مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی ہلک محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ذرا سہلایا جاتا، میں پروانہ کرتی، شاید ای کو نشہ کیسے ہیں اور شاید ای لیے نلکے کو بے غریبی اور ذلت کہا جاتا ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ ہستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جھگی بیڑوں کی طرح سر بلند اور اکھڑھی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، اتنی بے گانگی اور ذلت و تحقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ پاس ہوتا تو مجھے کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہوتا تھا۔

میں بنجارن تھی تو محبت بھی کشتوں کے سکوں کی طرح گنگن کر کرتی تھی، جو بی بی میں آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے پچھاؤ کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلا خیر ہو گیا۔ میں..... مومنہ لے جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی لیتی تو صرف اس لیے کہ فضا سے آئی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس ناس میں اتار سکوں۔ زریاب کی دیو گاہی بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔

انہیں دنوں زرسا نگہ، زریاب کی بڑی بہن بھی ڈیوری کے لیے میکے آئی۔ میری

اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے رویے میں بھی میرے لیے سردہری اور گرہ کے موا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طنز کے تیر تا تک تاک کے چلائی رہی۔

بی بی جان کا رویہ ایک خاموش اجتناب تھا لیکن ان کی بیٹی کے رویے کا جارحانہ پن مجھے کبھی کبھی نشے سے چھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تلخ مزاجی اور ترش روی کو اس کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کی صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا سینے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز لالہ کی بیوی لالی بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بیٹے کی پیدائش میرے بچے میں ہو۔ اس توجہ و عنایت پہ میں کھل اٹھی لیکن زریاب سے پہلے بھری جدائی مجھے قبول نہ کی اس لیے جانے سے منع کر دیا۔

میری بیٹی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہو بہو میری تصویر تھی۔ زریاب نے کس لیے کسی سے کہا تھا۔

”اب میں تم سے کہاں تک بچوں گا مومنہ۔ تم کہتے روپ بدل کے مجھے تفسیر کر دو گی۔“

فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔ مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش ٹھکانے لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کو نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار بچیو گی سے گھر والوں کے مجھے رویے اور گرہ کو محسوس کیا۔ غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے کچھ قصور اپنا بھی نظر آیا۔ میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔ میں نے ایک بہو ہونے کے تاتے خود کو مرنے کی کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر بی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا چاہیے تھی، اگلے چند دنوں کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے اپنا احتساب کیا۔

باجا جان مصر تھے کہ اس باجیرونی ملک کا رویہ دور ہے یہ زریاب ہی جائے جب کہ وہ میری اور اب بھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔ میں نے ہی اسے جانے پہ

آمادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بمشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ نے کتنی چیزیں مجھ تک آنے سے روک رکھی تھیں۔ اس کے جاتے ہی جیسے بھابھڑ چلنے لگے۔ زرساگہ کے طعنے ناقابل برداشت ہوتے چلے گئے۔ میرے اندر کی انارپست بھڑان پھر سے جاگنے لگی۔ اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دوسرے کے دھم سے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی، اب جان کو آجاتے۔ میں نے تنگ آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔ یوں بھی بھرے گھر میں مجھے کوئی مسئلہ لگانے پہ تیار نہ ہوتا تھا۔ بی بی جان مجھے دیکھتے ہی وضو کرنے چل پڑتیں۔ ملازما کیں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دور دور رہتیں۔ باچا جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔ زریاب کے بڑے لالہ شہر میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری سی ملاقات ایک آدھ بار ہوتی تھی، ان کے روئے میں بھی کوئی خوش آئند جھلک نہ تھی۔ جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

زرساگہ ابھی تک علیحدگی اور اس کی بد مزاجی اور چڑچڑاپن عروج پہ تھا۔ ہر پختے اس کا شوہر جہم گل آفریدی اس سے ملنے آتا، ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی جلی بیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرساگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ جہم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ بس کبھی کبھی تھا۔ خوب دیکھی اور اپنی بیوی سے خاصا نرم و نرم تھی۔

مجھے تو پتہ چارے کی قسمت پہ افسوس ہی ہوتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بد زبان اور کم شکل بھی۔ پورے گھر میں وہی تھا جو مجھے تنگ خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا، ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زر ساگہ سے بچ کر رہتی جہم گل کے آنے پہ اس سے ضرور ملتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اس تھی۔ مقدس کو سولانے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، چپکلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے ناروا سلوک کا ذکر کیا۔

ورنہ اس سے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف دہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو تھیں پہچانی جانی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لگانے پہ ہو بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر جہم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی لگی صرورت سے آیا تھا۔

”گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لگانے پہ لکھ دو۔“

میں نے لافاذ اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ مستی سے اُٹھ بیٹھا۔ تنگ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے چمک رہا تھا۔ شب خوانی کا لباس پہن سکتا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، مجھے اس کی مشکل حالت پہ افسوس ہوا۔

”کیا ہو لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔“

”کچھ نہیں بھائی! بس سفر کی مکان ہے اور..... میری قسمت کا ہم سفر مکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔“ اس نے انگلیوں سے اپنا ہاتھ مسلتے ہوئے کہا تھا کہ میں ان زرساگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ و متوجہ جلوں کی ٹھکرار سناؤں دیتی رہی تھی، میں ان کے درمیان موجودگی کی وجہ سے ناواقف تھی پھر بھی میری تمام تر ہمدردیاں رحم گل کے ساتھ تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری نند کے سر دلچلیاقت تھے۔

میں نے اس کا دھیان بنانا چاہا۔

”چھوڑ دلا، ذرا ذرا سی بات ہے یوں مسئلہ لاکا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔“ میں اس سے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیش آئی تھی شاید وہ مجھ سے عمریں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ اس کا مجھ سے بڑوں والا تھا۔

”ہاں سوسے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زخم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔“ وہ پھینکی سی ہنسی، ہنس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یوں بیرواداری میں کہہ دیا۔

”تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ گتھی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔“

”ہائے اللہ جی، میں برباد ہوگئی..... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔“

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سیدہ کو بی کرتی زرسا نگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”بکواس بند کر دو زر۔“

”ہائے بی بی جی..... آپ بھی مجھے کوں رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دو منٹ پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آنکھیں دیکھیں ذرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔“ اس نے شور مچا کر بی بی جان کو بھی بلایا ان کے ساتھ ساتھ وگمہ اور سرحدی جیسی ملازمائیں بھی لپک کے تماشہار نکھنے آگئیں۔

”میں کہتا ہوں زرسا نگہ، زبان قابو میں کر لو ورنہ.....“

رحیم گل نے دھاڑ کے کہا کیوں اسے ذرا پروا نہ تھی۔

”اسی لیے بھانے بھانے سے روکھ کے کمرے سے نکل آتا ہے۔ دوسرا کمرہ اس جادوگر نے ہی جو آ باد کیا ہوتا ہے۔“

میں سن ہو گئی۔ اس رکیک الزام نے میری قوت گو یائی ہی سلب کر لی تھی۔ وہ زہر اگلتی رہی۔

”آدھی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلے دیکھا تھا۔ طبیعت بھری نہیں جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم من من مبر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پارا ہے تھے۔ خود رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ ہکا بکا رہ گیا۔

”نہ لی..... ساری رات میں خود رویا ب دلہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا، بی بی تو بیلی تک نہیں کمرے سے۔“ سرحدی نے خوف خدا سے لرزے گواہی دی۔

”تو..... بڑھی چڑیل.....“ زرسا نگہ نے عمر رسیدہ ملازمہ کو پھٹا لیا اس کا منہ نوچتے ہوئے وہ بے تحاشا چیختی لگی۔ بی بی جان بیٹی کی یواگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پر لڑوہ طاری تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے خواہوں میں نہیں ہے لیکن پھر مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے گھن محسوس کر کے منہ پھیر لیا۔

”وگمہ..... اسے سنبھالو..... نجانے کیسا دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کملا کے رہ گئی ہے نجانے کیسا کسی نے تعویذ پھونکا ہے بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے معصوم بچی کا۔“

”ہو بہ معصوم بچی.....“ رحیم گل نے تنفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکر مند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے دلا دلا دیا وہ جو کے یوں بے عزت ہونے پر ایک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کہا بھی تو بیٹی کے لیے۔

”دورہ نہیں پڑا..... ذرا سے کرتی ہے پاگل پن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیماری پاگل جو ہے۔“ رحیم گل نے غصے سے کہا۔

”میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟“

”میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔“ بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل اس پاس بڑی چیزوں کو کھوکھرا تا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح گونے کی دیوار سے سبکی چٹکی کھڑی تھی۔ یہ تماشا میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زرسا نگہ کی اکثر حرکتیں مجھے عجیب سی لگا کرتیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ، مجھے..... اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم و غصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بد قسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زرسا نگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ چھڑا کر مجھ پہ چھٹی۔ اس نے میری چادر کھینچ کے پھینک دی اور گریبان سے بکڑ کے مجھے زمین پہ لا پھینکا۔ میرے ٹخن ٹوٹ کے بکھر گئے میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے ٹھنک تک نہ سکی اور آسانی سے اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھٹینا جا یا۔ بی بی جان کے کہنے پہ ملازمائیں آگے بڑھیں لیکن تب تک اس نے میرے منہ پہ طمانچے مار مار کے میرے رخسار نو جا دیے تھے میری ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری پیچ و پکار میرے اندر ہی کہیں دفن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی وگمہ اور سرحدی نے اسے بکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پٹیلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دہری ہو گئی۔

”کافرن..... ہندنی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہوگی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چل جا اپنے تنہا پھاڑوں پر وہاں رواج ہوگا چار چار مرد کھنے کا آزادی سے عیش کرتا۔“

”کافرن ہوگی تو.....“ میں پھٹ پڑی۔

”میں مومنہ ہوں..... مومنہ..... خان زیباب کی من چاہی بیوی..... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈانٹن۔ خواہم مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔“ میں مزید چپ نہ رہ سکی میری لکار پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا توجہ بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

اس وقت کی تمام تر اذیت مومنہ کے لمحے میں اُتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس نڈھال چہرے کے اس سیاہ پڑے حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سر کر رہے تھے۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے قدم اس ایک جھلنے باندھ دیے۔ وہ آئی سی یو سے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو پا کے وہ ہنگامی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جانی یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ ماں کی آواز نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ دروازے میں ڈوبی اس آواز میں گرفتاری ہو کے دروازے کے پینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ باپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو، تجویزی کھینچ رہی تھی۔

”میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔“

مقدس کے رخسار دھکنے لگے۔ اس نے شدت ضبط سے لب پیکل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

”وہ رات بڑی غلام تھی۔ ساری شام میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اسی کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گال کو کوئی جھیل رہا ہے۔ میں نے سوچی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیپالی لیے کھڑی تھی۔ برستی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہی شاید میرے چلے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھٹنوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اوپر بگڑ ملا زماؤں کے سامنے ہونے والی تبدیلی یاد آگئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا زلزلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔“

رات گہری ہو چکی تھی، مقدس بستر پر لیٹی لاکاریاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ سے نظر پڑتے ہی وہ سر اسیمہ ہو گئی۔ مجھے جھننا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ لالے قدموں کمرے سے نکل گئی، مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے کے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آ رہی تھی، میں نے خالی غالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیر بخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہوا ہاتھ صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سر ہانے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ میری سچ نکل گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آہ تک نہکے جلد جھلس چکی تھی۔ دروازے کے میرا گلا بیٹھ گیا۔ دن چڑھے تک میں بیہوش پیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

زیباب کے آئے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یار و مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگلاخ حویلی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، کوئی میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا، اس طرح تو میں ختم ہو سکتی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زیباب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔ زرا سنگ نے مجھے اگلا جان کے میرے ساتھ یہ ستم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے لاوارث سمجھ کے یہاں مرنے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو بتا دوں گی کہ میں لاوارث نہیں..... بے یار و مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لا لا یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا۔ گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا ہمت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لا لا کو فون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلائیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

”مومنہ..... تم..... سب کیسے ہوا؟“ وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحے بے چینی سے بیٹھے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے ہو رنگ ہو گئیں۔

”اس گھر میں فیروز خان وردگ کی بہن پہ اتنا گھٹیا الزامات لگائے گئے۔ کیا یہی سب وہ خوشحال تھیں جنہیں دکھانے کا وعدہ کر کے زریاب تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ میرا دوست ہے لیکن اب میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بہن کا شوہر ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے اسے اس رشتے کے تمام حق پورے کرنا ہوں گے۔“

”نہیں لالہ زریاب کا کوئی قصور نہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو جب مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو بچانے کیسا محسوس کریں گے۔ یہ سب ہوا ہی ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو کسی کی مجال تھی مجھے ہاتھ لگانے کی، میری چادر کھینچنے کی، مجھ پر کندے الزامات لگانے کی۔“

”ٹھیک ہے وہ تمہارا شوہر ہے، تمہارا مسائبان..... لیکن باقی افراد سے بھی تمہارا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ سب پہ تمہاری حرمت فرض ہے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارا بے مسائبان اور غیر محفوظ ہونا ثابت کرتا ہے کہ زریاب تمہیں یہاں تمہاری شایان شان حیثیت نہیں دلا سکا۔ میں بات کرتا ہوں باچا جان سے، وہ خود چل کے آئے تھے، تمہیں بیانے تمہارے والی ہیں تمہارے سر پرست۔“

وہ میرا ہاتھ تمام کے باچا جان کے کمرے میں لے گئے۔ بستر پہ نیم دراز باچا جان سنبھل کے بیٹھ گئے۔

”السلام علیکم باچا جان“ فیروز لالہ نے غصے کی آخری حد میں بھی تعظیم بادر کھی۔

”آؤ فیروز آؤ“ انہوں نے درز دیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے فیروز لالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید انہیں میرا یوں کمرے میں گھسے چلے آ پند نہیں آیا تھا۔ اب تک ان کی کسی بہو کو اتنی جسارت نہ ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت ان کی تنہائی میں چل ہوئی۔

”باچا جان میں صرف آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا خٹک خاندان میں عورت کی عزت صرف ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے کے حوالے سے کی جاتی ہے؟ کیا بیٹے کی عزت گھرانے کی عزت نہیں کہلاتی جانی اور کیا بہو کو بیٹی والی تعظیم نہیں مل سکتی۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو فیروز“ باچا جان کے لہجے سے ناگواری جھلک اٹھی۔

”صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں باچا جان“ اس نے میرے چہرے سے چادر سر کا کے مجھے آگے کیا۔ باچا جان میرے چہرے پہ یہ گہرا نشان دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ سب کیسے ہوا اور کب؟“

”آپ یہ پوچھیے باچا جان کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟ اس لیے کہ یہ نشانات

حادثاتی نہیں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی نے نہ صرف اپنی بھالی پہ جسما تشدد کیا ہے بلکہ نہایت بے رحمی سے رکبک ترین الزامات بھی لگائے ہیں جو اس خاندان کی بہو کے حوالے سے مومنہ کے لیے انتہائی شرمناک ہیں۔“

”اس نے کوئی الزام لگائے ہیں نہ ہی تشدد کیا ہے۔“ لی بی جان کمرے میں چلی آئیں۔

”نند بھانج کے جھگڑے کس خاندان میں نہیں ہوتے۔ بس کل بات دراز یادہ ہی بڑھ گئی اور وہ بھی سب اس کی وجہ سے ہوا۔ یہ پہاڑوں کی رستے والی زبان دراز کنوارا، خاندانی طور پر لیا گیا جانے۔ اس کی زبان..... تو یہ تو ہے..... زرا سنگد بھی مشتعل ہو گئی۔“

”یہ محض نند بھانج کا جھگڑا نہیں تھا لی بی جان۔ بلکہ یہ جھگڑا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا اور طرفہ ہوتا ہے۔ یہ تو زیادتی تھی جو آپ کی بیٹی کی طرف سی ہوئی ہے۔ ظلم ہے جو اس نے میری بہن پر توڑا ہے، وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“ لی بی جان کو جلال آ گیا۔ فیروز لالہ نے نظریں جھکا لیں۔ ”آپ میری بزرگ ہیں میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن خدا کے لیے اپنی بزرگی کا مان رکھ لیں۔“

”سچ کیا ہے حضرت؟“ باچا جان گرے لی بی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بد بدکارے رہ گئیں۔ سچ کہنے کی ہمت نہ گئی اور جھوٹ وہ اپنے خان جی کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔

”زرا سنگد کہاں ہے؟“ وہ بولے۔

”وہ بیچاری تو کل سے بیمار پڑی ہے۔ اپنی سدھ بدھ ہی نہیں اسے۔ میں نے کہا ماں عورتوں کی لڑائی تھی، زبانی کلامی طعنوں سے بات اس عورت نے آگے بڑھائی، زرا سنگد کو مارنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے دھکا دے دیا۔ غلطی سے آگے یہ جا پڑی۔ وہ بے چاری تو خود دہشت اور خوف کے مارے بیمار ہو گئی ہے۔“ انہوں نے کھجی ہوئی نظروں کے ساتھ بات بتائی۔ باچا جان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں نے کہا۔

”باچا جان ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کیجئے ان پہ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات میں تو ان کا اٹھا ہاتھ روکنے کی جسارت بھی نہیں کر پائی۔ سارا گھر گواہ ہے انہوں نے..... میرے ساتھ..... میں سبک اٹھی۔“

”مجھے ملانچے، لاتیں، گھونے مارے، گالیاں بددعا کیں دیں۔ گندے الزامات لگائے، جلتی لکڑی میرے چہرے پر رکھی۔ میں جی کہہ رہی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔“

”تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسولؐ یہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کا کافر لوگ۔“ بی بی جان کے اس طعنے پر فیروز لالہ ہچکچایا۔

”باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگائیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واضح کاف الظاف میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ جو حلی سے رخصت ہو رہی ہے، وردگ خاندان سے خٹک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے میرے خاندان کو دی ہے۔“

”خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گے نلیس اپنا خون پیچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان پشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔“

”بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آگے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔“ ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کہہ اٹھیں۔

”یہ نہیں نہیں جائے گی۔“

”کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، زخمی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔“

”یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔“

”مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہے“

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ، اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔“

”میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کر رہا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مومنہ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زریاب کے

آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم ہمیں رک کے اس کا انتظار کرو۔“ میں مذہب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے خنجر ابدالا۔

”شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں با اعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو پٹی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خٹک خاندان کی بیٹی یہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔“ بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی، اور شاید ایسا ہی کرنی میں، لیکن فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

”مومنہ میری بات مان لو یہاں تمہاری عزت اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں اپنی سحائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے، ورنہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس تمہرے پہ اب تک تحمل سے بیٹھے باچا جان بھی ہنرک اٹھے۔

”فیروز خان تم بے ادبی کے مرکب ہو رہے ہو،“ میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔

”ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو کسے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلاتا ہوں۔ میرے گھر یہی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہو گی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گی یا بار بار دی جاؤ گی۔“ میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلالی چہرے دیکھے، میرے رخسار سے ہنسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے چھوڑنے کے کپڑے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت لینے آئی۔ دونوں نے منہ پھیر لیا۔

”تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت رو نہ کے جا رہی ہو۔ اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سر دونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سانسے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی رضامندی کے جا رہی ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہوگی۔“ باچا جان نے منہ دیکھے میں کہا اور میں..... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن مقدس کو ایک ننھی سی بچی کے رونے کی آواز اس اب تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

”بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاسد سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔“

زریاب نے بے بسی کی آخری انتہا پہنچنے کے لی بی جان کے گھٹنے تھام کے فریادی
جو باجا جان کی ہنسی لگا ہوں سے بارمان کے عرصے سے سینے میں دبا رکھولنے پر آمادہ
تھیں۔ انہوں نے زریاب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، لبوں سے لگا کے کہنے لگیں۔

”زریاب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم
سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ تمنا کی کسوٹی میں کھری نہ اتر سکی۔ ایک
کمزور لہجے سے مجھے سنگے اور سوتیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پر آکسا دیا۔ میری ذرا سی
نغرش نے کئی زندگیوں پر باد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گروں۔“

”بی بی..... جان!“ وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنجھلاہٹ اس کے چہرے سے
ہو بیٹھتی۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدا ارنا مجھے پوری بات سنائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟
کن کمزوروں کی بات کر رہی ہیں؟“

”یہ لمبے میری بیٹی زرسا نگہ کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگا کے چلے آئے
تھے۔ تم جانتے ہی ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر
ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پاری تھی۔ شکل و صورت بھی اس کی وجہ تھی اور تعلیم
بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خلک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام بھی بہت
ہوتا ہے، صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کے خاندان میں اس کے جوڑ کا
کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیانیے کا ہمارا درواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی
عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی مجروری اور مایوسی نے اس کے قدر چڑچڑا اور بد مزاج بنا دیا تھا۔

تمہیں یاد ہی ہوگا۔ خان جی نے مجھ سے اپنی بہن پر دبا ڈالنے کے لیے کہا جس کا
پیٹا رجیم گل ہماری زر سے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تال تھا لیکن خان جی کے پیہم
اصرار پر میں، بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو مٹایا لیا یوں
بھی سترہ اٹھارہ سال لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے
سامنے۔ لیکن اپنی ساری تنہائی اس نے بیوی پر نکالنا شروع کر دی۔

زرسا نگہ کوئی کم عمر اہل حق نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال
پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رجیم گل سے لہجنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ
ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے

بھلے بیٹھ بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔
نور رجیم گل کثرت مزاج کی عمر کی بیوی کو وہن تسلیم کر سکا نہ ہی زرسا نگہ کے خوابوں کو تعبیر
ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رجیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی
خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور تم یہ کہ رجیم گل کا رویہ اس
کے احساس کمتری کو دوبارگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اس کے سنگھار پر
تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پر بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا دھنا اور اس کی کم
علمی اور بد زبانی کو کوستا۔ زرسا نگہ ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

”بی بی جان! باجا جان نے کیوں زبردستی مجھے اس کے سر منڈھا، میں اس چاہی
ہستی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے ترم آ میر نظر دے دیکھتے
ہیں اور مجھے ایسے پیسے میں کوئی جادو کرتی ہوں جس نے ایک شہر والے کو اپنی قید میں کر رکھا
تھا۔ بی بی جان! مجھے محروم ہی رہنا تھا تو خلک باؤس کے ہی کسی کو نے میں رکھ دیتے۔
غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنا کر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے
جتنا ہیں کہ بہن کے بہکالے میں آئے پڑنا قاتلوں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو
سناتی ہیں کہ ہمردی اور ترس کے نام پر اکھوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھلائی ہو۔“

”صبر کر دے صبر۔“ میں اور کیا کہتی۔ ”وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے
گا۔“ ”نہیں بی بی جان آنے والا وقت اور بھی تنہائی لانے والا ہے۔ ابھی رجیم گل کم عمر
ہے۔ باپ کے زیر اثر ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار
بنادیں گے ابھی وہ ہمردی کے ساتھ مجھ سے نباہ رہا ہے۔ کل کو شاید۔“

”اچھا بول منہ سے نکال دے۔ تو اس بننے والی ہے ابھی باا تیں سو جا کر۔ آنے
والی اولاد تیری قسمت کھول دے گی۔“ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں
اور اندھیرے لکھلائے گی، شادو جن دونوں پیدا ہوئے والی تھی، بزرے نہیں تھی۔

مجھی تم مومن کو بیاہ لائے۔ یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں بنی بنی کھول گیا۔ رجیم
گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ من چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا
نشانہ بچپاری زرسا نگہ ہی ہوتی۔

”من مانیاں کرنا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، ہے ناں؟ بیٹی کو خود سے آدمی عمر کا
خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بیک نامک کے لے آئی۔ بیٹے کو جنگلی پھول پسند آیا۔
باپ میلیوں چل کے کوڑا لیا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بد قسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ذور سدا

دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔“

”لاڑکی شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے۔ جب میری ماں نے کہا کہ رجیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے گھر آ کے میرے ماں باپ کو اپنی پڑھائی کہ بیٹے کی مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھانچیں گے تو کیا باہر سے لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکرا بنادیا گیا۔ زریاب کو کھلی چھٹی کس نے دی؟ تمہارے باپ نے ہی۔ اب کیوں برادری کی کوئی ذہلی عری کنواری نظر نہ آئی؟ اُس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زرے آخری دنوں سے تھی۔ اس حالت میں عورت ویسے ہی زورورخ اور حساس ہوتی ہے۔ رجیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس پہ بھی سہانوں والا روپ چڑھایا تھا۔ اس کے جھل مل کرتے چہرے اور قل قل کرتی ہنسی زرے کے دل پہ برہمی بن کے لگتی۔ وہ تم دونوں کو دیکھ کے کہنے لگتی۔ تمہارے قہقہے اسے اپنے نوحوں پہ ہستے معلوم ہوتے۔ اپنی ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قتل اسے رہنے لگا۔

ایسی ہی عجیب ذہنی وجہ بذاتِ کیفیت میں اس نے شاد کو ختم دیا۔ کمزوری صحت کی وجہ سے اس کا چڑچڑا پن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔ رجیم گل ہر پھٹے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور وہ اپنی بے بسی کا اظہار اپنی اولاد ساز ماؤں پہ نکال کر لیتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بن گئی، پھر مقدس کے بعد جب تم کا رو باری دور ہے تو گئے تو ایک بار پھر رجیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زرے سا نگہ کر لانا کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کے وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت سراسر اس کی دین تھی۔ زچگی کے بعد افسردگی اور زندگی سے بیزاری نے اسے صحت کی جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کے اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے پہ جھانیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ پیرے جان۔

”اس لاش کو لانا بھیجا ہے ماں نے ساری عورتیں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔ تم نے زریاب کو نہیں کی جو چھ مہینے سے بستر بستر لے پڑی ہو۔ اولاد کے بعد تو عورت کے چہرے

پہ نور آ جاتا ہے، تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہو گئی ہے۔ اپنی بھادون کو دیکھو۔ گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔“

”تو جاؤ سگھ لو، وہ تو جنگل پھول ہے ناں بقول تمہارے۔ جنگلی سوغاتیں سب کے لیے ہوتی ہیں تم بھی جڑا لو۔“

”شٹ اپ بدتمیز عورت کچھ تو لحاظ کر تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔“

”تم کیم نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے سن کے قہیدے پڑھتے ہو۔“

”کون سا قہیدہ پڑھا ہے میں نے؟ تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو،

تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ منوں بڑھیا۔“ وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور

زرے ساری رات ان کڑوے الفاظ کی مار تھیں رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب

سہ نہ کی جب اس کے اندر لاوا پاک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکلی اسے پتا چلا کہ

مہمان خانے میں رجیم کے ساتھ مومنہ بھی موجود ہے تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ اتنے

دنوں سے اس کے اندر جمع ہنجز اس ایک دم ہی نکل گئی اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے

حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی

اس کے منہ سے جواب سن کر زریاب تلخ بالکل ہی دیوانی ہو گئی اس نے..... اس نے تمہاری

بیوی پہ ہاتھ اٹھایا۔ میں نے، وہ گمہ سے سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت

کوشش کی لیکن وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ جیسے کوئی جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی

طاقت اس کے اندر بھری تھی، عجیب سی دھشت اس کے چہرے سے نکل رہی تھی، میں

خوفزدہ ہو گئی وہ بار بار خود کو چھوڑا لیتی اور مومنہ پہ مل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ

استعمال کے ساتھ اور پھر..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے نکڑی نکالی

اور مومنہ کا..... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔“

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ داب اور افراسیاب کے چروں پہ بھی استعجاب تھا

جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ ان کے جھکے چہرے سے آنسو

چپک چپک کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ بشتا ہوا چہرے آیا اور شعلے..... اس نے

کرب سے آنکھیں موند لیں۔

”میں باقی ہوں مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومنہ کی

دلجوئی کرنا چاہیے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ

ہوتے لیکن زرسا نگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھلاد دیے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔ دوسری طرف غم وغصے اور بے بسی کا شکار مومن نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔ خانی اب تک سارے قہصے سے انجان تھے۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زرسا نگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومن کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سراپہ ہو گئی۔ میرے ہیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

”بی بی جان زریاب کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”اسے تو پتا چل ہی جائے گا زریاب۔ مومن کا چہرہ خود بتا دے گا۔ یہ تو نے کیا کیا بد نصیب۔“ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو سنے پہ مجبور ہو گئی۔

”رجیم گل پہلے ہی مجھے بسانا نہیں چاہتا۔ اب مجھ پہ پاگل پن کا الزام لگا کے مجھے رسوا کر دے گا بھائی کی نظروں سے بھی کر کے میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔“ وہ ہلک بھلک کر رو رہی تھی۔

”یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جب تو آگ اٹھا کے اس پہ لگی تھی۔ زریاب کی جیوتی کا منہ جلادیا تو..... وہ تو اک بلہ یہاں نہ رکے گا اب۔“

”کچھ کرو بی بی جان، کچھ کرو زریاب کے آنے سے پہلے پہلے کچھ ایسا کرو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ سسرال والے پاگل کہہ کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بھالو۔ زریاب کو کچھ پتہ نہ چلنے دو۔ مومن کے پاؤں پکڑ کے منت کرلوں گی میں، اسے کسی طرح جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بیکس مانگوں گی، بھوں کی میرا نام وہ مت لے۔“

”اور اگر وہ نہ مانتی تو؟“

”تو..... تو پھر میں اسے مار دوں گی۔ جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کر سکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کوں بتائے گا زریاب کو، کیسے پتا چلے گا رجم گل کو۔“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ جبر مزے لگے۔ گردن کو خنیف سے جھکے لگنے شروع ہو گئے۔

میں ہار گئی..... ممتا کے ہاتھوں..... ساری عمر پلڑا سلامت رکھا..... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اسنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زرسا نگہ کے مقابلے فرق برتا ہو، لیکن اس وقت..... لیکن نہیں..... شاید زریاب کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں بھی کرتی..... چاہے تم ہوتے چاہے دراب..... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری ہڈا دی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہوگی۔ بیٹا سلامت تو ہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لالائی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ کوانے جارہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومن کو لے گیا خان جی مومن کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزر رہے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے انہیں اور ورغلا یا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بلانے پہ زریاب فوراً چلا آئے گا۔ اور پھر۔ مومن کی زبانی سب کچھ سن کر..... یہی تو میں نہیں جانتی تھی بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پتنام جب اسے ملا جب تک تو فیروز اپنے گھر بھی نہ پہنچا ہوگا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا اس طرح فیروز سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن جب..... بی بی جان نے کہتے کہتے سر اٹھایا، کمرے میں موجود تمام نفوس پہ ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نگاہیں کم مہم بیٹھے زریاب پہ جم گئیں۔

”تیسرے دن تم..... تم آئے تو میں حواس باخت ہو گئی۔ خان جی کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی وفاؤں اور خدمتوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق مانگ لیا نہیں اللہ اور رسول کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کر دیا۔ وہ چپ کر گئے اور میں نے سمجھیں.....“

ان کی آواز لڑکھرائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوگا۔ بوٹھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفق کی لالی حد تک خون کی نیکر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے ہر دم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

”میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دوست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، تو بے پروا ہو کر کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں۔ بے پردہ لڑکے، وہ روز ہی آ جاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر خون سا ساگ والا بھائی تھا۔ گھٹاؤں کرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ توکل کے ہی سامنے آ گئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں ماراؤ پکی بک چھوڑ گئی۔“ وہ چیخ اٹھا تھا۔

”بس کریں بی بی جان، آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں کسی کے متعلق کہہ رہی ہیں اور کسی سے کہہ رہی ہیں۔“ اس وقت ملیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے، کیونکہ یہ لغو ترین بات کہنے والی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جن سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

”پانی سرے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں یقین نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں۔ جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر فرد سے پوچھ لو۔ کس نے شرمی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے گئے ہیں تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زریاب کو۔ کیسے بے سدھ پڑی ہے۔ یہ تماشائی تو جا ہی تھا اس گھر کے درو دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں میں زندہ ہی کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے اعتباری کے رنگ دیکھنا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔“

”بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گندبک گئی۔ کتنے گئے زریاب جیسے شخص مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے مرنے والی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی حرا آتا ہے۔“

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کا تھا۔

”موم..... نہ.....“ وہ چیخا۔

”میں چھوڑوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس سے غیرت فہمیں کو..... میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔“ غیرت دھسنے سے وہ کپکپانے لگا۔

”دفع کرو مردوں کو۔ تیرے بھیج اس کا فرن پہ، جانے دے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے اس کی منزل..... یہ گھر تھا ہی نہیں شکر ہے تمہاری پکی محفوظ رہی ہے۔“

”اے کیسے دفع کروں..... وہ میری مردانگی کو کالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیرتوں کی طرح بیٹھ جاؤں..... نہیں بی بی جان..... میں اس دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ دیوار سے لگی رائفل اٹھا کے باہر چکا۔

”زریاب..... رک جاؤ،“ وہ دیکھ کر باپا جان اٹھتے کر پڑے۔ اچانک ہی فاج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حضرتی بی نے ایک نظر شوہر کے اٹھنے دے وجود پہ ڈالی دوسری نظر ظوفان کی طرح باہر نکلنے کر ذیل بیٹے پہ ڈالی۔ پہلی بار انہیں اپنے فیصلے کی عکاسی کا احساس ہوا۔

ہر دیلے تانگن یار دیاں
میں تاں بیٹھی کاگ اڈاواں

وہ دونوں قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں رو بہ شرمی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ان دنوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا..... میری سانسیں اُبھرتی تھیں، ڈونگی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ شمع کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گر جاتا تھا۔

زریاب.....

میں پاگلوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی چکر لگایا کرتی۔ ہر آہٹ مجھے اس کے آنے کی خبر دیتی اور اسے ناپاک کے مارے جھنجھلاہٹ کے میں شرمی

ہواؤں سے لڑ پڑتی۔ آپ دیکھاں کہ میں قاصد دیکھاں
میرا تھی گیا حال نماں

فیروز لا لارے جرح کر کر کے میں نے زنج کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

”کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں ورنہ غلا یا کہ زریاب گدے سے جھگڑا ہوا بھانے میں ساری غلطی میری ہے۔“

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آ کے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا ہلکا سا

انڈیہ بھی مجھے بے جان کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں آس ہار کے بے دم ہونے لگتی تو کانوں کے پاس کسی کی سرگوشی یہاں سے وصل بڑھا دیتی۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
بے میں کھ نامی دلوں موزاں

میں ہرندشے جھٹک دیتی۔

”نہیں نہیں میرا زریاب مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتا، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں ہے۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔؟ پھر وہ آیا کیوں نہیں ایک بک؟ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کیسے امتحان ہے؟ کیا اسے کسی سے اطلاع ملنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو کہتا ہے۔۔۔۔۔ مومن تجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔۔۔۔۔ میں گہری نیند میں محسوس کر لیتا ہوں تو نے کب کروٹ بدلی۔۔۔۔۔ پھر اسے پتا کیسے نہ چلا کہ وہ چہرہ۔۔۔۔۔ جسے دیکھ کے اس کی صبح کھرتی ہے۔ اب دماغ رہا ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ سگ رہا ہے اس کے پیار بھرے مہم کے بے ترس رہا ہے۔ زریاب۔۔۔۔۔ زریاب۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔۔۔“

ہاں میں جی بچ دیوانی ہو گئی تھی۔

کلی کر کے چھوڑ دو اے

تے نیچی ککھ گھیاں دے رولاں

مجھے نہ بھوک لگتی۔ نہ پیاس محسوس ہوتی۔ اپنی صفی کی بچی کی ہرک سمجھی سمجھی لہریں کے پورے وجود پہ چھا جانی مگر میں متا کو تھک دیتی۔

”مہر۔۔۔۔۔ کس کچھ دیر اور۔۔۔۔۔ وہ آتا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ مجھے انصاف دلانے۔ وہی تو ہے جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے۔ نہ صرف جانتا ہے بلکہ مانتا بھی ہے۔۔۔۔۔ بس وہ آجائے پھر میں پوری شان سے وہاں لوٹوں گی، اپنے گھر۔۔۔۔۔ اپنی بچی کے پاس۔۔۔۔۔ بس وہ آجائے اس کے بغیر نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بغیر میں کیا ہوں۔۔۔۔۔؟ کچھ بھی نہیں وہ آئے گا میں سرائھا کے اس حویلی میں جاؤں گی پھر کس کی مجال ہے جو مجھے نیرجی آنکھ سے بھی دیکھ لے۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ آئے تو کسی۔۔۔۔۔ وہ کیوں نہیں آتا۔۔۔۔۔؟

”خان زریاب آگئے“

میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں رستہ دیکھتے دیکھتے جب کسی نے مجھے یہ اطلاع دی تو میری پلک تک نہ جھپک سکی۔

”آ گیا۔۔۔۔۔ زریاب۔۔۔۔۔ آ گیا۔“ میں ننگے پیراٹھ کے بھاگی۔

”مومن۔۔۔۔۔ رکو۔۔۔۔۔ وہ یہیں آئے گا۔“ لائٹی نے پیچھے سے پکار کے مجھے روکنا چاہا۔

”مردانے میں اس وقت نہ جانے کون کون ہوگا “رک جاؤ“

لیکن میں کیسے رکتی، بخار کی حدت سے تپتے میرے ننگے پاؤں ٹھنڈے کیے فرش پہ جھلس جھلس کے پڑ رہے تھے۔ میرے کئی دن کے بکھرے روکے بے ترتیب بال اور بھی اُڑ گئے۔ میرے اس طرح بھاگنے سے بے پروائی سے سر پہ ڈالی چادر بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ حجرے کے پاس میرے پاؤں کے انگوٹھے میں چادر کا کونا چھنسا اور میں منہ کے بل دروازے پہ گر گئی، وہیلز پہ ایک اکھڑا ہوا کیمبل میرے ہونٹ پہ لگا اور دور تک نازک ماس اوھیر گیا۔ میں پاؤں سہلاتے ہوئے چادر کا کونا لبوں پہ رکھ کے خون دہا رہی تھی کہ اندر سے زریاب کی آواز آئی۔

”مومن کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟“

مجھے ایسا لگا جیسے اسے کھدے مایاں بیت گئی ہوں۔ میرے اندر کی اداسی کو اس کی آواز نے اور بھڑکا دیا۔ اٹھنے سے پہلے میں نے درو کی شدتیں دباتے ہوئے بڑے اشتیاق سے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنا چاہا اور۔۔۔۔۔ میں دھک سے رہ گئی۔ فیروز لالہ کا گر بیان زریاب کی گرفت میں تھا اور اس کی رائفل کا رخ لالہ کے سینے کی جانب۔ اس وقت لالہ کے چہرے پہ بھی وہی بے یقینی تھی جس نے ایک ایسی مجھے جکڑ کے بت کر دیا تھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا میری بیوی تمہارے پاس ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ اندر۔۔۔۔۔“ لالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زریاب نے اسے ایک زور کا جھٹکا دیا، اس کی آنکھیں جوش سے باہر ابل رہی تھیں وہ مجھے بالکل اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ ہاں بالکل اجنبی اتنا اجنبی تو وہ مجھے تب ہی نہ لگا تھا جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اسے بروقتی لائے ہو یا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے؟“

”میں کیوں بروقتی کروں گا؟“ کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بھی لالہ نے محل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی۔

”وہ اپنی خوشی سے، اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔“ اس کے اتنا کہتے ہی زریاب آپے سے باہر ہو گیا۔ رائفل کے بٹ کے زور پہ اس نے لالہ کو نیچے گر دیا۔

”بے غیرت کتے“ یہ اعتراف میرے سامنے کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آ رہی۔ اور کہاں ہے۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ ناگن وہ بے حیا۔۔۔۔۔ بے وفا عورت۔۔۔۔۔ کیسینی

نسل کی عورت..... جسے عزت راس نہ آئی..... بلا اسے..... اس کے سامنے میں تیری لاش گراؤں گا..... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی ”خوشی“ اور ”مرضی“ سے آئی ہے اور اسے..... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا..... بے وقافی سہی ہے تو میری بیوی..... اس کے نام کے آگے میرا نام لگا ہے، اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں گرے گی..... میں اس کا خون بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا..... وہ کیا سمجھتی ہے میرے جیتے جی دوسرا بار ڈھونڈ نکالے گی۔“

”زر..... یاب.....“ آنکھیں بھاڑ کے اس کے زہرا گلتے لہجے پر غور کرنے والا فیروز لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

”زر یاب..... ہوش میں رہ کے بات کرو.....“ وہ دونوں کچھ گٹھا ہو گئے..... میں اسی طرح سنگی مورچہ کی طرح جیسے دلہیز پر نصب، گر نے اٹھنے کے سے انداز میں اندر بھاگتی رہی..... مجھے زریاب کے ہلاکت میں ڈال دینے والے جملے بھی سنائی دیے تھے اور فیروز لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر برہمنٹا بھی دکھائی دے رہا تھا..... لیکن میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی..... میرے ہونٹوں سے خون لچک کے لمبی میں گر رہا تھا اور پھرانی ہوئی ہے یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے مٹی میں جذب ہو رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں بل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں گی..... اچانک فائر کی آواز نے مجھے ہلا کے رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا..... لرزتی ناگوں بے ہشتے ہوئے میں نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرتے دیکھا۔

حجرے کے دوسری طرف سے بہت سے مجھے ہاتھ قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا..... میں نے زمین پہ گری چادر اٹھائی، اپنے گرد لیٹیں اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔“

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود..... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر رہے..... لیکن..... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے، ننھے ننھے ستارے پر وئے ہوئی ٹپکیں بند ہو گئی تھیں..... بچپوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں جان ظاہر کر رہی تھی۔

”پھر.....؟“ خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی المناک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اتنی تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی جستی کی

زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک عجیب سی نگاہ اور ادا سی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سر آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر سے خاموش ساکت لیٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی ٹپکوں میں خفیف سی جھنپ پیدا ہوئی۔

”پھر.....؟“ پھر بیس سال..... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں اور کوئی نہیں..... نہ زریاب..... نہ فیروز لالہ..... نہ مقدس..... نہ کوئی اور..... بس میں ہی میں..... بلکہ شاید میں بھی نہیں نہیں تھی..... بس یہ بیس سال تھے..... خالی..... تنہا..... کیلے..... بیس سال..... ان کا کیا بتاؤں تمہیں..... تم جانتا چاہتے تھے وہ میں نے بتا دیا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا اور اس کے اور لائی کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، خوشنود نے سہارا دے کے اسے بٹھایا۔

”خوشنود..... اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارا باپ بے موت ضرور مارا گیا لیکن بالکل بے قصور..... وہ مجھ تو کچھ گندھا آدمی تھا۔ جہاں جاتا رشتے بنالیتا یہی رشتے اسے ڈس گئے..... زریاب نے اس کے جذبوں کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا تھا..... خلوص اور موت کی موت ہوئی تھی، سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ شخص مجھے تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز نہیں..... اس لیے بھی کہ اس نے مجھے بہن کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لئے بھی کہ میں زریاب کی بیوی تھی، اس زریاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس زریاب نے ہی.....

میرے سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی ہے، جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نبانے زریاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کے بھی سب کو یقین دلا دوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی..... صرف اور صرف بھائی۔ تم..... تم تو یقین کرتے ہو ناں میری بات کا۔“ اس کے سر ہلانے پر مومنہ نے سکون سے سنجے پر سر ٹکا دیا۔

”تو تمہاری تسلی ہو گئی اب۔“

”لیکن.....“ دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔ اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کر بیچھے چلا..... مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ

اٹھ بیٹھی اس کی بچی بچی آنکھیں ہلکے نیلے شلوار قمیص اور سفید بڑی سی چادر میں ملبوس اس کم عمری ”مومنہ“ پہ جچی تھیں جس کے چہرے پہ اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی دیرانی تھی، بھٹی کا اس بستر پر بڑی ”مومنہ“ کی آنکھوں اور چہرے پہ تھی۔

”لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ میری..... یعنی مقدس زریاب خشک کی..... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں..... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی دررگ کا پناہ ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خشک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خشک جو آپ کا شوہر ہے..... اب بھی..... ابھی تک..... آپ..... آپ..... مومنہ علی..... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ مومنہ ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کرتی تو تب بھی اسے سینئر ننگنا مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی..... وہی سنہری رنگت..... ہلکے ابروؤں پہ قتار کے ساتھ بے وہی مجھورے تین تل..... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے..... اور وہی نیلی کانچ سی حلی وحلی آنکھیں۔

”یوں لگتا ہے جیسے نایم کے ٹکڑوں کے گرد کسی نے ہیرے چور چور کر کے بکھیر دیئے ہوں۔“ اس کی پلکوں پہ نیلے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے پہلی بار روتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سسے باز واپسی پٹی کے لیے جھیلنا دیئے۔ اس کا دل اچھل اچھل کے پسلیوں تک پہنچنے لگا لاپی لاڈلی کو چھپائی سے سونے کے لیے، لیکن..... لیکن وہ دل خود ہی حیران سا ہو کے رک گیا..... وہ بازو خود ہی پٹیمان سے ہو کے گود میں دو بارہ آگرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورتے پایا۔

”تو تم بھی..... تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے..... آہ..... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خون بھی مجھے بے اعتبار جانے گا۔“

”میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن.....“ اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

”لیکن یہ آدھا سچ ہے..... سچ کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ سچ کی مصلحت پسند نہیں ہوتا۔ سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا..... سچ گور پوٹھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہہ رہی تھیں ناں

ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلا دوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر..... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو جوتھ میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی دار میں اسے سمار کر کتنی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا..... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی..... آپ فرار ہو گئیں..... کیوں..... کس لیے؟“ وہ ہنست ہنست۔

”نیکمک میں جانے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں“ مومنہ نے سر کوئی کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہی سن سکتی تھی۔

”آپ بتائی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ خود چھپنا پڑا؟“

”کچھ نہیں.....“ وہ ضبط نہ کر سکی اور اتنی گفتگو کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے زس کو تھیل دی اور اسے سرے میں پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

”کس مقدس..... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ یہ کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سہہ سکیں۔“ اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ دارانہ سی رائے دی۔ جسے ان ہی کرتے ہوئے مومنہ مانچتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس کے ہاتھوں مر کے اس کی جوتھ غیرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں..... میں تین دن تک بھوکی پیاسی صرف اس کے انتقال میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ نکتی رہی۔ وہ آنے کا چڑھتا ہوا آگے گا..... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا..... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ..... اور وہ آیا..... مجھے ایک نیاز خیز دینے کے لیے۔ میری رہی سہی جان ہٹا لے کے لیے..... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے..... میں سہہ جانی؟ بناؤ میں ایسے ہی سہہ جانی؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھ کو کرنا چاہیے تھا..... ایک باری ہوئی..... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا..... میں نے..... میں نے.....“

اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

”میں نے وہی کیا..... بالکل ٹھیک کیا..... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ غر حلال ہو گئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ

چاپ لائے قدموں باہر نکل گئی۔
 نرس نے کچھ ہی دیر میں مومن کو پر سکون کر دیا۔ آکسیجن کی مالی اور مصنوعی دھڑکنوں
 کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی
 الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رہ رہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک
 سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پہ ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی
 بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھوپھی جان بہتا تھا
 لیکن..... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ سمجھ میں آنے
 والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ جاتا؟ زریاب کو تو قانون نے سزا دی تھی۔ یہ الگ
 بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو عقر قد میں بدل دیا تھا لیکن پھر.....
 وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”نی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔“
 اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ
 اسے اٹھا کے اس ہسپتال تک لایا تھا، اس کے بعد اس کا نہ صرف بچ جانا بلکہ پورے
 ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گفتگو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی ہوگا
 اگر مومن ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہ لے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے گزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے
 بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھے جاتی۔ اس کی ذوقی بھینس اور رکتی
 دھڑکنیں خوشنود کو فکر مند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے وہ پھر سے خدا سے زندگی
 مانگ لاتی۔ شاید وہ خود بھی کسی کے دل میں اپنے لیے بدگمانی اور خدشہ سمجھو کر مرنا نہیں
 چاہتی تھی۔

”تم..... تم خوشنود..... تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟“ ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال
 کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف
 تھا۔ ”بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی
 تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ
 کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ
 دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا

آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا سا
 بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔“
 ”میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت
 دیکھ کے کبھی کچھ محسوس نہ ہوا۔“
 ”ہوا تھا..... بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔“ وہ کھو یا کھو یا سا سانسے رکھے پھولوں کو بے
 دھیانی سے تک رہا تھا۔

”تمہیں تو اسے دیکھنے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔“
 ”میں نے کہا نا.....“ وہ خود کو کبھی بھلا چکا تھا۔
 ”میں نے کہا نا میں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں..... اس سے جتنا تو
 کہیں جاتا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور..... وہ سامنے ہو تو پھر مجھے
 بس.....“ خوشنود..... مومن نے یقینی سے پکار بیٹھی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں جھٹک
 پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ نفث سے اس کا گندمی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر
 اسے دیکھتی رہی۔

”خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سامنے لے آؤ مجھے
 اسے کچھ کہنا ہے..... اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں
 رہی۔ وہ کہانی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیے
 ہیں۔ مجھے اب ہر کردار کا حق پورا کرنا ہے اسے بلاؤ۔“
 ”نہیں پھوپھی جان“ اس نے اپنی معذوری غماہری کی۔

”آپ میرے لیے قابلِ احترام امی لیکن میں کیسے بھولوں کہ وہ خان زریاب ٹنک
 کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے سامنے جانے پہ مجبور مت کریں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔“
 ”وہ صرف تمہارے ذہن کی بیٹی نہیں تمہاری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری
 پھوپھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلونی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم
 اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔“

وہ چپ چاپ نہر پیش کرنے لگا۔
 ”نہیں ڈاکٹر خوشنود..... میں نہیں آ سکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اتنا بھڑکایا،
 اس کے مل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب
 نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا،

میں کبھی انہیں اپنی ماں حلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کردینے والی راتوں اور محرم جاڑوں کا حساب چاہیے۔“

”خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔“ اس نے منہ پر ہونے لگے میں کہا۔

”جی..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مس مقدس کہ آپ حلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو ملاحظہ نہیں سکتیں کہ دہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اگلی دلاہو نے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فراموش تھے کیا نہیں، اس بحث میں پڑنے کا کافی الحاح وقت نہیں ہے۔“ اس نے صاف صاف کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اندر مقدس دہاں موجود تھی۔ اس نے کمر کا نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ کے اشارے سے روکنے کے لیے کہا۔

”مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں اپنی ماں کے خلاف اتنا زہر بھرا دیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگنا کوارا نہ کیا۔ میری باتیں بھلی رہ گئیں اور تم..... واپس چلی گئیں۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں زہر ہے نہ ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک۔ آپ نے خود پہنچ بھی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی تائیں گی میں اس کا یقین کر لوں گی لیکن آپ بتائیں تو سہی..... مجھے جواب تو دیجئے کہ مجھ سے..... میری ذات سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اتنا بھیا کر رکھا۔“

”مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا میں صرف خود سے خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پر حاوی نہ ہو جائے۔“

”اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟“ وہ بے بسی کی گرنے کے انداز میں نزدیکی کر ہی بیٹھ گئی۔

”میں آپ کی یہ بہم بائیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھودینے کا حال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تھیں۔ کبھی میرے لیے نگر مند نہیں ہوئیں؟“

”میں نے تمہیں کھوپا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی

ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے ادھل ہوئی تھیں پھر مال کس بات کا۔ ہاں کلمک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی بیٹے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنی ماں ہیں۔ اپنے باپ کے گھر..... اپنے خاندان کے ساتھ..... ایک مضبوط چھت کے نیچے۔“

”بونہد..... اپنے..... وہ اداسی سے منکرا لی۔

”میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکر کیں کھاتے گزارے ہیں۔ عمر کا آدھا حصہ..... ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ماں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے بیکرا انجان رہتے ہوئے گزارا۔ بہت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، لوگ پیدا آئی جیم ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں..... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر.....

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پر موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی وہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد ہیں پھر کیوں یہ خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیں؟“ میں آزاد کب تھی..... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ سیاہ کیسے ہوتے ہیں..... میں بھی نہیں جانتی تھی..... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں پایا پھر..... پھر میں خود بھی جانتے تھی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے..... اس کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو..... تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

میری جڑیں بھی ایک دم زہر پڑی ہو گئی تھیں..... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا۔“

”کیا؟“ وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھیان اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ ”اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالاسک نے کیا۔ نفرت نے..... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پتھر میں بھی خوشبو بھر دے اور نفرت..... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ مجھے بھی مٹیوں کی ماری کھلسا کے سراپا شعلہ کر دے میں نے اس نفرت کو سنبھال کر رکھ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ مٹی میں کمزور بنا دیتی ہیں نا..... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بنا چاہا، اتنی سنگدل بنا چاہی تھی میں کہ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

”کر زریاب کو سزا سناتے ہوئے میرادل نہ کا پے۔“
 ”مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔“ اب تک اقلیت بیٹھا خوشنود کہہ اٹھا۔
 ”ہاں..... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی..... لیکن..... زریاب قاتل نہیں ہے۔“ مومن نے کہا۔ ☆☆☆

”کیا کیا تو نے حضری؟“ بی بی جان نے اپنے گورے، پھولے پھولے مگر گہری لکیروں سے بھئی خست پھٹی والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔
 ”زندگی میں سب کچھ ”بھرم“ ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ ”بھرم“ اتنی کھوٹی جھپٹ..... اتنی ہلکی چادر..... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر کچھ فقط اسے سلامت رکھنے کے لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں تک یہ کھیل جھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بی بی کی محبت نے یہ سب کرنے پر مجبور کیا لیکن پھر..... پھر کیا ہوا..... نہ بی بی رہی..... نہ اس کی خوشیاں..... بیٹا بھی نظروں سے دور ہو گیا..... اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے سال تسلسل سے یہ تماشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو ہلکا کرتی میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے، لیکن وقت سے بڑا جاہل اور کون ہے..... منوا ہی لیا مجھ سے سب کچھ..... اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو کیوں بے کار ترقی زندگیاں برباد ہوئیں۔“

مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے گرنا ہی تھا تو کیوں بے کار ترقی زندگیاں برباد ہوئیں۔“
 وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دینے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افسانہ ساز اور دراب کی ملامتی نظروں کی وہ تاب نہ لاسکیں۔ پچھلے کئی ٹھنوں سے وہ اپنے اندر جبرے کرے میں اپنے زندہ رہنے کا کوئی جواز ڈھونڈ رہی ہیں۔

بے شک ضمیر نے نہ کوڑا آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیس سال تک ان کا ضمیر دل کے کسی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چنگیاں بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چنگی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب بندوق لہرا تا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھیں زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مومن کا پتا صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے بختوں اہل کے سامنے اس کی بیوی کے

خود ساختہ معاشقے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک ”خانوادہ“ ہی جسے غیرت سے آگے کچھ سوچتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوچا۔ اب بھر میں جان سے عزیز بیوی اور قابل اعتبار یار کے خون کا پیاسا بن گیا اور یہ پیاس اسے بھانسی کے تختے تک لے گئی۔

زر سا گلہابی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ وہی حالت تو اس کی دن بدن کمزور ہوتی ہی جارہی تھی یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے بھرغم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھا اگے تھے جب ان کا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو فاج کا پہلا حملہ ای ہی ہوا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بی بی کی اچانک موت یہ سب حادثات انہیں ہلتر تک کا ہی کر گئے۔ برسوں سے وہ اپنے رعب و دہ پہ والے اونچے لمبے خان جی کو ہسپتال میں مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو جھوٹ بول دیا تھا وہ بھانا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ کیا فیروز زندہ ہو جاتا؟ زریاب آزاد ہو جاتا؟ یا زمرانگہ لوٹ آتی؟ وہ چپ چاپ اس چنگیاں بھرتے ضمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس..... اس کی صورت ایک مسلسل عذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومن کیا کم سزا تھی ان کے لیے..... اس کی صورت انہیں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا جھل جھل کے رونا ان کے دل میں کچھ کے لگتا۔ ہر کرے میں گھٹنوں گھٹنوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ دونی صورت کی بیٹی نہیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑچاہیں اس کے سامنے کم سے کم آتیں۔ مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ سے مومن کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے مگر زریاب کی کوئی بیوی یہاں آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومن کے بارے میں وہ ہی جانتے تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

دراب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی اور سنہری رنگت والی، بلوری آنکھوں والی بھابھی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلط فہمی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تینچا اکثر لوگ یہی جانتے زریاب کی بیوی کوئی ”مہم“ تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں ممنوع تھا۔

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو یکسر فراموش کر دیجے اگر..... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔
اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئیں اس
کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتیں ایسا لگتا جیسے مومنہ سامنے آ کھڑی ہو اور کہہ رہی
ہو۔ ”کیوں؟ بی بی جان کیوں؟“

”آہ کیوں؟“ وہ خود کو کہنے لگیں۔ ”کیوں میں ایک مومنہ کے بعد دوسری مومنہ
سے کھینچ رہی۔ کیا اس کی ماں کا نہیں بھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس
معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا
بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آ جائے۔ ہائے حضرت! تو نے کیا کیا..... کیا زریاب کا
اس کی نسل کا اس خاندان پر کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رہ گئی تھیں تیری
بیٹی پر قربان ہونے کے لیے۔ تیری جد سے وہ در بدر ہوا، اس کا گھر اجڑا، اس کی بیوی رسوا
ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو کچلتی رہی تمہاری کھسپائی ہوئی اُنا۔“
وہ انھیں اور خان ارباب خٹک کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خٹک کے ضعیف چہرے پر یہ اس
وقت اطمینان چھپا ہوا تھا۔ ان کا زہری رکوں والا لانا ہاتھ ابھی تک زریاب کے ہاتھوں
میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ دلوں کا تھا تو وہ جھکے جھکے قدم چلتی ان کے
سر ہائے بچہ لگتیں۔

”خان جی!“ انہوں نے سرخی مائل آنکھیں جھکائے جھکائے عرض کی۔
”خان جی! مجھے معافی دلائیں، مجھے زریاب سے معافی دلائیں خان جی..... ان
کے لہجے میں اتنی عاجزی تھی، اتنا کرب تھا کہ وہ تپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔
”بی بی جان! مجھے گناہ کا رمت سمجھئے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت
کھڑی ہوں کیوں مجھے میری ہی نظروں سے گرانا چاہتی ہیں آپ؟“ اس نے شانوں سے
تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔

”نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے لگ نہیں یہ میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں
نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے مال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن
معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب۔ تم مجھے معاف کرو، مقدس مجھے
معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی مالتیں سبھی نہیں جاتیں۔
نجانے مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی اس وقت۔“ زریاب چپے کسی خواب سے چوٹا تھا۔
”ہاں..... مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی..... تم کہاں ہوگی مومنہ؟“

”وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں
ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو نہانے کتنے خواب آنکھوں میں سجائے اس گھر میں
سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی..... اپنے دل
کے ایک ایک ٹکڑے کی..... میں نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔“

”نہیں بی بی جان.....! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں
کسی کو قصود و اثر نہیں ٹھہرا سکتا۔ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا تھو خود میرا
ہے میری بے اعتبار محبت کا۔ بلکہ آپ تو مومنہ کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم
میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈبے۔ اپنی بیٹی کی تمام تر
عز و دیوں کا سبب بھی میں ہی ہوں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی
دیتا ہوائے اپنے۔ یہ میں ہی تھا بی بی جان..... یہ میرا کمزور خُلق تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا
سارا نہر نہر سہہ سکا۔ آپ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان..... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس
سے..... مومنہ سے.....“

”زر..... تم نے..... حضرت! کو..... معاف..... پڑنا..... اپنی بہن..... بہن کو.....
بھی.....“ باچا جان نے اسے متوجہ کر کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
”ہاں زریاب..... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور
کرلو..... اس کی روح کو بچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کرو۔ اس کی بخشش کے لیے
دعا کرو۔“ بی بی جان نے التجائی۔

”میں نے کہاں بی بی جان..... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔
اس دل میں اپنے ہی ملال اس قدر ہیں کہ..... وہ بات ادھوری چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اندروادھوری و گدرا ہندا

پانی درد حیاتی دا

”(اندروہی اندر کہیں بہتا رہتا ہے زندگی کے درد کا پانی)

”اور یہ درد تو میں نے خود دھماں کیا ہے..... یہ بچھتاوے تو میں نے خود آگے بڑھ
کے خریدے ہیں۔ وہ سارے عہدہ و سارے پیمان میں نے ایک ہی بل میں بھلا دیئے مجھے
کچھ بھی یاد نہ رہا۔

اس کے صبح چہرے پر نور کا وہ ہالہ

اس کے کھمرے سے لہجے میں کو کتنے وعدے

اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

اور اپنا وہ وعدہ..... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔“ اسے یاد آنے لگا۔
 ”میں تان دوزخ سڑساں
 بے میں کھ مای و لوموڑاں“

اور میں نے کھ مولا..... کس سفاکی کے ساتھ..... کس بے دردی کے ساتھ اور کس
 بھدے پرن کے ساتھ۔

سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جنون خیز عشق
 کی ہر ہرادی کی راز دہائیں..... وہ جہر جہر جاتی زریاب اسے نکلے جاتا۔
 آئینے کے سامنے چل دوپل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل
 اور کستی ہوئی اکائی اکائی کی مومنہ.....

”آف یہ بال، کتنی کتنی تھی میں تانی سے بال گندھوا کے دو دودن فکری نہ ہوتی تھی
 اور اب.....“ وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی۔

”تہہ رانی تھی فی فرمائش..... مینڈھیماں مت کرو..... بال کھلے چھوڑو..... وغیرہ
 وغیرہ..... بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟“

”کیا کہا؟ پھر سے کہنا“ کیے پر سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اٹھ
 بیٹھا۔ ”مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہو گا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی
 اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں ہی من کے چال پھیلا دیتی تھیں سر پر اور اب بھی
 کون سا میری ”نئی نئی فرمائش“ پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری
 پسند کے مطابق ڈھیلے سے بل والی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کس کے یہ دوسینگ لڑکا لیتی
 ہو۔“ وہ اس کی دو چوٹیوں پر تنقید کرتا۔

”کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر دیکھنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں کی عادت جو ہے لیکن
 رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں صیب۔“ جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی
 تو اس کے چڑنے کے باوجود اسے ”صیب“ کہہ کے ضرور پکارتی۔

”سنو!“ اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہٹنے دیکھ کے۔
 ”تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔“
 ”کیوں؟“

”اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی ”دودو“ بار دیکھنا۔“ اس کی وارفتگی پہ اس کے
 مین شہد پڑکانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلا اس درجے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھ کے
 عبادت کرنا مومن کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی بچپن
 کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس
 درجے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا نہیں
 آتا، اسی درجے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسٹوڈیو کی پچھلی طرف کھلتا
 ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسٹوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس
 کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے پیٹ
 سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی
 میں پتھر کا ڈنچہ آج بھی موجود تھا لیکن اس پر جاسن کے گہرے گہرے رنگ والے چوں کا
 سایہ نہ تھا۔ ایک ننڈ منڈ سارخٹ افسر وہ سا بھانک کے نچانے کئے ڈھونڈ رہا تھا۔ بیچ کے
 ساتھ ابھی بھی تھار میں وہ گملے لگے تھے لیکن نہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ موتیا۔ وہ تھکا
 تھکا سا اس گرد میں اٹھنے بیٹھنے گیا لیکن اگلے ہی لمحے تپ کے اٹھا تھا جیسے یہاں، اس
 مقام پر بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہوگئی ہو۔ اسے یاد آیا، مومنہ کا صبح کی اولین
 ساعت جیسا یہی پاک اور معصوم سا چہرہ..... سفید سوتی دوپٹے میں لپٹا ہوا..... وہ سبیل اسی
 بیچ پر بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سارے بیٹھا عقیدت سے اسے نکالا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے لگتا ہیوں کو..... بل بل کے پڑھتے ہوئے
 کانوں میں دھڑکیں ہاںوں کو.....

جھکی ہوئی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سامنے کو.....

سورج کی کرنوں سے دمک آنکھیں والی ناک کی لوہنگ کو.....

پیشانی پر آویزاں اس پر نور سے عکس کو.....

کیوں.....؟

کیوں.....؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو.....؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی
؟ کیسے یقین کر لیا میں نے کہ مومنہ..... مومنہ اور فیروز..... کیا یہی تھا میرا عشق یہی تھی
 میری محبت.....؟ یہی دعوے کیے تھے میں نے..... اتنی بڑی محبت..... اتنے کھو کھلے
 عہد..... میں جو خود کو بڑا روشن دماغ تعلیم یافتہ، لکھا ہوا اور تجویر شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو
 اس سارے روایتی اور دنیاوی سیٹ اپ میں انجینی تصور کرتا رہا۔ اصل میں کیا نکلا؟ ایک
 جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد..... جو کسی تیسرے شخص کی بے سرو پاتوں پر بغیر

کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے۔۔۔ جو غیرت اور امانا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبول کے پر نچے اڑا دیتا ہے۔ اور۔۔۔ جو۔۔۔

”خان صیب۔۔۔ خان صیب“

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر خود کو کھیرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر بار تار ہتا کہ اورنگزیب کی آواز یہ چونک اٹھا۔ اسنو دیوے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں ٹھوم ٹھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اورنگزیب؟“ اس نے متوجہ کیا۔

”وہ۔۔۔ خان صیب۔۔۔ بڑے خان جی۔ اپنے باپا جان گزر گئے۔“ وہ دھاڑیں مارنے لگا۔

☆ ☆

”لیکن زریاب۔۔۔ وہ قاتل نہیں ہے۔“ مومنہ کے اس انکشاف نے خوشنود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔

حیرت کا ایک ریفلیکشن تھا جس نے ان دونوں کو یوں غمزدہ کر دیا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

”ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن۔۔۔ صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو۔۔۔ مجھ سے پوچھو کہ اس کے ذہن کا ہاتھوں پر کس کس کا ہلو ہے۔۔۔ مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سو لی چڑے ہیں، کتنی آرزوئیں سک سک کے فنا ہوئی ہیں اور کتنی جھوٹوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ سوائے میرے۔۔۔ اس لیے۔۔۔ صرف اس لیے میں نے۔۔۔ اس کی بار بار اپنی زبان تھک کے رک گئی۔“ آپ نے پہلے اسنے جھوٹ کیوں بولے۔۔۔ وہ ساری جھوٹی کہانی۔۔۔ خوشنود نے سر سے سے غصے میں پیش کیا۔

”نہیں۔۔۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی، میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے ہوئے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ کچھ پردے پردے رہنے دیئے تھے۔“ وہ الزام سہہ نہ سکی، اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں ہی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بلند تھی اور واضح بھی۔

”میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ۔۔۔ سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور محبت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بجھ سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، مہتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں۔۔۔ عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت۔۔۔ جس نے عزت کو محبت سے ترجیح دی ہو، پہاڑوں لے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن سے ہی اپنے جیسی سر بلندی اور چٹکی عطا کر دی ہو، جو تنہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سرائف کے ایک عمر بھر کی ہو۔ میرے ہاں میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی، میں خود پر اٹھنے والی نگاہ جسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پر اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی خود سراسر غیور، بخار، کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس ماموس پر مرنے والی عورت کو سلا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے شمار میں سرشار میں ایک نامعتبر سی زندگی گزارتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنزیہ اور تذلیل میں ڈوبے فترے میرے کانوں تک آتے لیکن ہلکی دستک دے کے لوٹ جاتے، وہاں زریاب کے کہے بیٹھے بولوں کا شور ہوتا تھا۔

اس کے خاندان کی نفرت انگیز اور فحاشات آمیز نظریں مجھ تک اٹھیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بجھتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے سکرانے چہرے اور جذبے لٹائی نظروں کا ست رنگا پردہ بڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے بولوں میں وہی زہر آتا۔۔۔ جب خود اس کی آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹتی۔ اس دن۔۔۔ اس بل۔۔۔ میرے اندر کی وہ پہاڑوں پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کس طور نہ بھل رہی تھی۔“ وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حیات کو اٹھنے مستعد

رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا، مسلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح..... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”ز..... یاب.....“ فیروز دھاڑا۔ ”ہوش میں رہ کر بات کرو۔“ اگرچہ وہ اس کی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے تھے کیا جس نے اس کا اپنا عمل برقرار نہ رکھ پایا۔

”ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی وٹے ٹے کے ساتھ..... تمہاری ایک نہیں دودھ نہیں تمہارے سرال بیابی ہی تھیں اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ راستہ اپنایا۔ تمہیں تو صرف عیاشی کرنا بھی پھر چاہے وہ تمہارے اپنے ہی دوست کی بیوی کیوں نہ ہوئی۔ اور وہ..... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہے تھی تمہارا اگر دودھ عاشقوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا؟“ میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تم اپنے ہوش میں نہیں.....“

غصے کی شدت سے اس کی آواز کا پڑی گئی۔ لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ یہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا وہ بولتا رہا۔

”تم نے چند ہی منٹوں میں سارا کھیل سوچ لیا، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے اس کی شادی کروا تے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور مومنہ سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔“

”بس..... بس کرو اپنی یہ بکواس دور نہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا میرا کیا رشتہ ہے۔“

”تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت تھی۔ آج یہ راز کھل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا کہ تم نہ وہ..... نہ تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔“

”گھٹیا تم خود ہو اور مکروہ تمہاری سوچ ہے۔“

”اور تم دونوں تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہو۔ وہ بد کردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اسی کی چھت کے نیچے اپنا بار بھولا کے عشق کے تماشے کرتی رہی اور جب بھانڈا پھوٹا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔“

اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی

لڑکھڑاسا گیا۔

”یہ سب بکواس کس نے کی تم؟ تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کسی طرح اور کس حال میں آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے اسی نے مجھے بلوایا تھا مگر.....“ زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بندوق تان لی۔

”میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتر گواہی اور کوئی نہیں۔“ چانک فیروز لالہ اس پہ پل پڑا۔ وہ اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

”اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بہا دیتا۔“ اس نے بندوق کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑتے اور میں اسی طرح نیچے نیچے کی قسم یہ تکلیف دہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں جلا کے لالہ سے کہنا چاہتی تھی۔ ”بھادو اس کا خون..... مت پروا کرو یہ تمہاری بہن کا شوہر ہے..... یہ میرا شوہر نہیں ہے یہ..... یہ تو چانور ہے..... چانور..... جس کا شعور فنا ہو چکا ہے۔ جس کے اندر سے ہر جذبہ مٹ چکا ہے اب تو یہ سرے سے تیریک چانور ہے غلطی وحشی اور درندہ چانور..... اور کوئی درندہ میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔“

لیکن میں جلا نہ سکی۔ میں سکتے کے عالم میں تھی۔ ایک ایسا سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے، روح کو سب سنبھالنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ میں سب دیکھ رہی تھی سب سن رہی تھی، صرف سمجھ کر نے کی قابل نہ رہی تھی۔ کاش..... کاش یہ سکتہ مجھے مکمل طور پہ جکڑ لیتا..... میں کچھ دیکھ نہ پاتی..... کچھ سن بھی نہ پاتی۔

”اب تو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔ وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں..... وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں..... زریاب مسلسل اپنے زہر لیے خیالات سے اسے اور بھڑکا رہا تھا۔ فیروز لالہ نے اس کی بندوق چھین کے اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک بندوق اپنی طرف کھینچنی شروع کر دی۔ اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دہلیز پہ گرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھمی گئی۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی۔ میں نے ان آنکھوں میں ٹھنکت..... اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔ شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے

سامنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور پڑنا دکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔ میرادل اچھل کے قلع میں آگیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ پہنچ کر طرف ہٹھلے ہوئے دیکھا، عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ کے اس نے فائر کر دیا..... اور..... اور میرادل قلع سے چسل کر کہیں نیچے..... بہت نیچے گر گیا۔ میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا..... غبرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے..... زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ پھڑپھڑا اٹھا تھا کیا بھائی کو گالی دینی تھی..... وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہہ نہ پایا، شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔ لالہ خون میں لت پت نیچے پڑا تھا۔ موت نے اسے ایک لمبے میں ڈھانپ لیا تھا۔ لوگوں نے بندوق پکڑے زریاب کو ہر طرف سے جکڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

”چھوڑ دیجئے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دیجئے۔“

”تم نے ہمارے صوب کو مارا۔ مارو یا اسے۔“ ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندر دینی جیسے کی طرف دوڑے۔

”ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود کہا رہا ہوں میں نے مارا ہے اسے۔ اسے مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔“

”میں بدزل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگوں گا، مجھے چھوڑ دو ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔“

میرے اندر جیسے ایک زور کا پھجر آن گرا اور پھر سے میرے اندر جان پڑ گئی۔ میں نے سن ہوئے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ نے مجھے ایک نئی راہ بھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا، اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا ہے اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر و عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں..... میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے

ہی سب سے بڑا منصف..... جتنا یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے مٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے چھتھی طرف تندو کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لالائی کو میں نے منوجے کی بازو پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیرونی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں بچے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ”لالائی..... لالائی بہن.....“ قالے کے کھنچے پودوں کے پیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ڈرا سی سر کا اس نے اپنی دھشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔

”مومنہ..... تم اور.....؟“ میں اس کا ہاتھ تھام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی۔ اس کی سر اسمدہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے پینے نے اس کی اندر کن خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اور اندر تھا..... کہاں ہے تمہارا لالہ..... وہ ٹھیک ہے نا؟“ میں نے اس کی بھری بھری کلاکیاں، سرے سے بھری آنکھیں اور دندا سے سرخ لب دیکھے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے یہ وہ ہونے کی محسوس خبر سناؤں۔

”مجھ سے کچھ مت پوچھو لالائی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے جانا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں نے اپنے ننگے پیر اور زخالی ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی لیکن ابھی تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔“ وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی جھوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی ننگن اتارنے کی کوشش کی۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ اور ہراساں ہو گئی۔

”لالائی..... میں نے آنسو پیئے ہوئے کہا۔“

”میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جا رہی ہوں مجھے زاور راہ چاہیے۔ خدا

کا واسطہ ہے میری مدد کرو تمہیں لالہ کی قسم“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی نکلن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کوٹ لٹکائے، چنبل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں روئے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے راز داری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہو گئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سید و شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا۔ پھر..... پھر میں نے نمازے کیا سوچ کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاوارث، میرا کوئی نہ تھا۔ نہ سر پر سمٹتھی نہ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناسب سمجھا، شاید وہاں کی مٹی مجھے اپنی اپنی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ سے ملتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا باپ تھیں کا تھا، اس شہر میں کہیں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو کسی، اس شہر نے مجھے پناہ دی۔ لائی کا دیا ہوا زور کچھ دن میرے کام آیا۔ سفر کے دوران بھی اور اس نئی جگہ پر بھی۔ لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خوفزدہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا، مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لائی کو پھر سے صدادی میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے، اور قدرت نے مجھے میرے دو اپنے ملوادیے۔ میرے لالہ کی آخری نشانی اور میری اپنی بیٹی..... میری بیٹی..... جو مجھ سے اتنی متغیر ہے کہ..... لیکن اس کا کیا قصور میں نے بھی تو ایک ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کے میں بھول گئی تھی۔ تمہیں..... لیکن میری بات کو مجھے کی کوشش کرو۔“ وہ آس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

”میں اس واقعے کی کتنی شاد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں گھسیٹا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کنبہ کے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا ماں تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھائیں۔ شاید تمہارے سر سے

باپ کا سایہ کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا چھپتا اور مجھے نرم کر دے۔ کھینچیں کمزور بنادیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب دیتا ہے۔ میں نے کمزور پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا، بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہے۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی، میری انا کو کچھ کے لگتے۔

میرے زرخار کا داغ کو دینے لگا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔ اس کی گالیوں کے چھیننے نظر آتے تو میری روح انتقام سے تسخیر جاتی۔ میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمانی اور پچھتاوے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے کی بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہتے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا، اس کے کبے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ جاتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں یہ سب بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی..... صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی، چوہی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے بھانگنا ہی تھا اگر موجود رہتی تو جی بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگا، پچھتاوا، رونا تو شاید..... مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑتا اور معافی اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انصاف ہے؟ میں اسے عمر بھر جلد دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ بی کیوں نہ جلا کر پڑا۔“

”صرف خود کو؟“ مقدس کے سوال پر اس نے گہری سانس بھری۔

”میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک امتحان میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے پتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے وہ فکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جاتی تھی میرے نصیب کا کچھ حصہ تم بھی چرا لوگی۔ انجینئر تمہاری سیکل بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اتنی دور تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میرے دل و دماغ پہ تو اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی۔“

اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر وقتی طور پہ زریاب کے قایو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی سزا دیتی جانتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنودم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب

تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی، حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں، ان کا مدار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خودکشی ہی کہیں گے۔“
 ”آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔“ اس نے کن انھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن چھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔“

”اے اس کی سزا بھی تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پچھتاؤں سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزا میں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے اس خوبصورت دل کو صاف شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بنا کسی نفرت کے، بنا کسی کدورت کے۔“

”میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔“ اس نے اٹھ کے گلاس وڈو تک جاتی مقدس کو دیکھا اور اپنی شکست کا اظہار کیا۔

”لیکن محبت..... اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ.....“

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو گے تو وہ زریاب کی بیٹی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔“ اس نے خوشنود کا مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس کونے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنان لان میں چلتے آکا کا باب کے ٹھنڈے گلس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان چلتے بچتے سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ روز اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلیوں آئینے رات کے اس سے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور موی اٹھلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نہانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند بچتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور روشنیوں دل میں اُترتی گئیں۔

”میرا دل..... ہاں میرا دل شفاف ہے۔“ اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے مڑا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی توبہ ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی بلکہ یادداشت کی ذہنیل سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کبک درست کر کے اوڑھا دیا اور پچکے سے مقدس کے چہچہے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انگلیوں پہ غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

”ماں.....!“ اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے مڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں مسل کے مٹھی بچھتے ہوئے دیکھا۔

”سزا میں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی محرومیوں کی سزا ایک گلاب چہرہ چھلکا دی۔ کسی نے اپنی عزت پہ حرف آتے دیکھ کے ایک باوقار شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی، کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کے ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ کے سزا ستادی اور تم..... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جاتی ہو وہ زندہ یا شاید صرف اس لیے ہے کہ تم ایک باقرام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مقدس ان کی سانسیں آسان کر دو۔ اس وقت تو اجنبیت کے بجائے اپنائیت کی آغوش ملنی چاہیے انہیں۔“

وہ رو پڑی..... سسک سسک کی رو پڑی۔

”رولو مقدس جی بھر کے رولو..... کبھی کبھی دھندلوں بھی چھپتی ہے، کبھی کبھی گرد پوں بھی صاف ہوتی ہے، میں مرد ہوں، روئیں سسکا، جاتی ہو میں نے اپنے دل کا آئینہ شفاف کیسے کیا۔“ اس کے سوالیہ انداز میں دیکھتے پہ وہ اس کی گہری آنکھوں میں بھر پورا انداز سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کئی روز کے تناؤ کے بعد اس کے تھکے تھکے چہرے پہ یہ مسکراہٹ مقدس کو بڑی گھری ہوئی گئی۔

”میں نے تمہیں دیکھا اور دھند چھٹ گئی۔“

☆☆☆

”درب، بیچوں کو اطلاع بھجوائی؟“ انفراسیاب خلک نے بچھلے ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی بار دریافت کیا اور نفی میں جواب ملنے پہ ہچھکلا گئے۔

”میں کیا کر سکتا ہوں لاال؟ ہاسٹل سے یہی جواب ملتا ہے کہ وہ دودن سے نہیں آئی البتہ کل اس نے فون پہ انتظامیہ سے بات کر کے مزید دودن کی غیر حاضری کی اجازت لے لی ہے۔“

”اوہو یہ وقت اس بحث کا نہیں۔ تم جلدی سے اسے کال کرو۔“ افراسیاب نے معاملہ ختم کیا۔

ہال کمرے میں ابھی چاندنیوں پہ، کافور اور اگریٹوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت گنگلی باندھے فون پہ بات کرتی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اس وقت اطلاع کرو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟“

شادوار نے ناچا جان کی وفات کی خبر سننے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ ”جیہاں میں صبر کرو، دعا کرو اپنے ناچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاہناش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے..... کیوں غائب ہے اسے دونوں سے ہاسٹل سے اس کی غیر حاضری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔“ اسے چپ کرانے کراتے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے صوفے پہ سے اچھل کے کھڑی ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے..... اپنی ماں کے پاس؟“

”سب؟ کسے؟“

”کہاں لی تمہیں؟“

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کے قریب چلے آئے اسوائے زریاب کے۔ وہ وہیں بیٹھا خود کو ایک نئی خبر کے لیے تیار کرنے لگا۔ زبیدہ نے فون کر ڈیل پر رکھا اپنی حیرت سے بھری نظریں سب پہ دوڑائیں۔

”مومنہ..... زریاب کی بیوی مل گئی..... مقدس اسی کے پاس ہے۔“ ان کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

”وہ شادوار یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ہاسٹل میں ایڈمٹ ہے مقدس بھی اسی وجہ سے ہاسٹل سے غیر حاضر ہے۔“ انہوں نے مزید بتایا کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کی نگاہیں زریاب کے چہرے پہ جمی تھیں، جہاں اس وقت زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ لی بی بی جان نے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔

”زر، میرے بچے یہی وقت ہے، اس وقت کروک لورنہ پھر کچھ باقی نہ بچے گا، عمر بھر کے پیچھا دوے کے سوا۔ خدا اسے زندگی دے، اتنی کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی تو کر سکیں اور کچھ نہیں تو اس سے معافی تو مانگ سکیں۔ اشوزر، جاؤ اس کے پاس..... قسمت سے یہ موقع ملا ہے، اسے کونامت۔“

”اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں۔“

”اتنی صبح تو کالج بھی نہیں کھلا وہ کہاں چلی گئی۔“ اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے گزر ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شادوار سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خشک نے فیصلہ سنا دیا۔

”رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لاجبی ہے البتہ ان کے انتظار میں باچا جان..... میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔“

زریاب اور لی بی بی جان دونوں صدمے سے غر مل اس سارے مسئلے سے بے خبر تھے۔ جیس سال کی قید میں ایک مساکت و جلد زندگی گزارنے کے بعد زریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے بے درپے جیسکے شدید غایت ہوئے تھے اس کا وہ بیان ہی اس طرف نہیں کیا البتہ جھینڑ و گھٹیلن کے بعد لی بی جان ذرا سنبھلیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

”کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھیجی تھی کچھ کو؟“

زریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی فکر میں ڈال دیا۔

”کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے۔ ایسا تو بھی نہیں ہوا اور شادوار وہ تو کالج سے چار بجے تک آ جاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کیا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجتے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔“ لی بی بی جان بڑبڑا رہی تھیں۔

”اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔“ دراب نے کہا۔

”کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔

زریاب مضطرب سا ہو کے ٹپٹپٹے لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ مل کے کچھ کہنے کی ہمت جمع کرتی ہوئی زبیدہ ٹیکم فیصلہ کن انداز میں انھیں۔

”وہ دراصل میرے پاس شادوار کا موبائل نمبر ہے۔“

”موبائل نمبر؟ اس نے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔“ دراب نے ماتھے پہ بل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پہ بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکا تھا اور حقیقت میں شادوار نے اس پھونٹے ماسوں سے خائف ہو کے ہی موبائل فون سب سے چھپا کر رکھنے پہ مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

”لیکن بی بی جان میں کیسے؟“ اس نے گھر کے افسردہ ماتمی ماحول پہ اک نظر ڈالی۔ ”ابھی صبح بچا جان کی تدفین ہوئی ہے، گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے، کل این کے قتل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں“

”جانے والے تو چلے گئے زریاب“، افراسیاب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”جو جا رہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔“ ☆☆☆

نکلتے پندے مینوں چچاں مارے
تے میرے روندے میں نین نمائے
چنیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اک لگے تے توں جانے
غلام فریدا دل اوتھے دیے
جتنے اگلا قدر وی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے تو پتہ چلے۔ غلام فرید دل اسے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی درد میں ڈوبی اور آواز سنائی دی۔ یہ گیت..... یہ گیت ابانے کتنی بار اسے سنایا تھا اور وہ بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی درد کے اک گہرے سمندر میں بہتے لگتی تھی کچھ پتھر دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی کھرنے اسے ڈھانپنا چاہا لیکن اس نے جھٹک کے اس دکھ گہرے احساس کو برے کردیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور جب اس کھرنے اس کے گرد اپنا جال بٹنا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا تب اس گیت کے بولوں نے سنے سنے راز کھولے۔ آج ابا کی آواز اسے اوپری اوپری سی نلگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

”ابا!“ اس کے لبوں سے کراہی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اسے میرے محبوب!

میری آنکھیں تمہاری راہ دکھ رہی ہیں۔

لوٹ آؤ۔

میں تمہاری تھکن اپنے ہاتھوں میں سولوں۔

”ماں کی آواز میں ”برہ“ اسے سنائی دیا۔ ”ماں..... ماں!“ اس نے ذہن کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔ اس کی ”کوپسی“ پگلی سپیاں کھٹک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ”پوشش“ کا دامن تھامنا چاہا۔ ”ابھی نہیں میری لاڈلی، بس کچھ دیر اور.....“ ابانے بھی لگا ہوں ہی لگا ہوں میں تپلی۔ ☆☆☆

”ماموں!“ وہ دے دیے ہوئے پتے پہنچنے کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سرائی کے اس سفید عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر ”وہ“ موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہ چلتا۔ بزرگان کے مسئلے ہوئے سولوں سے بھرے لباس میں بلبوں وہ کم عمری لڑکی اپنے سنہری چہرے پہ بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

”کون.....؟ مقدس“ اس نے سوچنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل آنکھوں کو دیکھ کے خود ہی تردید کی..... یہ آنکھیں تو کسی اور کی یاد دلا رہی تھیں۔ رحیم گل آفریدی کی.....

وہ چونکا۔ ”ماموں!“ اب اس کے اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بازو پھیلادینے۔

”وہ اندر ہیں۔ دونوں۔“ اس کے سینے سے لگتے ہوئے اس نے سرگوٹی کی۔ زریاب کا رواں رواں لرزے لگا۔

”بس کچھ دیر اور..... چند لمحوں بعد..... وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔“ اس کا دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھل کے یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر اُکسانے لگا اور جب سچ سچ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ رک گیا۔

کورڈرو میں ماربل کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بلاشبہ مقدس ہی تھی۔ اس نے نیلم کے کٹڑوں کے گرد ہیرہ دی کی کیاں کتنی دیکھ لی تھیں۔ اگر اللہ ان آنکھوں میں نیلا نشیں اتارنے کے بجائے شہدرنگ جیسے ظہیر اودیتا کو نکھڑایا تاتا یہ مومن ہے یا مقدس۔

”بابا جان!“ اس نے زریاب کے پھیلے بازو دیکھے تو الجھی گئی۔ ذہن میں کہیں خوشنود کے الفاظ نے سہارا دیا۔

”سزا نہیں دینے کا عمل کب تک جاری رہے گا۔“ اس نے باب کی بیاسی آغوش میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماں کی ممتا کو تسکین پہنچانے میں اس نے جو کچھ جھٹکا مٹا مٹا کر کیا تھا، اس کا خیرا وہ وہ ایک کسک کی صورت بھگت رہی تھی۔ اس وقت اس کی ماں زندگی کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔ اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔ بس

ہوئے شیشوں پر مسکراہٹ کا عکس جھلکایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکایک جگمگا دیا۔ اس کے لبوں نے پھر پھڑکا کر اسے پکارتا چاہا لیکن وہ دہیں دوڑا تو بیٹھ کے اس کے پیچ چوٹنے لگی۔

”میری پیاری ماما..... میری ماما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ بائیں پھیلا پھیلا کر مجھے بائیں رہیں اور میں بے شر حسابوں میں کھوئی رہی..... میں کتنی بد نصیب ہوں ماں کے ملنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔“

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے پیچ بھگو دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدقت ہاتھ اٹھا کر اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں بجلی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس ملاقات کا ایک بل بھی ضائع نہ کرنا چاہتی ہو۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تھام لیا اور لبوں سے اس کے ماتھے پر ایک دعا بحث کر دی۔

”میں جانتا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی ہانہوں کی پنہاں میں ہے۔“

آج اس کی دعا کا یہ آخری حصہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد آیا۔ ”بس تھوڑی سی چھٹاؤں..... یا اللہ ذرا سی گرمی..... بس اک بوسہ..... یا اللہ بس اک دعا۔“ وہ کانپ گئی۔

”کیوں میں نے بس ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔“

”کہیں، کہیں..... بس ایک بوسہ تو نہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو کے ماں کو پکارنے لگی۔

”ماما..... ماما آنکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں نیوں بند کر لیں۔ دیکھیں ماما ہر کون آیا ہے..... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے..... آپ کی ہر بات کی سچائی یہ ایمان لانے کے لیے.....

”آنکھیں ماما..... یلہ زان سے مل لیں۔ ایک باطل قس وہ شرمندہ ہیں، ہمارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں ماما۔“

”ماما خدا کے لیے..... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجئے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو یاد کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو جلاتا..... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول.....“ اس

ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔ اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مومنہ بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

”میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں جانتا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں سے پھیلی چھاؤں میں ہے۔“

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔ سر پر رکھی زریاب خٹک کی پھیلی شہنشاہ کی اس کی پوری پور میں اترنے لگی۔ اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

اس نے ڈیڈ ہائی آنکھوں سے باپ کے خند خالی میں وہ ٹکس ڈھونڈنے چاہے جو بچپن سے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے وسیعہ سر اے پے لٹنے کا تم نمایاں تھا۔ چہرے پر پچھتاؤں کی گہری لکیریں تھیں، بھوری آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

”ماما تمہیں خزاؤں کے خواہے کر کے بابا بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔“

”مقدس!“ کمرے سے نرس کے ہمراہ نکلنے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

”فیروز!“ زریاب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ بے یقینی سے اس نو جوان کو دیکھنے لگا۔

”چودھ بھی جان، ہوش میں آگئی ہیں لیکن..... لیکن ابھی کوئی تسلی بخش بات نہیں کی جاسکتی، تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔“ اسے ایک دراز قامت مگر تھکے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

”تم انہی ان سے مل سکتی ہو مقدس۔ میں نے کہا ناں ان کی حالت بہت نازک ہے۔“ وہ کچھ کچھ بچکانہ رہا تھا۔

”بابا جان!“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہنا چاہا۔ جواباً زریاب نے ایک سر دھڑا مہری۔

”کامیرے نصیب میں پچھتاؤں سے رہائی نہیں لکھی۔ مقدس..... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کے قریب آ گیا تھا۔

”میں تو میری بیٹی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معافی نہ کیا.....

مومنہ کی آتی جانی اکھڑی سانسوں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوئے پیر تھام لیے۔

”ماما..... مومنہ نے مشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے

کے مسلسل اصرار پہ مومنہ نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پہ ایک بے بس خاموشی تھی۔
 ”مومنہ!“ زریاب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دیکھ کے اس کے
 دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبریں سنی تھیں مگر
 جھیل لیے تھے لیکن..... لیکن اس گلابی ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلا سا نولا پڑا زرد چہرہ
 دیکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

”اور کیا ان اندھیرے درپچوں کے پیچھے اب بھی شہد کی جھیل آباد ہے۔“

”مومنہ! ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ میں
 صحیح طرح بتا نہ پایا تھا، شاید تب میں جانتا ہی نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب
 دینے کے قابل ہوں۔ سنو مومنہ، پھولوں کے رنگ کالے نہیں ہوتے..... پھول بھی کالے
 نہیں ہوتے، کالک تو دلوں پہل دی جاتی ہے، سیاہی تو روح میں اتر جاتی ہے۔ اندھیرے
 تو نظروں پہ چھا جاتے ہیں، اپنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی
 اندھیرے مجھے بھی چاٹ گئے تھے۔ میرے دل پہ، عقل پہ، بشور پہ، ہر جگہ سیاہی مل دی گئی
 اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میلی کرسیے ہو سکتی تھیں۔ پھول بھی کالے نہیں
 ہوتے بھی کالے نہیں ہوتے۔“ وہ جھک کے اسے بتا رہا تھا لیکن اس بے حس و حرکت وجود
 میں اب کسی راز کو جان لینے کی خواہش رہی تھی نہ صحت۔

”مومنہ..... مومنہ“ وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشبود اس کی آواز کی
 گونج سے چونک کر اندر کی طرف لپکے۔

”مومنہ! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی
 لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پھر دل کیسے ہو سکتی ہو مومنہ، انہیں خدا کا واسطہ لوث
 آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلاؤ۔ اس سنگباری کو روکو۔“

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی جھک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے
 آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

”تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم گر گئیں، لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ
 دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی بھی لپکے میں جا جاتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جھٹتا
 مرضی کھنور ثابت کر لو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔
 اگر زندہ رہتیں تو نفرت مر جاتی۔ ہے ناں ماں؟ جی جی بتاؤ تمہاری نفرت مرنے لگی تھی
 ناں؟“

ختم شد

سارے گلاب لے جانا

”میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“

میرے ہاتھ میں کانپتے ہوئے گلابی کاغذ پہ لکھے چند ہم سے الفاظ نے مجھے کسی گہرے
 کنوئیں میں لا پھینکا، میں نے آنکھیں بند کر کے اس خط کو زور سے اپنی ٹھنڈی میں بھینچا اور پھر
 سہارے کے لیے دیوار سے ٹیک لگالی۔ میری بند آنکھوں کے آگے ایک ہی کس جھلملا رہا
 تھا۔

زینیا عمر!

زینیا!

جو مجھ سے محبت کرنے لگی تھی، اس وقت جب میں نے اس سے محبت کرنا چھوڑ دی
 تھی۔ لیکن میں نے اس سے محبت کرنا شروع کیا تھا۔

پتا نہیں میں محبت کرنا جانتا بھی ہوں یا نہیں۔ محبت تو ہاں..... میں نے بھلا کب
 محبت کی، ہاں اسے محسوس ضرور کیا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار..... اپنے بہت قریب..... بہت

ہی قریب اور جب محبت نے کسی آسیب کی طرح میرے وجود کو بھلنا چاہا تو میں ہی گھبرا کے بھاگ نکلا۔

بزدل ہوں نا.....

میری بزدلی نے مجھے یہ اعتراف تک نہ کرنے دیا کہ میں عاشق ملک اس عام سی لڑکی زینبا عمر کا اسیر ہو چکا ہوں۔ میری خود پسندی اس حقیقت کو بھٹائی رہی کہ وہ پرسکون سی آنکھیں میری بے چین فطرت کو گھیرے میں لے رہی ہیں۔

میں نے اس بے جان پرزے کو جب میں ڈالا اور سیف سے اپنا پاسپورٹ اور کیش نکال کر سامان پیک کرنے لگا۔ میں اُس کے اس سر زین پہ پہنچنا چاہتا تھا، جہاں سے مجھے سرخ گلابوں کا وعدہ یاد دلایا گیا تھا اور مجھے یہ وعدہ بھانا تھا۔

”اچھا جب تم مرو گی ناں تو مجھے ضرور بتانا ازم تک تب تو یہ گلاب تم پہ چڑھا سکوں گا۔“ کبھی میں نے بے حد مل کر اس کے واپس کیے گلابوں بھرے کبے کو اپنی ٹھیل پہ پٹخ کر کہا تھا۔

”اس سے پہلے میں تمہیں اپنی شادی کی دعوت دوں گی۔ بڑے چوڑے اس سرخ تازہ گلابوں والے گلہ دستے کے ساتھ شرکت کر کے۔ تم نے سنا نہیں ٹھیک طرح سے کہ میں نے کیا کہا ہے ان پھولوں کے بارے میں، یہی کہ یہ دو مونگوں سے ہی بنتے ہیں یا تو میت یا شادی ہے۔“ اس نے چڑایا ”اؤ گے ناں پھر پھول لے کر؟“

اور مجھے یہ وعدہ بھانا ہی تھا۔ زندگی کے کسی مقام پہ تو خود کو سچا ثابت کرنا تھا۔ مگر کیا..... واقعی..... واقعی..... وہ کسی اور کی ہو نے جارہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ میری ہمیشہ سے یہی تو خواہش رہی ہے کہ میں..... عاشق ملک..... کبھی نہ کبھی..... اسے زینبا عمر کو ہر اکے دکھاؤں اور اب جب ایسا ہونے جا رہا ہے تو جیسے میرے دل کو کوئی ایڑیوں تلے چپکے جا رہا ہے اور میرا دل..... میرا فارع خود پسند دل۔

آس سے ایرپورٹ اور پھر پلین تک پہنچتے پہنچتے میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ لیکن سیٹ کی پشت سے سر نکالے آنکھیں موندتے ہی جیسے ایک فلم کی چل پڑی۔ خود پہ کسی کو حادی ہوتے دیکھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

میں عاشق ملک..... دراز ذہن، وجہہ زہن، حاضر جواب، خوش مزاج اور اعلا تعلیم یافتہ۔

میں ”کچھ“ ہوں، اس کا احساس مجھے قدم قدم پہ دلا یا گیا۔ نتیجتاً میں خود کو

”بہت کچھ“ سمجھنے لگا۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔

ای، بھائی جان اور میں۔

ابو بھی کی وفات کے وقت میری عمر نو برس تھی اور اتنا ہی فرق میرے اور بھائی جان کی عمر میں بھی تھا۔ اس قدر قریبی میں انہوں نے بڑا بھائی بن کے نہیں بلکہ باپ بن کے میری پرورش کا ذمہ اٹھایا۔ ابو بھی کا کاروبار سنبھالنے کے لیے انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ اٹف۔ ایس سی کے دوران ہی منقطع کر دیا۔ حالانکہ انہیں میڈیکل لائن میں جانے کا کس قدر شوق تھا اسی جان کے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے پروں تلے جھپکا کے بالا تھا۔ اب جب باقر بھائی جان کو یکدم باہر کی دنیا کے پیچھے رہنے سہنا پڑے تو پوچھا گئے۔ پھر یہ پوچھا ہٹ جیسے ان کی شخصیت کا قصہ بن گئی۔ انہوں نے خود کو بالکل ہی وقف کر دیا۔

بھائی جان تو بے چارے خیر کیا کرتے، البتہ میں نے خوب خوب اس نرزی کا فائدہ اٹھایا، اسی جان نے میری ہر جا بے جا ضد اور فضول سے فضول تر خواہش مان کر میرے اندر خود سری کے کڑے کو برداں چڑھایا۔

مجھے اپنے آگے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے دل میں محبت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ اسی اور بھائی جان دونوں سے ہی مجھے پیار تھا، ان کے بغیر میں اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں ایس خرابی بھی میری سوچ میں۔ میں انہیں اپنے لیے ضروری قرار دیتا تھا، ان کا پیار، لاڈ و صلا انا حق جانتا۔ لیکن کبھی نہیں سوچا کہ میں ان کے لیے کیا ہوں۔ کیا انہوں نے بھی میری ذات سے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

صاف صاف سنا دیا۔ ”بھائی جان پلیز ایسا سوچے گا کبھی مت، بات میری دلچسپی ہونے پانا ہونے کی نہیں ہے۔ شاید میں اس طرف اپنا رجحان کر بھی لیتا لیکن آپ کے یہ کہنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں کہ آپ اپنے ادھر سے خواہوں کی تکمیل کے لیے مجھے ڈاکٹر بنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ ایسا کہ کے مجھے ہر بلے یہ گئے گا کہ میں انہیں نہیں، آپ کی زندگی جی رہا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی مکمل اپنی چاہیے، اپنی مرضی کی، اپنی خوشی اور اپنے حوالے سے۔“

اپنی صاف گوئی کے ذمہ میں میں نے ان کا دھواں ہوتا چہرہ بھی نہ دیکھا۔ ان دنوں میں ایسا ہی تھا۔ یہ سوچنے کی محنت میں کم ہی کیا کرتا کہ میرے مخاطب بے جان درود یوار نہیں، مجھ ہی سے وابستہ مکمل احساسات رکھنے والے جیسے جگتے لوگ ہیں۔ جن پہ

میرے الفاظ کو کوئی رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔

باقربائی جان کی طرف سے ملنے والی بھاری پاکٹ منی کے باعث میرے ارد گرد ایسے یاروں دوستوں کا ہجوم لگا رہتا جو میری خود پسند فطرت کی تسکین کرتے رہتے۔ یہ وہ دور تھا جب اپنا آپ منوانے کی تمنا، میری سرکش طبیعت میں دھیرے دھیرے سر اٹھانے لگی تھی۔

شرمین.....!

میری ماموں زاد، میری ہم عمر تھی۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ شروع ہی سے اکٹھے بڑھتے، کھیلتے آتے تھے، اسے میں نے اپنے دیگر فریڈ زاد کرنز سے کبھی الگ نہیں سمجھا تھا۔ مگر جب ہائی اسکول میں ہمارے ڈیپارٹمنٹس الگ الگ ہو گئے تو زندگی میں پہلی بار مجھے کسی کی کمی محسوس ہوئی۔ کالج پہنچتے ہی میں نے خد کہے موز بائیک خریدی، حالانکہ بھائی جان مجھے گاڑی تھے ہی دینا چاہتے تھے، مگر میں جانتا تھا شرمین کو بائیک کی سواری کا کس قدر شوق ہے۔ اور اب میں چھٹی کے بعد بائیک لے کر اس کے کالج کے گیٹ پہ کھڑا ہو جاتا۔

ہمارے گھر ایک ہی بلاک میں تھے۔ اس آٹھ دس منٹ کے روزانہ کے ساتھ نے مجھے اس کی جانب تھپتھپ رہے مجبور کر دیا۔ وہ کہ قدر حسین، معصوم اور دلکش تھی میں ہر روز اس کا اندازہ پہلے سے بڑھ کے لگتا۔ اس کے چہرے میں ہر روز ان کی کشش محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھیں کتنی نیلگوں، کتنی گہری ہیں اور نیلم کے ان دیکھے ٹھوڑوں کے گرد یہ باریک بھوری لائن اور گلابی ڈورے، اف میں مدھوش ہو جاتا۔ ٹیکس جھانکی تو گہری بھورے کمان دار اردوؤں کے نیچے ابھرے ہوئے سفید پتھوں پر چھل چھل کیلی رنگوں میں ارتعاش سا رہا ہو جاتا۔ اور بے حد مٹھی لائی پٹلیں، جن کا سایہ اس کے زخماؤں تک آتا تھا، گول گول بھرے بھرے سرخ انار کی رنگت والے اس کے گال جن کے دونوں جانب بڑے والے گہرے سنہوراں کا حسن اور بڑھادیے۔ کتے روپ بدلے تھے یہ سنہور، اس کے قل قل ہنسنے پہ پتھر سے ڈھیل جیسے سپدھے دل میں ہی کھب جاتے مٹکرانے پہ گدگد، آنے لگتے اور ناراضی میں لب تختی سے بچنے لینے پر بھی زخماؤں پہ ہولے ہو لے جھانکنے لگتے۔ چھوٹا سا دہانہ، کھلے کھلے یا قوتی لب، گدایا بدن، گداز سر میں ہاتھ جیر، کھٹکتی آواز مہکتی تھیں۔

اسے دیکھ کے مجھے اردو شاعری میں پڑھے ہوئے تمام قصیدے اور تشبیہات یاد آ جاتیں جو میں اس سے کبھی کہہ نہ سکا۔ وجہ امت کی نہیں میری ازلی خود پسندی تھی۔

اسے بائیک پر اپنے پیچھے بٹھا کے میں سمجھتا ہا کہ میں نے اسے فتح کر لیا ہے۔

اسے اپنی ملکیت سمجھنے کی میری یہ خوش بھی اس وقت ریت کی دیوار کی طرح ڈھسے گئی جب اسی جان اسے باقر بھائی کے نام کی انگوٹھی پہنا آئیں۔ میں ہکا بکارہ گیا کیا اس قدر حسین، اچھوتی چیز میرے علاوہ بھی کسی کا حق ہو سکتا ہے، اور وہ بھی باقر بھائی جان جیسے انسان کا، کیا ہے ان میں۔ کون سی خوبی ہے جس کے بل بوتے پہ وہ شرمین کے حسن کا قلعہ فتح کرنے چلے تھے۔ شکل و صورت، تعلیم و ذہانت، عمر کی طرح بھی وہ میرے پلہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ میں کینکسی سے سوچتا۔

میں چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی ضد منوا سکتا تھا، اسی جان مجھ پہ قربان ہوئے کو تیار اور بھائی جان میری دل دہی کو اپنا اولین فرض سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر وہ جس کی ذات پہ کسی اور نام کی مہر لگ چکی ہو، اسے اپنا تا بے حد صحن اور پھر اس کا حسن، اس کا سراپا دل و نظر کے لیے لاکھ پسند یہ سیکس لیکن میری انا مجھے اس کی ذات کو یہ فخر سوچنے سے روکتی تھی کہ اسے میں نے..... نے زمانے سے لڑ کے حاصل کیا ہے۔ سو شرمین کو تو میں نے فوراً ہی دل کی مسند سے اتار دیا کہ ابھی تک وہ دل و نظر تک ہی پہنچی تھی۔ روح میں نہیں سہائی تھی مگر اس احساس شکست کو ذہن کی سلیٹ سے کھرچ نہ سکا۔

میرا تجربہ یہ درست تھا۔ شرمین اور باقر بھائی جان کسی بھی طرح ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے، کبھی ہی دونوں میں سترہ سالہ شرمین ”بھابھی“ وقت سے پہلے پھجور ہو جانے والے بزرگ نما جوان شوہر کی ہمراہی میں حواس باختہ نظر آنے لگی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ جس طرح باقر بھائی جان اپنی عمر سے کئی سال آگے تھے اسی طرح وہ اپنی عمر سے کئی سال پیچھے۔ کسی بات کی گہرائی تک اترا تو دور کی بات وہ تو سرے سے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔ مجھے تو یقین تھا اس رشتے پر جب اس کی رضا مندی دریافت کی گئی ہوگی تو اس نے مٹھل کالج کی تعلیم سے فراغت، چمک دکھ کر کے زیورات، ملبہ سات اور بٹی مون وغیرہ کی حد تک اپنے تصور کے دوڑائے ہوں گے اور جھٹ ہال کھدی ہوگی۔

گھر میں عورت کے آ جانے کا کوئی احساس اس کی آمد سے نہیں جاگا تھا۔ وہ در ساڑھے دس بجے جاگئی، جب کہ پورے نو بجے آؤں چلے جانا بھائی جان کا معمول تھا ناشتے کی ٹیبل پر ہم تینوں ماں بیٹے ہوتے اور دوپہر کے کھانے پر کبھی میں اور اسی جان اور کبھی صرف اسی جان۔ کیونکہ بارہ بجے ناشتا کرنے کے بعد وہ دو بجے لچا کرنے ضرورت محسوس نہ کرتی تھی۔

شام کو الگ ہی تماشا ہوتا۔ اسے ہر روز گھر کے کھانے پسند نہ تھے، وہ ہر دوسرے دن بھائی جان سے باہر ڈنر کرنے کی ضد کرتی۔ جب کہ بھائی جان سارے دن کی سرکھائی کے بعد گھر سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ اس کے مجبور کرنے پر طوعاً کرہاً چلے بھی جاتے اور کبھی مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگتے۔ جب کہ میں صاف انکار کر دیتا۔ اب جب کہ وہ محض ایک حسین و جمیل دو شہرہ لکین، بلکہ کسی کی بیوی، بلکہ میرے اپنے ہی بھائی کی منکوحہ ہے، مجھے اسے سر پہ لا دے مارے مارے پھرنے کا کوئی شوق نہیں رہا تھا۔ وہ خود بھی میری بے زنجی کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔ جب کہ ہمارے درمیان خاصی بے تکلفانہ دوستی رہ چکی تھی۔ اب تو خیر میں اس کی بات کا جواب بھی رکھائی سے دیتا۔ بلکہ باقر بھائی جان کو اس کے آگے خادصانہ انداز کے ساتھ ہاتھ باندھے منمناتے دیکھ کے تو میری جان ہی جل جاتی۔

”شرین! میرا خیال ہے.....“ اس دن مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے نوک ہی دیا۔ اسی کے کہنے کے باوجود میں نے اسے بھابھی پکارنے اور آپ جناب والے تکلف سے پرہیز کیا تھا۔

”اب تم بھی کچن کو روٹی بخش ہی دو، کب تک ہم ای کی پریڈ کروا رہے ہیں گے۔“

جو بات اسے بھائی جان اور ای جان کو کہنی چاہیے تھی وہ میں نے کہہ دی۔ صبح ناشتے پہ بھی اسے ایک ہی براٹھا کھانے کی سوچھی تھی۔ جب کہ اسے دونوں میں اس نے نیم، کریم، بریڈ اور دلیہ کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسی جان کو فوراً براٹھا تیار کرنا پڑا۔ اور اب اسے چاول نہیں کھاتا تھے۔ روٹی پکانے کے لیے اسی کو ٹھنڈے دیکھ کے میں ضحکہ نہ کر سکا۔ ”ای جان رُک کے مجھے تنہائی نظروں سے گھورنے لگیں، شاید انہیں لاڈلی بھانجی اور بھانجی بھوکی ناراضی کا خدشہ تھا۔ بھائی جان بھی چالوں سے بھرا چچھو میں رہ کر کے پیسے نکالنا ہی بھول گئے اور شرین کے چہرے کے بدلے رنگوں کو بھٹکنے لگے۔ جب کہ میں اپنی کہہ دینے کے بعد اطمینان سے سانس ڈالنے لگا۔

”جب کہ میرا خیال ہے اب ہمیں کوئی ٹک رکھی لینا چاہیے، آخر کب تک ہم ای کی پریڈ کروا رہے ہیں گے۔“ اس نے بڑے ہی سکون بھرے انداز میں میرا جملہ مجھے لونا دیا اور سلا کے پتے کترنے لگی۔ اس کے بظاہر عام سے لہجے میں پوشیدہ جنادینے والی ہنس محسوس کر کے میں چونک گیا۔ (وہ نہ تو شرین بی بی کو بولنا اور وہ بھی سوچ مجھ کے بولنا آئی کیا)

”ہمارے گھر میں آج تک خاندان نہیں رکھا گیا۔“ میں نے اسے اطلاع دی۔

”ہمارے گھر کا اصول ہے، کچن کا کام صرف گھر کی خواتین کرتی ہیں۔“
 ”خاموشی سے کھانا کھاؤ عاشر! کیا اصول بحث لگا رہی ہے۔“ ای جان نے متوقع بد مزگی بھانپ کر مدخلت کی۔

”آپ سچ میں مت بولیں۔“ میں اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ کی طرح درشتی سے بولا۔
 ”واہ بڑے اصول اصول لگا رکھے ہیں۔ خود کو دیکھا ہے بھی، کیا طریقہ ہے ماں سے بات کرنے کا۔“ اس نے میری بات چوڑی کی۔

”تمہیں کوئی نوکے تو مرے سے کہہ دیتے ہو، مجھے ان گھسے پٹے صدیوں پرانے اصولوں پہ چلانا ہے کی کوشش کوئی نہ کرے اور خود دوسروں کو اصول پرستی کا درس دے رہے ہو۔“ اس کے چنک کے بولنے پر میں نے پیش میں آ کر زور سے میز پہ ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی ہمت تو اس میں تب بھی نہ تھی جب ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ تھا۔ وہ دہائی لڑکی آج بڑھ بڑھ کے میرے مقابلے پہ بول رہی تھی۔ میرے.... میرے آگے..... جسے اپنی بات کے رد ہونے کا بھی تجربہ بھی نہ ہوا تھا۔

”آرام سے بات کرو شرین! کیوں چلا رہی ہو، بلا وجہ۔“ بھائی جان بالا آخر ہمت کر ہی بیٹھے۔

”بلا وجہ..... بلا وجہ چلا رہی ہوں میں۔ آپ دیکھ نہیں رہے عاشر کس طرح پیش آرہا ہے مجھ سے، اس کو کیا حق ہے مجھ سے اس طرح بات کرنے کا، یہ کیوں ہوتا ہے مجھ پہ ذمہ داریاں عائد کرنے والا اور مجھے یہ بتانے والا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ کیا گھر میں سب سے بڑا ہے۔ کیوں اتنی چھوٹ دے رکھی ہے آپ نے اسے، کہ یہ مجھ سے اس گھر کی بڑی بیوہ ہے۔ اپنی بڑی بھابھی سے یوں سوال جواب کر رہا ہے۔ کیا میں نے آپ سے کئی مرتبہ نہیں کہا کہ مجھے چھو چھو سے کام لینے سخت مرنے کی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے تو میں آپ سے ڈنر باہر کرنے کے لیے کبھی رہتی ہوں، کیونکہ میں دن میں ایک ہی بار تو کھانا کھاتی ہوں اگر وہ بھی میری پسند نہ بنے تو، مجھے چن چن میں جا کے چھو چھو سے کہہ کے بنوانے میں جھج محسوس ہوتی ہے، آج سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں کہ ایک ٹک ہی رکھ دیں۔ کم از کم میں اسے آرزو کر رہی تھی کہ کھانا تو بنا سکتی ہوں۔“

کہہ رہے کے بند دروازے میں اس کے زور زور سے بولنے کی آوازیں لہر دیتی تھیں جلی آ رہی تھیں۔ میرے اپنے کمرے میں طے آنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

”شرین! تم میری بیٹی ہو، بھونٹیں، مجھے تو بیٹی کے لاڈ اٹھانے کی حسرت ہی رہی، اب تم پہ ہی اپنے شوق پورے کروں گی۔ تم بلا تکلف مجھ سے کہہ دیا کرو، جہاں جو بھی دل

چاہے، میں بنادیا کروں گی اپنی بیٹی کو۔“

ای جان نے نرم روی سے معاملہ سلجھانا چاہا۔ مگر وہ شرمین تھی، کروڑ پتی باپ کی ناز نخرے والی بیٹی، جس نے اپنی مرضی سے کم یہ راہی رہنا سیکھا ہی نہیں تھا۔
”تھک یو..... پیو پیو! میں جانتی ہوں آپ مجھ سے کس قدر پیار کرتی ہیں، لیکن ان فیکٹ مجھے یہ آگوشٹ، کوکنے، قہیرہ کر لے اور پلاؤ وغیرہ کچھ خاص پسند ہیں اور میری پسند کی چیزیں، شاشلک، چاؤمن، اسٹیک وغیرہ آپ بانٹیں سکتیں۔ آپ میرے لاڈ بے شک مت اٹھائیے۔ مجھے ایک بلٹر رکھوا دیجئے مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے۔“ اس نے ترش روی سے جواب دیا۔

اور ایک ہفتے کے اندر اندر بھائی جان نے گھر میں ایک لک رکھ لیا۔ بات گومعمولی سی تھی لیکن ہمارے گھرانے کے مزاج کے خلاف، ماموں جان وغیرہ ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں چھپر پھاڑ کے دولت اچا کھل جاتی ہے، اتنی اچا کھ کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے ہیں، ہنر سونا بھالیتے ہیں، منہ میں چاندی بھر لیتے ہیں۔ اور سر پہ ہیرے، لیکن چھپر پھٹا کا پھنسا ہی رہتا ہے۔ جب کہ میری امی بیابہ کے جس خاندان میں آئیں وہاں چھپر کی سلاخی کا دھواں سب سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری حیثیت فضیلا کے مقابلے میں کچھ کم تھی لیکن ایسی گرگروں بھی نہ تھی بس ہمیں دکھاوا نہیں آتا تھا۔ شادی کے ابتدائی سال امی جان نے کچھ کتنے سے گزارے تھے اس لیے پیسے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس تھا ان کے دل میں، اباجی نے دن رات محنت کر کے یہ بزنس سیٹ کیا تھا، اور اب گھر میں خوشحالی و فراغت آ جانے کے بعد بھی ہمارا رتن کن سادہ ہی تھا۔ امی جان اپنی بھابیوں کی طرح سونے میں لدی نظر نہیں آتی تھیں۔ ایک عام گھریلو عورت کی طرح

انہیں گھر میں جوان خوبصورت بہو کے ہوتے ہوئے مرد ملازموں کا دندناتا پھرتا سخت گراں گزرتا۔ لیکن جبور تھیں۔ بہو جس طرح کی لے آتی تھیں وہاں انٹینس اکسل ہی نوکروں کی تعداد اور زیورات کی مقدار بھی۔ لیکن وہ چپ رہیں۔ بھائی جان بھی چپ تھے اور وہ دونوں مجھ سے بھی اسی چپ کی توقع رکھ رہے تھے تاکہ گھر کا ماحول سازگار رہے، کسی قسم کی کوئی بدعمری نہ پیدا ہو۔

لیکن میں..... حاضر ملک بھلا میں چپ رہ سکتا تھا۔ شرمین مجھے یوں بھی قبول نہ تھی بحیثیت ایک بھابی کے اور جس طرح کے خوراس نے اختیار کر رکھے تھے وہ مجھے اور بھی تملانے دیتے تھے میرا ذہن اس لڑکی کو وہ تعظیم و تکریم دینے سے قاصر تھا جس رشتے کے

حوالے سے وہ بھتیجا اس عزت و احترام کی مستحق تھی۔ وہ میرے سامنے آتی، اس کی حیثیت مرتبہ میرا دل جلا دیتا۔ وہ جس کے حسن سے میں محو رہتا تھا اب میرے لیے ایک بے کشش، بد زبان، ست اور بے حسن عورت بن کے رہ گئی تھی۔
شاید وہ عمر ہی ایسی تھی ہر پرکشش چیز کی جانب دل بٹھکا چلا جاتا تھا۔ ریشم کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔

”ریشم..... شہودی بہن،

شہود میرا کلاس فیلو، میرا دوست تھا، ویسا ہی دوست جیسا کہ کالج لاکھ میں کسی بھی یار باس خوش مزاج نوجوان کے دور دراز دوستوں میں سے ایک ہو کر رہا ہے۔
میرے کمرے کا میوزک سسٹم، کمپیوٹر، وی ڈی اور کالج میں شہود تو کی، حبیب، ندیم اور نجانے کتنے دوست..... یہ سب دل بھلانے اور وقت گزارنے کا ایک بہترین طریقہ ہے۔

ایسے ہی کسی روز میں شہود کو اس کے گھر ڈراپ کرنے گیا۔ وہ ایک ملل کلاس فیلو سے تعلق رکھتا ہے اس کا اندازہ تو مجھے تھا مگر اتنی زیادہ زبوں حالی کا میں نے تصور نہ کیا تھا، گرمی شاہو کے اندر کہیں جا کے وہ مہمان آؤ سا تنگ جیس زہد کیوں والا گندہ سا محلہ تھا۔ جس میں اس کا ڈھائی سرے کے لاؤمنز مکان تھا۔ چلی منزل سے سینٹ کا لپ تھا لیکن او بری منزل پر بنے دو کا کھنکھ سے بھی پاک تھے، سرخ اینٹیں دور سے ہی تو غیر شدہ ہونے کا اشارہ دیتی تھیں میں سخت بدعمرہ سا ہو گیا۔

اس کے لاکھ اصرار کے باوجود میں نے اندر آ کے چائے پینے کی ہائی نہ بھری۔ میں نے ساری زندگی کسی کے جذبات و احساسات کی پروا نہ کی تھی تو اب کیا کرتا۔ اس لیے اپنے چہرے کے تاگوار تاثرات چھپانے کی ذرہ برابر کوشش نہ کرتے ہوئے میں گاڑی رپوس کرنے لگا جس کی ایک پہ چنواہہ ٹنکے کالے پہلے مرل سے بچے چوہنگ کی طرح چپکے ہوئے تھے میں نے سر باہر نکال کر انہیں چند بھاری گالیوں سے نوازا چاہا کہ شہود کے مکان کے سال خوردہ سبز کچی والے لکڑی کے دروازے سے ایک نسوانی وجود کو جھانکتے دیکھا۔ مکیموں سے بھرے تاریخی بوسیدہ پردے کو ذرا سا سر کا کہ وہ کم سن، اٹھارہ سین بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ (شاید یہ میری خوش فہمی ہو اور اس کی دلچسپی اور اشتیاق کا مرکز میری نئی چم کرتی ہڈا سوک ہو جو بھائی جان نے مجھے پچھلے مہینے ہی لے کر دی تھی)

کسی دوشیزہ کا میری طرف متوجہ ہونا میرے لیے نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات تو شاید

”آپ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ سانولی سلونی نمکین سی لڑکی نے بے باک سا قہقہہ لگاتے ہوئے اضافہ کیا۔

”اور یہ عشرت.... اسے پیار سے ایش کہا جاتا ہے۔“

میں نے بیک واپس مڑ کر اس مہاسوں بھرے چہرے والی بے قد کی دہلی پتی لڑکی کو تائد انداز میں دیکھا۔ جو ”ایش“ کا خطاب پائے خود کو ایسور یہ رائے ہی تو سمجھ بیٹھی تھی حالانکہ وہ جیج ”ایش“ تھی، بھی ہوئی راہ۔

”یہ پروین.... اسے سب پری کہتے ہیں۔“

فرہنی بائل، ٹھٹھکے سے قد اور بیٹھے بیٹھے لغزش والی اس لڑکی کو دیکھ کے میں نے ان پری کہنے والوں کی عقل پہ ماتم کیا۔

”اور ایش! ساشا، یہ شہود بھائی کے کلوز فرینڈ عاشق ہیں۔“

اس کے باوجود انداز پہ میں نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا وہ مجھ سے نظریں گاڑے مسکرا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں صرف لب ہی نہیں مسکراتے، پورا جسم مسکرا اٹھتا ہے گنگنا اٹھتا ہے اور اس کی عمر کی گنگناہٹ نے وقتی طور پہ میرے حواس قفل کر دیے۔

”اور مجھے تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“ اس کے دھوک پہ میں شرمندہ سا ہو گیا میری خاموشی بھانپ کے اس نے خود ہی بتایا۔

”شہود کی چھوٹی بہن.... ریشم۔“

”آپ کو تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی، صرف ”ریشم“ کہہ دینا ہی کافی ہے۔“ میرے پریمارکس پہ وہ ٹھٹھکا اٹھی۔ اس سے میری یہ پہلی ملاقات آئندہ ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، مجھے اس کی دیدہ و لیری کی حیرت ہوئی تھی کیسے وہ بھائی کے دوست کے ساتھ شہر چھری خاک چھانا کر گئی اس کی دوستیں اکثر و بیشتر اس کے ہمراہ ہوتیں مجھے کچھ یوں ہی ساشک ہوا کہ ہونہ وہ وہی ان کے ساتھ ہوئی ہوگی جب وہ..... لیکن پھر میں سر جھٹک کے ان خیالات سے خود کو آزاد کر لیتا۔

”میری بلا سے جہاں مرضی خوار ہوئی پھرے۔ مجھے کون سے اسے دل کے سنگھاس پہ بٹھانا ہے۔ وہ تو عادی لگ رہی ہے ان تفریحیات اور عیاشیوں کی۔ جب اس کے بھائی کو خبر ہے نہ لگ رہی تو میں کون ہوتا ہوں سوچنے والا۔“

میں واقعی سنجیدہ نہ تھا اور یقیناً وہ بھی نہ تھی۔ وہ کس قماش کی لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ تو مجھے اس سے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا تھا، کالج ٹائم میں یونیفارم میں ملیوں، میک اپ

اس پسماندہ ترین محلے کے بدبودار مکان میں اس لڑکی کا ہونا تھا جو حیرت انگیز طور پر دلکش تھی۔

☆☆☆

فورٹریس اسٹیڈیم میں صنعتی نمائش ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے ہماری کپہنی کی مصنوعات کے لیے ایک خاصا بڑا انشال خرید ا تھا اس دن انہوں نے مجھے آرڈر دیا کہ میں کالج جانے سے پہلے ایک چکر وہاں کا لگا جاؤں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے اس انشال کی آرائش کا کام ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔

عابد مجید روڈ سے میں نے ٹرن لیا ہی تھا کہ ”برائٹ فوچر اکیڈمی“ کے آگے کھڑی چند لڑکیوں کو لفٹ کا اشارہ کرتے دیکھا۔ اگرچہ ان کا سفید یونیفارم کانٹھوں سے لٹکے بیگ اور سینے سے لگی فائلز انہیں اسٹوڈنٹس ظاہر کر رہی تھیں۔ لیکن اس طرح لفٹ مانگنے والی عورتوں کو ظاہر ہے بد نظیر ہی سمجھا جاتا ہے میں نے بھی یہی رائے قائم کی۔

”جان بوجھ کر بھی یہ طالبات والا حلیہ اختیار کر لیتی ہیں۔ تاکہ پولیس تنگ نہ کرے۔“

میں نے سوچا۔ قریب سے گزرتے ہوئے میری سرسری سی نظر دائیں جانب اٹھی۔ اور میں چونک اٹھا۔ سفید شلواری قمیص میں وہ سیاہ چمکدار بالوں کی دو چوٹیاں کیسے ماتھے پہ چند لٹیں بکھرے بلکے بلکے میک اپ اور مسکراتے لبوں کے ساتھ وہی کم عمر حسین کی لڑکی تھی جو میں نے اس دن بھوکے دروازے پہ دیکھی تھی۔

بلا ارادہ ہی میرے جبر بریک پہ جا پڑے اور کار ایک چرچاہٹ کے ساتھ ان سے دو فٹ آگے رک گئی۔

ان چاروں لڑکیوں نے یکدم یلغار کر دی۔ میں بڑبڑا کے ان تینوں کو پیچھے گھستے دیکھ رہا تھا کہ میرے برابر کار دروازہ کھٹ سے بند ہوا۔ گود میں بیگ رکھے۔ خچر دلی انگلیوں والے گھائی اتھ سے بال سنواری وہ میرے برابر بیٹھی مجھے مسکرا کر ہیلو کہہ رہی تھی۔

مڈل کلاس سے وابستہ ان لڑکیوں کی بے باکی، بے تکلفی، بلکہ دیدہ و لیری واقعی قابل حیرت تھی۔

”اور.... یہ....“ میں نے کن ہتھکھو سے اپنے برابر بیٹھی اسے دیکھا جو تعارف کا مرحلہ بھار ہی تھی۔

”یہ حشر ہے، ہم اسے ساشا کہتے ہیں۔“

کے ہوئے ناز و ادا کے جلوے بکھیرتی کوئی لہرو لڑکی اگر سڑکوں پہ کھڑی لفٹ ہانگتی نظر آئے تو آپ اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے تو قائم نہیں کر سکتے ناں۔

گھر کے وہی حالات تھے فرق صرف یہ پڑا تھا کہ گھر کے روکھے پیچھے تھے ہوئے ماحول میں فہد کی ننھی ننھی قلقلاریاں گونجنے لگیں۔ ماں کے مرتبے پہ فائز ہوئے بھی شرمین کی فطرت میں شہراؤ پیدا نہ ہوا۔ گھر سے عدم دلچسپی، شوہر سے بے زاری اور گھر کے گھٹے ماحول (بقول اس کے) سے نفرت جون کی توں تھی۔ اب ایک ننھا سا بچہ اس کی لاپرواہیوں کا شکار ہونے کے لیے موجود تھا۔

☆☆☆

فہد چار ماہ کا تھا جب اس کے عقیقے کی تقریب منعقد ہوئی اور میں نے چیدہ چیدہ دوستوں کو انوائٹ کیا۔ چونکہ یہ گھر بلونیت کی تقریب تھی اس لیے میں نے انہیں ٹیلیفون کے ساتھ مدعو کیا۔ شوہر کو بھی ”دو جلی“ ہی بلایا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

اپنی حرکت کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب وہ ج بن کے اس فٹکن میں موجود تھی۔ وہ دیوانہ وار میرے اور گرد منڈلا رہی تھی۔ اسے نہ اپنی ماں کی فکر تھی، نہ بھائی کا دھیان تھا۔ اسی التفات کا مظاہرہ وہ امی جان سے بھی کر رہی تھی۔ ”آئی جی، آئی جی“ کرتی وہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اتنی سرگرم عمل تو میری کزنز تک نہ تھیں وہ جان بوجھ کر اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلانے لگی تھی۔ فٹکن کے دوران ہی میرے عزیز و اقارب میں چھ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ شرمین بھی کڑی نظروں سے اس کے تیر بھانپ رہی تھی۔ بھائی جان بھی ایک دوبار اشاروں و اشاروں میں اس کے بارے میں استفسار کر چکے تھے، وہ جتنی بار بھی میرے قریب ٹا رہو جانے کے انداز میں آئی۔ مجھے اپنے بے تکلف کزنز اور دوستوں کی جھپٹ جھڑکا نشانہ بننا پڑا۔ یہ صورت حال میری برداشت سے باہر تھی۔ اس کا مجھ سے تعلق ایسا ہی تھا جیسا میرا اس سے، دونوں جانب ہی کوئی جذباتی وابستگی موجود نہ تھی۔ مجھے مخالف صنف کی کشش نے باندھ رکھا تھا تو وہ حسرتوں اور محرومیوں کے سائے میں ملے کے بڑی ہونے والی اچھی تربیت سے تیسرے محرم ایک سطحی لڑکی تھی۔ جسے صرف میرے ساتھ گاڑی میں چرہ نہا، ہوٹلنگ کرنا پسند تھا یا کبھی بھگوار کے پلٹے پھٹکے لفٹس جیسے اب اسٹک، کیسٹ، ریڈی میڈ سوٹ، چاکلیٹ وغیرہ نہ جانے میری طرح اور کتنے اسے نواز چکے ہوں گے۔ میں نے تو اس بارے میں سوچنا تک نہیں گوارا نہ کیا تھا۔ لیکن ان میں اور مجھ میں ایک فرق تو یہ تھا کہ وہ بھی ان کے گھر تک نہیں پہنچ سکتی ہوگی اور نہ ہی کبھی اس نے جانے کا خواب ہی دیکھا ہوگا لیکن شہد کی وجہ سے میں نے ان خود

اسے اپنے گھر آئے، اپنی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک شاندار موقع فراہم کر دیا۔ اس نے اس تقریب میں میری امی جان سے قریب تر ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے ہی روز وہ مجھ سے رشتہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی تھیں۔

”خدا کا واسطہ ہے امی! اسے طور پہ اندازے لگانے کی کوشش مت کیجئے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ شوہر اداوست ہے اور وہ بس اس کی بہن، میں اسے ٹھیک طرح سے جانتا تک نہیں۔“

”لگتا تو نہیں وہ تو تم سے خاصی فریک لگ رہی تھی۔ بلکہ ہم سب کو ایسا لگا کہ تم نے اسے بطور خاص ہم سب سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔“

”واٹ ریلیش۔“ بھائی جان کے کہنے پہ میں پھٹکا اٹھا۔ ”کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے بلاوجہ دوسروں کے سر پہ سوار رہنے کی یا ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی جھاڑنے کی۔“

”خیر جو بھی ہے، مجھے تو وہ بچی اچھی لگی۔“ امی نے سادگی سے بحث سمیٹنے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ فلنڈری اور خوش مزاجی اس کی عادت ہے تو اور بھی اچھی بات ہے اگر تم نے پہلے ایسا نہیں سوچا تو چلو اب سوچ لو۔“

”آپ سب کو ہو کیا گیا ہے۔“ میں جاننے سے قاصر تھا وہ سب یوں اس کے دیوانے کیوں ہو رہے تھے وہ واقعی خطرناک حد تک ذرا مہ باز لڑکی تھی۔

”پہلے تم تاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے۔ بلاوجہ استے کیوں چڑھے ہو۔ کہیں یہ چور کی واڑھی میں تنکا دل بات تو نہیں۔“ باقر بھائی جان نے چھیڑا۔ میں اپنے کلین شیو چہرے پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔ اب تک خاموشی سے بیٹھی فیشن بیگزین کا جائزہ لیتی شرمین نے کبھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”میرے خیال میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ کم آن عاشر، ماں اب بھی جاؤ کہ وہ تمہارے دوست کی بہن نہیں۔ بلکہ وہ شوہر تمہاری دوست کا بھائی ہے۔ یہاں کون سا خال ملنا رہا میں حائل ہے جو تم جھک رہے ہو۔“

”تم توج میں مت بولو۔“ میں پہلے ہی چھلایا ہوا تھا۔ اس کی دخل اندازی نے مجھے حلق تک کڑوا کر دیا۔ باقر بھائی جان ہمیشہ کی طرح میری بد مزیزی پہ تو یوں چڑھا کہ وہ گئے۔ میری اس کے ساتھ بد مزیزی سے ان کا موڈ ہمیشہ خراب ہو جاتا تھا۔

”کیوں..... کیوں نہ بولوں۔ باقر آپ مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں سب کے

درمیان نہیں بیٹھتی، ہنسی بولتی نہیں ہوں۔ ای کو بھی یہی شکایت رہتی ہے کہ میں ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل ل نہیں سکی، تو بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ساری بات آپ کے سامنے ہے۔ ایسا کیا برسل معاملہ ڈکس ہو رہا تھا۔ جس میں دخل اندازی کا مجھے حق نہیں، میں نے ایسی کون سی معیوب بات کہہ دی جو عاشر بھڑک کے مجھے خاموش کر رہا ہے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے جو یہاں چلی آتی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہی ٹھیک ہوں۔ مجھے سے اب گلہ مت کرنا، الگ تھلگ رہنے کا۔ میرے سب سے کٹ کے رہنے کی وجہ عاشری ہے۔ یہ کب چاہتا ہے کہ.....“

حسب عادت لہا سا پتھر جھڑنے کے بعد وہ ٹسوے بھانے لگی۔ امی کے پاس سوئے ہوئے ہند کو اس نے اٹھایا اور اسے کمرے میں جانے لگی۔ بھائی جان بیمار کی شکل بنا کے امی جان کو مدد طلب لگا ہوں سے دھنسنے لگے۔ یہ ڈر ہے تو اکثر و بیشتر ہوا کرتے تھے لیکن آج یہ سین ہونے پہ میں نے شکر کا سانس لیا کہ اگر کم شرمین کے غیظ و غضب کے آگے بند باندھنے میں مصروف امی جان وہ تکلیف دہ ذکر تو بھول جائیں گی اور یہی ہوا کسی ریشم، کہاں کی ریشم..... وہ سب بھول بھال شرمین کو پکڑ کے بٹھانے لگیں۔

میں نے اپنی ماں کو ہمدردی سے دیکھا، ایک ہی بہو نے ان کے سارے دم ختم کا خاتمہ کر دیا تھا اور وہ دوسری لانے کے پتھر میں ہیں..... اور وہ بھی ریشم جیسی پناہ..... خیر امی جان بھی کیا کرئیں، ریشم کا جو رویہ تھا قہر رات کو کوئی بھی غلطی کا شکار ہو سکتا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی۔ حسین تھی اور معصوم۔ ”نظر“ آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں لیکن میں انہیں کیا بتاتا کہ ہر خوبصورت نظر آنے والی چیز ”اچھی“ نہیں ہوتی اور اگر وہ پوچھ بیٹھیں کہ وہ ”اچھی“ کیوں نہیں تو میں کس منہ سے انہیں اس کے کرتوتوں سے آگاہ کرتا۔ جب وہ مجھ سے ملی تو اس کے کھلے ڈلے انداز، بے باکی اور بے تکلفی نے مجھے بار بار کرا دیا تھا کہ میں اس کا پہلا شکار نہیں۔

ریشم سے چھ سات ملاقاتوں کے بعد ہی جب اس کا حسن بے کدش سا لگنے لگا تھا، میرا پندل مجھے ہزار سلواتیں سنار ہا تھا اس قدر بدذوقی کا مظاہرہ کرنے پر۔ ”شرمین بچے، کیوں اتنا سیدھا سوچتی ہو۔ یہ عاشر تو ہے ہی ہڑ بولا۔ تمہیں کیا آج پتا چلا ہے، بچپن سے اسے جانتی ہو پھر بھی اس کی ادنیٰ بوکی باتیں دل سے لگاتی ہو۔ بھلا تم کیوں کمرے میں بند ہونے لگیں۔ تم تو میرے گھر کی پہلی پہلی روتی ہو۔ تمہیں کیا میں کمرے میں بند رکھنے کے لیے لائی ہوں، میرے گھر کی خوش، میرے آسائش کا اجالا۔“

امی جان نے ستر کی دہائی میں بننے والی اردو فلموں میں بولے جانے والے

سارے ڈراما لگ اس بے حس اور کھڑکی پہ لٹا رہے۔

”میں کی شو پیس ہوں، ڈیکوریشن کی چیز ہوں، جسے آپ کو نے میں کھڑا کر کے روشنیاں نکھیریں گے۔ جہاں میری زبان بندی کے حکم ہوں وہاں بیٹھنے کا کیا فائدہ، آپ کو تو ڈی چاہیے، لے آئیں وہی۔ اس کے دوست کی بہن۔ غریب غریبا، بچی آبادی کے رہنے والی..... شمیم و مسکین سی لڑکی، شادی سے پہلے بھی آپ کے ہیرہ دھو کے پی رہی تھی۔“

ایسی ہی کنیز تھیں بھولانی تھی تو بڑے بیٹے کے لیے بھی کسی۔ کچی آبادی سے چھائی کی ہوتی یا دارالامان سے شغف کی ہوتی۔ میں اپنے ماما پاپا کی لاڈوں ملی ہوں، صاحب جانیاد ہوں۔ میری بیک بھی مضبوط ہے اور بیگ کراؤنڈ بھی..... کسی سے دب کے وہ رہیں جن کی چیزیں کمزور ہوں۔“

نجانے ایسی باتیں وہ کہاں سے سیکھ کے آتی تھی، جو سر سے پیر تک سلگ کے رکھ دیتیں۔ مجھے بھی یکدم آگ لگ گئی۔

”بھائی جان! اگر اس گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں دیکھنا چاہتے تو خدا کا واسطہ ہے اس ”لاڈوں ملی“ اور ”صاحب جانیاد“ کو اپنے کمرے میں لے جائیں، ورنہ..... مزید اپنی ماں کے بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”عاشر! اپنی ماں کے بے عزتی میں بھی برداشت نہیں کر سکتا مگر مجھے بڑے انوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ساری جوتھیں کے ذمہ دار تم ہو۔ صرف تم، ہمیشہ تہاڑی وجہ سے ہی گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔“

”کیا.....؟ میری وجہ سے؟ میں اس گھر میں پچھلے تیس سال سے موجود ہوں اور ماحول کب سے خراب ہونا شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ بہتر جانتے ہوں گے۔“ مجھے ان کا بیوی کے سامنے ڈانٹا پسند نہ آیا۔

”دیکھا آپ نے، یہ تو سونڈوں پہ بھاری ہے، ایسے تاک تاک کے طنز کرتا ہے۔“

”تم چپ رہو شرمین! بات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ باقر بھائی نے اسے جھڑکنے کی ہمت کی وہ فوراً بھڑک اٹھی۔

”اپنی امی اور بھائی کے سامنے مجھ پر رعب جمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں نصف صدی پہلے کے مڑے ہوئے سماجی ناول کی ہیروئن نہیں اور اپنے رعب و جلال کا مظاہرہ کرنے کا شوق ہو تو پھر بیویاں بھی ویسی پسند کرنی چاہئیں جیسے کہ آپ کے بھائی نے کی ہے۔“ وہ گھوم پھر کے پھر سے وہیں آگئی۔ ”ایسی فقیریاں جوتی تے دب کے رعبی

ہوں گی۔ مجھ سے اونچی آواز میں بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ تن فہن کرتی جانے کو تھی کہ میں نے آواز دی۔ اے ای کے باز رہنے کے اشارے کو میں خاطر میں نہ لایا۔
 ”ایک منٹ شرمیں..... پہلے تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کروں کہ رشیم سے میرا کسی قسم کا کوئی تعلق ہے۔“

ایسی کوئی بات ہے اور نہ ہونے کا امکان ہے، میرا ذوق اتنا گھٹیا نہیں، نہ ہی معیار اتنا گرا ہوا ہے۔ ختم اپنا یہ نام نہاد فیملی بیک گراؤنڈ برائے نام ہی جائیداد، اور گھسا چاسن و جمال سنجال کے رکھو۔ جس فیملی بیک گراؤنڈ کا حوالہ تم دے رہی ہو، شاید یہ بھول رہی ہو کہ میری ماں بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ظاہری کشش کے علاوہ تم میں ہے ہی کیا۔ میری پسند آتی سچی نہیں، تم کیا زمانہ دیکھے گا کہ عاشر ملک کی شریک حیات ہر لحاظ سے بے مثال ہوگی۔“

میں نے چلتے چلا وہ پھر پختی اندر چلی گئی۔
 ”حذر کرتے ہو عاشر! واقعی عورتوں کی طرح لڑنے پیٹھ جاتے ہو۔“ اے ای جان نے بے چارگی سے کہا۔

☆☆☆

دو تین سال اور اڑھتیسہ سرے گزر گئے۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ بھائی جان نے مجھے آفس جوائن کرنے کو کہا تو میں نے بغیر سوچے سمجھے انکار کر دیا۔
 اگلے چند ماہ تک میں جاب کی تلاش میں مصروف رہا، میں نے گھر پہ وقت گزارنا اور بھی کم کر دیا۔ تینیاں دن بدن بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ شرمین نے مجھ سے اچھے اچھے اور ای جان کو تنگ کرتے کرتے اب ہند کے ساتھ بھی وہی سلوک شروع کر دیا۔ وہ خفا سا بچہ، ضدی اور اکڑ ہاں کے رویے کی بھیبت چڑھنے لگا۔ وہ نہ تو اسے ای کے پاس زیادہ رہنے دیتی اور نہ ہی خود مناسب توجہ دیتی۔ اس کی ضد اس کے لیے کوئس کھوانے کی تھی۔ جب کہ بھائی جان بھی ای جان کی طرح مخالف تھے، ان کے خیال میں اگر شرمین کو اس ذرا سی ذمہ داری سے بھی آزاد کر دیا گیا تو وہ گھر میں اتنی بھی دیکھی نہ لے گی۔ یعنی کاب پیٹ کی وجہ سے لینے پر مجبور ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی تھی، فہم تغیر ایسی طرح چل رہا تھا جیسے کہ عمو بائن ماں کے بچے پلا کرتے ہیں۔

پہلے ایک ڈیڑھ سال تک ای جان نے ہی اس کی ساری ذمہ داریاں پوری کیں، اسے تھلانا، دھلانا کھلانا، پلانا، سنانا، پھرا چا ک اسے نجانے کیا خیال آیا کہ وہ اب اسے کم سے کم داری کے پاس چھوڑنے لگی، دو سال کی عمر میں اس نے بھائی جان سے

لڑ بھگڑ کے اسے ڈے کیٹر سنیز میں ڈال دیا۔ اب وہ بچے گروپ میں تھا اور تو قلی زبان میں اسے سی کی اور دن ٹوکے رہنے لگا گیا کرتا۔ رات کو بھائی جان کے گھر ہونے کی وجہ سے وہ بیچارہ بھی اپنے کھلونوں سے اٹنے پڑے نہ کرے سے آزاد ہوتا۔

میں ایک گھنٹہ اس سے کھیل کر، باتیں کر کے گزارا کرتا ہوں۔ اب گھر میں..... خصوصاً شرمین کے ساتھ میری منہ ماری کم ہوتا شروع ہو گئی۔ یہ شوق اب وہ شوہر کے ساتھ پورے کیا کرتی۔ باقر بھائی جان بھی شاید بی تو بلی کے حشر سے آزاد ہو چکے تھے، آئے دن خوب معرکے ہوا کرتے۔ میں مطمئن اسے ہند کو پیٹ بٹھائے لیٹا رہتا۔

جواب تو ابھی تک نہ تھی، فی الحال میرے کرن نوید نے مجھے ایک آخر دی۔ نوید اور میں اب اپنی سن تک ایک ساتھ پڑے، پھر وہ بوسن یونیورسٹی چلا گیا۔ پچھلے ہی سال وہ واپس آیا۔ میرے تایا جان اور ابو جان کسی زمانے میں مشترکہ برنس کرتے تھے۔ پھر بدلتے وقت کے تقاضوں کے تحت دونوں نے الگ الگ قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور اس میں خاصہ کامیاب بھی رہے۔ تایا جان کا کاروبار اب ان کے دونوں بڑے بیٹے سنبھال رہے تھے۔ نوید کا مزاج کچھ میری طرح تجرباتی تھا اس نے بڑے بھائیوں کے اندر رہ کر کام کرنے کی بجائے خود کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ تایا جان نے اس کے حصے کا سرمایہ اسے دے کر خوش دلی سے اجازت دے دی۔ نوید نے مجھے یہ پیش کش کی کہ اگر میں ہوں تو اس کا برنس پارٹنر بن سکتا ہوں مجھے بھی یہ آئیڈیا پسند آیا۔ بھائی جان کی زیر نگرانی کام کرنے کے خیال سے بک کے میں جاب کرنے کا فیصلہ کر تو بیٹھا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ جاب میرے مزاج کے خلاف ہے۔ نوید کے ساتھ برنس شروع کرنے میں مشکل اس لیے بھی نہ ہوئی کہ تایا جان خود بھائی جان سے میری بات کریں گے اور حصہ مانگنے والا تنازعہ بھی نہ کھڑا ہوگا۔

یہ کام تیزی سے شروع ہوا میں خاصا بر جوش تھا اور نوید بھی... نوید میری عادت و فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بات مجھی میرے لیے سود مند تھی بلکہ اس کے لیے بھی، وہ جانتا تھا کہ اگر میری ”میں“ کو نہ پھینچا جائے تو میں ٹھیک ٹھاک کام کر سکتا ہو۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا، میں مطمئن تھا۔ لیکن تھا..... خوش تھا..... ایک ٹی بٹدی روڈ میں انکف شروع ہونے جاری تھی، گھر کی ٹینشن اب میرے سر پہ کمرے کم سوار ہو کر گئی۔

میرے مزاج بھی اس کا خوشگوار اثر ہوا۔ پہلے جو میں بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا، اب مقابل کی بات سن بھی لیتا تھا اور کچھ چھی لیتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ ای جان

کے بھی میں اور قریب ہو گیا اور بھائی جان سے جاری سرد جنگ بھی کمزور پڑنے لگی۔
 شرمین سے میں نے لائقیتی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا بچپنا اور حکم جوں کی توں تھی
 اب بھی وہ مجھ سے بلاوجہ الجھنے کی کوشش کرتی رہتی لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ پا
 کے جھلا جاتی۔ میں اب بھی اسے دیکھ کر اداس سے سن کر خاصی کوفت کا شکار ہوا کرتا لیکن
 اب میں نے بقول اس کے مندوں والی طعنہ زنی بند کر دی تھی، بلکہ پہلے پہل اس سے کیے
 گئے زبانی کلامی معرکے یاد آتے تو ابی جانتیت پھٹی آ جاتی۔

نئے برس کی مصروفیات اپنے عروج پہنچیں۔ ابھی تک تو ہمارا اسٹاف بھی مکمل نہیں
 ہوا یا تھا۔ میں حسب عادت بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہتا تھا۔ جیسے ہی کسی ورکر کی
 طرف سے بے اطمینانی محسوس کرتا، اخبار میں اشتہار دے دیتا۔ اس دن بھی امیدواروں
 کے انٹرویوز رہا تھا کہ میری ملاقات اس سے ہوئی۔

”زیٹا سے..... زیٹا عمر سے.....“

اسے دیکھ کے میں چونک اٹھا۔ حالانکہ اس میں چونکا دینے والی کوئی بات تو نہیں
 تھی۔ وہ عام کی نہیں تھی۔ عام کا مطلب معمولی ہی ہونا ہے ناں، باپچر دیکھی جیسی بہت سے
 لوگ ہوتے ہیں۔ تو اگر عام کے یہ مطلب نکلتے ہیں تو پھر وہ عام ہرگز نہیں تھی۔
 وہ خاص بھی نہ تھی..... خاص کا مطلب بہت الگ..... بہت منفرد یا پھر سب سے
 نمایاں ہوتا ہے ناں۔ تو پھر وہ خاص بھی کیسے ہو سکتی ہے۔

اٹھارہ بائی اٹھارہ کل کمرہ، باہر کے حدت آمیز ماحول..... تیز تر دھوپ، جان لیوا
 گرمی سے محفوظ، اے سی کی ٹھنکی سے نعمت لگ رہا تھا، فضا میں ایر فریجنز کے ذریعے چیلنگ کی
 ہلکی ہلکی مہک بھیلی ہوئی تھی۔ فرش پہ دبیز ڈارک گرے کارپٹ، سفید یواریوں پہ صادقین
 اور گل جی کے نادر اور قیمتی فن پارے آرائش کے سن کو چار چاند لگانے کے ساتھ ساتھ
 آفس کے مالک کے اعلا ذوق اور اونچے پینک پینٹس کی بھی نشاندہی کر رہے تھے۔ ایک
 جانب بڑا بھاری گرے صوف سیٹ جس کی سینئر ٹیل پہ بیٹش قیمت کرشل پیسز پڑے تھے۔
 اونچی منٹش چھت پہ لگے جدید آرائش گھنے، جیشے کی دیوار کے اس طرف بڑی سی آہوی
 ٹیلی۔ جس کی گلاس ٹاپ پہ فون سیٹ، کمپیوٹر، فائلز پڑی تھیں۔

ایک جانب تاپا جان بیٹھے تھے، جو اٹھا قہا ہی آج نوید سے ملے اور آفس کا جائزہ
 لینے آئے تھے اور پھر انٹرویو ہوتا دیکھ کے دلچسپی سے وہیں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ہی رشید
 صاحب بیٹھے تھے جو موجودہ اسٹاف میں واحد تھے جن میں مکمل ہوسر اور اطمینان رکھنا
 تھا۔ وہ انٹرویو میں میری معاونت کر رہے تھے۔ نوید کسی میننگ کے سلسلے میں بی سی گیا ہوا

تھا۔ میری بیکر ٹری رہیگا لارنس میری دائیں جانب بیٹھی تھی، ایک کے بعد ایک امیدوار آتا
 یا آتی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی سب مرعوب سے ہو جاتے۔ ہمارا
 برنس ابھی مکمل سیٹ نہیں ہوا تھا، ہماری ساکھ ابھی بننا باقی تھی، لیکن میں نے آفس کی جج
 دج اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے ایسی کرانگی تھی جیسے یہ ملک کے ٹاپ برنس میں کا ایما پار
 ہو۔ سب میری ذاتی تسکین کے لیے تھا اور واقعی میری تسکین ہو بھی رہی تھی۔ جب میں
 کسی کو گردن کھٹکا تھا اس کے آرائش کا جائزہ لینے دیکھتا لیکن..... وہ..... اندر آئی۔ بغیر ادھر
 ادھر دیکھے۔ بغیر میرے کہنے کا انتظار کیے کر سی بیجج کے میرے مقابل بیٹھ گئی اور یوں
 یوں بیٹھ گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو، ہو گیا ہے..... میں کیا کہتا، میں سوچنا ہی رہا۔

”آخر کیوں..... کیا بات ہے اس میں..... کیا وجہ ہے جو میں بار بار الجھ رہا ہوں، چونکہ
 رہا ہوں، کیا کھوج رہا ہوں۔ میری عدم دلچسپی اور کھوئی کھوئی کیفیت کو رشید صاحب نے
 میری ٹھکن پہ محمول کیا۔ ویسے بھی اب تک میں کوئی بارہ امیدواروں سے اٹلے سیدھے
 سوالات کر چکا تھا۔ وہ خود ہی اس سے انٹرویو کرنے لگے۔ میں اس پوزیشن میں تو نہ تھا کہ
 اس سے کچھ پوچھ پاتا، لیکن حیرت انگیز طور پر میرا ذہن اس کے لفظ لفظ کو اندر اتار رہا تھا۔
 اور میں نے یہ اعتراف کرنے میں دقت نہ لگایا کہ وہ واقعی ذہین اور قابل ہے۔ تاپا جان
 بھی اس میں دلچسپی سل رہے تھے۔

”لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوئی واحد تو ذہین نہیں ہے۔ ذہانت ہی نہیں۔
 کچھ اور بھی ہے اس میں..... کچھ اور..... جو چونکا رہا ہے۔“ میں ایسی ہی نہیں میں گم رہا
 اور وہ چلی گئی۔

”میرے خیال میں تو یہ مختصر مدتی سوٹ کرتی ہیں، بلکہ بیٹھ ہیں اب جو عاشق کی
 رائے ہو۔“ رشید صاحب نے بات مجھ پہ چھوڑی۔ میں نے تاپا جان کی جانب دیکھا۔
 انہوں نے سر ہلایا۔

”میرا تجربہ تو اسی کے حق میں ووٹ دیتا ہے۔“

زیٹا عمری سب کی متفقہ چوائس بن گئی۔ نوید اس سے ملا نہیں تھا لیکن آفس آکر
 اس کی وی دیکھنے کے بعد اس نے بھی اسی کے حق میں ووٹ دیا۔ اس نے اگلے ہی بیٹھے
 آفس جوائن کر لیا۔ اتفاق سے وہ جس پوسٹ پہ اس کا واسطہ زیادہ تر مجھ سے رہتا۔ اس
 طرح ہر پیشگی رخ پہ تو توں میں ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہو گئی۔ وہ میرے
 کام کی اپروچ کو سمجھنے کی ادرا سی کے مطابق اپنی ڈیوٹی دے گئی۔ مین میں ابھی تک سمجھنے
 سے قاصر تھا..... وہ ایک بات.....

ایسے گہرے براؤن سیدھے بال بہت ہی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ اس کی طرح اور بھی بہت سی لڑکیوں کی آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ آنکھوں، لبوں اور ناک کی بناوٹ میں بھی کوئی چمکا دینے والی بات نہیں تھی۔ مسکراہٹ بھی نہ لگدگانے والی تھی، نہ مونالیزا کے جیسی ذوق کے ابھرنے والی، مدغم مدغم آواز میں گھٹکیوں کا ردھم تھا، نہ آبشاروں کا ترنم..... ایسی کتنی ہی لڑکیاں ہوں گی۔ بہت سے لوگ اس سے زیادہ ڈچین، اس سے زیادہ خوش لباس ہوں گے۔ پھر وہ خاص کیسے ہو سکتی ہے۔ منفرد کیسے ہو سکتی ہے۔

لیکن اسے عام بھی نہیں کہا جاسکتا، وہ عام کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی سادہ سی بے ریا آنکھوں کے آئینے کتنے شفاف تھے۔ اس میں کتنا رعب، کتنا تقدس تھا اور ساتھ ہی ساتھ کتنی معصومیت بھی۔ کبھی ایسا لگتا یہ کسی مفکر کی آنکھیں ہیں۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے کسی سادھوی کی آنکھیں ہوں، گیان میں ڈوبی ہوئی۔ کبھی لگتا کوئی نوازیہ پتھر دنیا میں آنے کے بعد اپنی معصومی حیران آنکھیں پوری کھولے نظر میں گھما گھما کے سب طرف دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہر چیز اس نے پہلی بار دیکھی ہو۔ یہ حیرانی، یہ گیان، یہ سب عام نہیں تھا۔ بہت خاص تھا۔ بہت خاص۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہر وقت تھی نہیں رہتی تھی۔ لیکن اتنی ناپاب بھی نہ تھی۔ اس مسکراہٹ کے اندر کوئی حمید نہیں تھا، جسے کھوجنے میں عمریں بیت جائیں، اس مسکراہٹ میں اتنے رنگ نہیں تھے کہ ہر جانب پھول پھول جائیں، اور اس مسکراہٹ میں دل لگدگدا دینے والی شوفی بھی نہ تھی کہ ایمان سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سا اپنا پن ضرور تھا۔ وہ صرف مسکرائی..... ہاں صرف مسکرائی، لیکن ایسا لگتا جیسے کسی بہت اپنے نے، بہت چاہنے والے نے ہاتھ تھام لیا ہو۔ اکثر اس کے مسکرانے پر میں چونک کے اپنا ہاتھ دیکھنے لگتا، مجھے یوں لگتا جیسے کوئی گداؤ لطف کس اسے چھو کر گزرا ہو۔ کب یہ احساس اس دنیا میں کسی اور کی مسکراہٹ سے ہوتا ہے..... نہیں نا..... تو پھر یہ تبسم عام کیسے ہو سکتا تھا۔

مجھے احساس ہی نہ رہا کہ اس طرح کسی دوسرے کے بارے میں بے چکان سوچے چلے جانا تو کبھی میری عادت نہیں رہا۔ مجھے تو صرف خود پر توجہ دینے کی عادت تھی۔ میں تو صرف خود کو سوچتا تھا۔ تو زینا عرفیہ رفتہ رفتہ میرے حواس پر سوار ہوئی۔ پہلے پہل میں نے خود اسے موقع دیا، اپنے ذہن اور دل دونوں کو بالکل بے دست و پا کر کے اس کے سامنے رکھ چھوڑا اور جب وہ پوری طرح مجھ پر، میری سوچوں پر حاوی ہو گئی تو اب مجھے مزاحمت

کرنے کا خیال آیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میرے دل نے اسے ”خاص“ تسلیم کر لیا تھا اور اب دماغ کی کسی تاویل کو وہ خاطر میں لانے پر تیار نہ تھا۔

☆☆☆

”عاشق! آپ یہ اماؤنٹ چیک کر لیں۔ اگر ٹھیک ہے تو میں بل ”راوی اینڈ کمپنی“ کے لیے تیار کروا دیتی ہوں۔“

زینا نے میرے سامنے فائل رکھتے ہوئے کہا۔ ہمارے آفس میں باس، میڈم اور سر والا کوئی تکلف نہ تھا۔ وہ سناٹا ماحول میں کام ہوتا تھا۔

”اگر تم نے چیک کر لیا ہے تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سائن کر دیے، وہ جانے لگی تو میں نے آواز دی۔

”زینا! میں بچ کے لیے جا رہا ہوں، کراتم میرے ساتھ چلو گی۔“
مجھے اکیلے جانے میں ہمیشہ آکسی آتی تھی۔ حالانکہ اسی روڈ پر بہت سے ریسٹورنٹ تھے، کبھی دور نہ جانا پڑتا لیکن نوید نہ ہوتا تو میں یہیں آفس میں چائے یا کولڈ ڈرنکس کے ساتھ سینڈو چڑھوا لیتا۔ جو مجھے ذرا بھی پسند نہ تھے لیکن مجبوراً آج تو میں ناشتا بھی ڈھنگ سے نہ لے پایا تھا۔ اس لیے بچ بھر پور لینا چاہتا تھا، ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آفس میں چلی آئی اور میں بے ارادہ ہی اس سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے بغیر کسی تذبذب میں پڑے، بنا کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے فوری جواب دیا۔
”ہی۔۔۔۔۔“

”کیوں.....؟“ میری تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ چاہتی تو کہہ سکتی تھی کہ مجھے یہ سب پسند نہیں..... آپ سے میرا رشتہ اس آفس تک ہے..... میں ہونلگ کر نا اچھا نہیں سمجھتی۔ میری فیملی کزنز ریو ہے۔ میں ایسی لڑکی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ان موقع اعتراضات کے جواب بھی میرے پاس تیار پڑے تھے۔

”میں کون سا آفس سے باہر رشتہ جوڑنے جا رہا ہوں۔ کو لیگ کی حیثیت سے ہی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”جب آفس میں مردوں کے ساتھ جاب کرنے میں برائی نہیں تو ہونلگ کرنے میں کیا برائی ہے۔“

”تمہاری فیملی کو تمہارے گھر سے نکل کے کمانے پر اعتراض نہیں تو پھر کیسی کزنز ریو ہے۔“

”میں بھی کوئی ایسا دیا انسان نہیں۔“ وغیرہ وغیرہ لیکن اس نے اپنی مخصوص

مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ پوچھا۔
 ”کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ لُچ کے لیے۔“ میں ہلکا ہلکا سا ہوکے
 اپنا موبائل اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ ہویا۔ مجھے اپنے سوالوں کا جواب بس ملنے ہی والا تھا
 اگر وہ بغیر کسی سوال کے میرے ساتھ چلی پڑتی تو عام سی لڑکی کہلاتی..... اگر وہ سب
 اعتراضات دہرائی جن کی مجھے توقع تھی تو..... تو عام تو..... لیکن اس نے مجھے لُچ کی آخر کی
 تو اس کا مطلب ہے کہ وہ..... لیکن کیا واقعی اس سے اس کا خاص ہونا ثابت ہوتا ہے میں
 یقینی سے کچھ کہہ نہ سکا۔

اور تب میں حیران رہ گیا جب وہ مجھے لیے کاس روم کی طرف چلی آئی۔ لُچ آدرا
 شروع ہو چکا تھا۔ اسانف لمبی سی ٹیبل کے گرد اپنے لُچ کا سبز کھولنے کی تیاری کر رہے
 تھے۔ کچھ گھر سے لائے تھے۔ کچھ نے آرزو دے کے منگوائے تھے۔ میں فوری طور پر کچھ
 سمجھ نہ سکا۔ اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔
 ”آج عاشر ہمارے کیسٹ ہیں۔“

سب نے تالیاں بجا کے میرا خیر مقدم کیا۔ میں بغیر کچھ کہے ایک چیز گھٹیت کے
 بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے زبیا نے اپنا لُچ باکس کھول کے میرے سامنے کیا۔ ٹیبل ٹیچن میں
 نیچے کے پراٹھے لینے ہوئے تھے۔ ٹیس سرور نے اپنے چکن سینڈویچ پیش کیے، سبز پکلی نے
 بریانی۔ میں تھیک پو پھتا سب چمکتا رہا۔ زبیا اور باقی سب لوگوں کی طرح بے تکلفی سے
 ہر باکس میں سے شیز کر رہی تھی۔ میں نے پراٹھے کا تھوڑا ٹوٹے ہوئے اسے دیکھا۔

☆☆☆

آج میں معمول سے کچھ جلدی گھرا گیا تھا، لاؤنج خالی سناں پڑا تھا۔ میں نے
 زرا دھیان دیا۔ ڈاننگ ٹیبل پہ لگا کھانا بھی چوں کا توں پڑا تھا، بلکہ ایک دو بیٹیوں میں تو
 ساکن نکال بھی لیا گیا تھا، میں حیران ہوتا آگے بڑھا، میز جھوں کے قریب کا لُچ کی پلیٹ
 ٹوٹی پڑی تھی۔ میں سمجھ گیا، ہونہ ہو شرمین نے کوئی ہنگامہ کیا ہوگا۔ جب تک باقر بھائی جان
 اس کے آنسوؤں سے گھبراتے رہے وہ صرف رو پیٹ کر کام چلاتی رہی۔ لیکن جب
 ٹسوے بہانا بے کار جانے لگا تو اب رفتہ رفتہ وہ جاہل عورتوں کی طرح کھٹکے اترے اور دنگ
 فدا دہرا کر کے پراتز آئی تھی۔ بلکہ جاہل عورتوں کی طرح کیا..... وہ خود بھی تو جاہل ہی
 تھی۔ صرف میز پر پاس..... انڈرائز، اور دس جھامٹیں بھی اس نے کیسے پاس کی تھیں یہ
 میں بھی جانتا تھا۔

ادھر ادھر دیکھتا میں فکر مندی سے امی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا کبھی

نہ ہوا تھا کہ انہوں نے کھانا یوں پڑا رہے دیا ہو۔

امی جان بستر پہ دونوں ہاتھوں سے سر تھا بے بسی تھیں۔

میری آواز پہ انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھا، ان کی آنکھیں متورم اور بے حد سرنخ
 ہو رہی تھیں۔ گنگنا تھا جیسے گھنٹوں روتی رہی ہوں۔

”کچھ نہیں، بس ذرا سر پکرا رہا ہے، کپٹیوں میں بھی شدید درد ہے۔“ میرے
 استفسار پہ کہہ لگیں۔

”اور اس سر پکرنے کی وجہ کیا ہے، وہ بھی جانتا ہوں، پلیز امی! آخر کتنی بار آپ کو
 بتانا پڑے گا کہ خود کو ان لڑائی جھگڑوں سے الگ رکھا کیجئے۔ یہ دونوں ہرگز نہیں سدھرنے
 والے۔ وہ محض لڑا جھگڑ کے بہانے سے ہفتہ ہفتہ میکر رہنے چلی جاتی ہیں۔ وہاں خوب
 تفرق اور مزے کر کے موڈ ٹھیک کیے جاتے ہیں۔ ادھر ہمارے بھائی صاحب کو موقع مل
 جاتا ہے ذرا مکمل کے سانس لینے کا۔ وہ بھی جی بھر کے اس وقتی آزادی کو انجوائے کرتے
 ہیں اور جب بچے کی یاد سنا لگتی ہے۔ تو ناک رگڑتے سرسرا جاتے ہیں۔ بیوی کو
 ممانے کے لیے ہراساں لاکھوں شاہک پہ اڑائے جاتے ہیں۔ یہ ہر مہینے بعد ہونے والا
 ڈرامہ ہے، لیکن آپ ہیں کہ اپنا دھڑ کر لیتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی آپ کا بلڈ
 پریشر انتہا درجے کا مانی ہوگا، چلیں آئیے ڈاکٹر کے پاس۔“

”نہیں بس ٹھیک ہوں، دوالی ہے میں نے۔“

”اور بھائی جان خود کہاں ہیں؟“ میں نے شرمین کے بارے میں پوچھنا گوارا نہ کیا
 کہ ہر بڑے جھگڑے کے بعد وہ گھر سے بچے سمیت نکلنے میں دیر نہیں لگاتی تھی۔

”کہاں ہوگا بد نصیب، بگ آ کے نکل گیا۔ بیچارہ اتنی کوشش کرتا ہے اسے خوش
 رکھے گی مگر..... یہ لڑکی نہ بیان سمجھتی ہے، نہ ڈانٹ۔ بگ آ کے کئی بار کہہ چکی ہوں الگ رہنا
 چاہتی ہے تو بے شک ہو جاؤ گی، لیکن باقر کہتا ہے یہ بات بھی نہیں، اسے تو خود بیوی کا علاج
 نہیں سمجھ رہا۔“ انہوں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”بس امی! رہنے دیجئے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔

”میں سب جانتا ہوں جو وقت بیوی کو رشتوں کی پہچان کرانے اور ذمہ داریوں سے
 روکنا سنانے کا تھا، وہ وقت بھائی جان نے دلہن کے لاڈ اٹھانے میں گزار دیا۔ اب
 جب اپنی سمن مانی کرنے اور بیوہ گونی کی اس کی عادتیں بچنے ہو چکی ہیں، وہ بیوی کو
 سدھانے چلے ہیں۔ اب تو صرف جگتیں ہی ہو سکتی ہیں، چلیں چھوڑیں، یہ سب
 باتیں.....“

”کیسے چھوڑ دوں، بیٹا تو وہ میرا ہی ہے، شرمین بھی غیر تو نہیں اور سب سے بڑھ کے فہد، وہ اب بڑا ہو رہا ہے۔ ماں باپ کے جھگڑوں سے سہم جاتا ہے، راتوں کو ڈر کے جاگتا ہے، کانپتا رہتا ہے۔ ان دونوں کو ذرا خیال نہیں۔“ اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں انہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کی فکر بھی نہ کریں۔ آخر فہد مجھے بھی بہت پیارا تھا۔

”اب تو تم سے ہی امیدیں ہیں۔ اللہ کرے تمہاری دلہن اتنی نصیبوں والی ہو کہ گھر میں پھر سے خوشیاں ہی خوشیاں بھر جائیں۔“ انہوں نے وہ ذکر چھین دیا جو کہ آج کل ان کا ہیورٹ تھا۔..... میں ہمیشہ کی طرح چڑا نہیں، میری خاموشی سے حوصلہ پا کے انہوں نے پوچھا۔

”تم ماشاء اللہ خود کچھ دار ہو تمہاری پسند خود بھی قابل اعتبار ہوگی۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے بیٹا تو بتاؤ۔“

”نہیں..... مجھے.....“ میں شبت سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن آنکھوں کے آگے دو سادہ سی بناوٹ والے لب مسکرانے لگے اور میرا ہاتھ..... میرا ہاتھ کوئی بوے پیار سے سہلانا لگا۔

”لو ناں۔“ امی جان نے پھر پوچھا۔

”ابھی میں کچھ کہ نہیں سکتا، میرا مطلب ہے میں نے اس بارے میں کبھی سوچا نہیں۔“

”تو کب سوچو گے؟“ انہوں نے پیار سے میرے بالوں کو بگاڑا میں مسکرا کر رہ گیا۔

”بہت جلد۔“

☆☆☆

میں نے واقعی سوچنا شروع کر دیا۔ محبت سوچ سمجھ کے نہیں کی جاتی، لیکن میں محبت کب کر رہا تھا میں تو اپنے لیے ”بہترین“ کا انتخاب کر رہا تھا۔ سالوں تک مجھے ایسی کوئی ہستی نظر نہ آئی جس پر مجھے کم از کم بہتر ہونے کا شائبہ ہی ہوتا۔ اب بیٹیا عمر واحد ایسی ہی جس پہ چند ”بہتر“ ٹپک لگے ہوئے تھے۔ وہ چند تھی، پرکشش تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، باوقار تھی، باکردار تھی، اعلیٰ ظرف تھی، خوش لباس، خوش مزاج اور خوش شکل بھی، پھر بھی ابھی اور بہت کچھ جاننا پڑھنا تھا۔

”اے بہت ریسک این ریسک نہ سہی مگر ہمارا ہم پلہ تو ہونا چاہیے۔“ میں نے نمبر ایک پوائنٹ سوچا۔

”شرمین کے مقابلے میں اس کی خوبصورتی کو زیادہ نمبر نہیں مل سکتے، لیکن خیر ہے

تعلیم کے معاملے میں تو زینا کے ہی پوائنٹس زیادہ ہیں۔“ دوسرا نکتہ اٹھایا گیا۔ حساب کتاب برابر ہوا

”بس اس کے فیملی بیک گراؤ کا اندازہ ہو جائے اتنا تو مجھے پتا ہے کہ اس کے والد ریٹائرڈ میجر ہیں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج کل تو پیسے کی دلیبو ہے.... عہدے اور پوزیشن کی اہمیت ہے۔“

میں سارے حساب کتاب کر رہا تھا۔ میرا شاطر اور محتاط دماغ میری معاونت کر رہا تھا اور میرا دل.....

میرا دل دور کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔

دور کھڑا..... ہاں بہت دور..... زینا کے قریب.....

☆☆☆

”اب آپ ریٹیکس کیجئے، باقی کام میں کروں گی۔“ اس نے فائلز اٹھاتے ہوئے مجھے مشورہ دیا، شاید میرے بار بار ہاتھ سہلانے سے اس نے اندازہ لگا لیا ہو کہ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

”کیوں کیا تمہیں ریٹیکس نہیں کرنا چاہیے۔ آخر تم بھی تو پچھلے دو گھنٹے سے میرے ساتھ ہی اس پراجیکٹ کو ڈکس کر رہی ہو۔“ وہ صرف نظریں نیچی کیے مسکرا دی۔ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”کیوں نہ کچھ دیر ہم پرنس کی بورڈ سکھن کو بھول کر بلکی پھلکی باتیں کر لیں۔ ذہن بھی ہلکا ہلکا ہو جائے گا اور ماحول بھی۔“

”شہیور.....“ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل ایک طرف رکھ دی۔

”تم نے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”میں نے انٹرویو میں سب ہی کچھ بتا دیا تھا۔ اس دن تو آپ کا رویہ ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ کچھ جاننا ہی نہیں چاہتے ہوں۔“

”بھئی میں اس قسم کے جاننے کے متعلق نہیں کہہ رہا۔ میرا مطلب ہے تمہاری فیملی تمہاری پسند، نا پسند وغیرہ وغیرہ۔“

”میں کوئی فلم اشارہ ہوں، جو آپ یہ سب جاننا چاہتے ہیں۔“ اس کے بار بار بات گھما دینے پہ میں تنگ آ گیا۔

”دوست ہو تو اور دوستوں کو دوستوں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔“

”دوست.....“ وہ جیسے مجھ سے نہیں خود سے پوچھ رہی تھی اور شاید خود سے بھی کوئی

جواب سننے کے بعد اس نے سر ہلایا اور مجھے دیکھ کے کہنے لگی۔

”ہاں دوست..... اور دوست..... کو دوست کے متعلق واقعی علم ہوتا چاہیے۔“ اسے راستے پر آتا دیکھ کے میں اپنے ذہن میں سوال مرتب کرنے لگا کہ وہ بول پڑی۔

”چلیے پھر بتائیے اپنے متعلق..... آخر دوستی کے پہلے دعوے دار بھی تو آپ ہیں۔“ اس نے بڑی ہوشیاری سے بال میرے کورٹ میں ڈال دی۔

”کیا بتاؤں.....؟“ گھر میں بس میں ہوں، امی جان ہیں۔ بھائی جان اور شرمین۔“

”شرمین!“

”بھائی جان کی بیوی..... میں نے مختصر بتایا۔

”یعنی آپ کی بھابی.....“ اس نے نٹولے والی نظروں سے دیکھا میں شانے اچکا کے رہ گیا۔

”اور فہد ہے۔“

”فہد!“ میں نے اس کی آواز میں واضح لرزش محسوس کی۔

”جتنی چاہے میرا..... بڑا سارا، گھلا سا.....“ میرے لہجے میں خود بخود ہی حلاوت سی آگئی، اسے دیکھا تو اس کی پر اشتیاق آنکھوں میں بھی وہی حلاوت تھی۔

”لگتا ہے تمہیں بچے بہت پسند ہیں۔“

”بہت..... بہت زیادہ اور فہد تو..... میرا مطلب ہے فہد بھی بہت پیارا ہوگا ناں..... دوسرے تو سب ہی بچے بہت پیارے ہوتے ہیں۔“

”ہوتے ہوں گے، مجھے تو صرف فہد اچھا لگتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”اس سے پہلے میں نے بھی بچوں میں دلچسپی نہیں لی تھی، بلکہ اب بھی نہیں لیتا البتہ فہد کی بات اور ہے وہ تو جان ہے میری۔“

”مجھے تو لگتا ہے آپ اور سب میں بھی بس واجبی سی دلچسپی ہی رکھتے ہیں۔“ اس کے قیاس پر میں نے چونک کے دیکھا۔

”ماں کے بارے میں تو بتانے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے اور آپ نے بس دو لفظوں میں منشا دیا، اور آپ کی بھابی..... یعنی شرمین، اس سے تو آپ اپنے خاصے کبیدہ خاطر لگ رہے ہیں۔ اگر میرے اندازے ذاتیات پر حملے کے مترادف ہوں تو معذرت

چاہوں گی۔ بس یونہی مجھے لگا تو میں نے کہہ دیا۔“

”نہیں نہیں معذرت کیسی، اور ذاتیات کیسی۔ دوستی میں اتنی چھوٹ تو دے دینی چاہیے۔“ میں نے دانستہ ہلکے پھلکے سے انداز میں کہا ورنہ اس کی غضب کی قافیہ شناسی پہ

میں دنگ رہ گیا تھا۔

”شرمین سے میں کیا، گھر کا ہر فرد تنگ ہے۔“

”ہر فرد..... یعنی آپ، آپ کے بھائی اور والدہ..... اور کیا فہد بھی؟“ اس کے سوال پہ میں الجھ گیا۔

”فہد کا کیا ذکر؟ وہ تو ابھی بچہ ہے، لیکن سچ پوچھو تو ماں کی حیثیت سے اس کا رویہ بیٹے کے ساتھ بھی انتہائی ناروا ہے۔ وہ ایک غیر ذمہ دار ماں، لا پرواہ بیوی، بد تمیز بہو

اور.....“

”بیوی اور بہو کے آگے جو مرضی لگائیں، لیکن چلیز ماں کا لفظ داغ دار نہ کریں، ماں صرف ماں ہوتی ہے۔“ میری بات کاٹ کے وہ بولی۔

”دیکھو بیٹا جس طرح سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے، اسی طرح رشتے بھی سب ایک سے نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں تم عورت ہونے کے ناطے اسے ایڈوائس دے رہی ہو لیکن میں نے یہ بات سوجھ بوجھ نہیں رکھی۔

یاد ساری بات ہوتی ہے جذبات کی، احساس کی اور اس سے بھی بڑھ کے فطرت کی، تم نے اخباروں میں بار بار پڑھا ہوگا، چار بچوں کی ماں آتشا کے ساتھ فرار..... نامعلوم

ماں ایک نو زائیدہ بچی کو ٹھنڈی سڑک پہ پھینک کر مرنے کے لیے چھوڑ گئی۔ بیوی نے شوہر کو زہر دے دیا۔ بے شک ایسی خبریں ہزاروں میں ایک کے متعلق ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتی

تو ہیں۔ اگر میں شرمین کے خلاف کچھ کہہ رہا ہوں تو اسے تم “ماں” کے خلاف بیان مت سمجھو۔ دنیا میں ویسی بھی ہوتی ہے، جیسی میری ہے اور ماں ویسی بھی ہوتی ہے جیسی

فہد کی ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں چونک سا گیا۔ وہ روانی میں مجھے “آپ” کے بجائے “تم” کہہ کے نگار رہی ہے۔ میں خوشی کے نامعلوم

سے احساس کے تحت ہلک گیا۔ لیکن اسے جتانے کے بجائے بات جاری رکھی۔

”ابو جان کی وفات کے بعد امی جان نے اپنے طور پہ ہمیں پیلا۔ بڑی خود داری، بڑی محنت کے ساتھ..... لیکن اپنے صاحب حیثیت بھائیوں سے کسی قسم کی کوئی

مدد نہ لینے کے باوجود جاننے کے لیے وہ ہمیشہ ان سے مرعوب رہیں۔ امی، ماموں کی بیٹی شرمین کو ایسے پیار کر لیاں چیں کسی کے بہت بڑے احسان کا بوجھ سہتا ہو۔ بس اس دن سے

ہمارے گھر کا ماحول خراب ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے اکڑا اکڑا، نالاں، شاک کی میرا تو دل نہیں چاہتا کھر جانے کو، پتہ نہیں امی کیسے سارا دن گزاری رہی ہیں۔

اور زینا! مجھے تو اس بچے کے نصیبوں کا خیال آتا ہے جو ماں باپ کے جھگڑوں کی بدولت وقت سے پہلے بڑا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پہ سو سال کی سنجیدگی اور مالا مال لہجہ ہو گیا ہے۔“

میں سانس لینے کو رکھا، اس کے اپنے چہرے پہ لال اور گناہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے خود بہ حیرت ہوئی میں کس طرح اس کے سامنے کھل گیا۔ کیسے وہ اتنے لمبوں میں اتنے قریب آ سکی کہ میں..... عاشق ملک، خود کو سینت سینت کر رکھنے کا عادی، اپنی ساری پرتیں اس کے سامنے کھولنے لگا۔ میں تو اس کی ذات کی گر بن چھوٹنے بیٹھا تھا اور وہ باتوں باتوں میں مجھے کھول گئی۔

”لو..... میں نے..... تو سب بتا دیا اس کے علاوہ اور بتانے کو ہے بھی کچھ نہیں، دوست، بس نوید ہے اور اب تم..... وہ کالج، اسکول کی تانہ پتاریں دوستیاں کالج کے ساتھ ہی ختم..... میں زیادہ دوست بنانے کا قائل بھی نہیں، اب تم بتاؤ اپنے حلقے۔“

”میں..... زینبا عمر..... پابا عمر فاروق مجبلی دی نائزڈو مجھے..... چھ سال پہلے ان کی وفات ہوئی۔ ماما کو گزرتے نو سال ہو چکے ہیں، میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ عمر پچیس سال، قد پانچ فٹ چار انچ۔ پسندیدہ رنگ سفید، پسندیدہ پھول موتیا اور پینٹیلی، کھانے میں میزبان پسند ہیں، آکس کریم اور چائے بھی اچھی لگتی ہے۔ دالوں سے پکی پکی دشنی ہے۔ فیورٹ ایکسٹریکٹ بریڈ پٹ، ایکسٹریکٹ کیمرون ڈیاز، ہنگر.....“

”اشاب!..... جٹ! اشاب!.....“ میں نے پیپر ویٹ اٹھا کے اسے دھکی دی۔ اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی، بلیکس جھک گئیں۔ جب وہ کھل کے مسکرائی تو دنگا ہیں خود بخود ہی جھک جاتیں۔ اور وہ یوں سر ہلاتی جیسے اپنی مسکراہٹ سے خود محفوظ ہو رہی ہو۔

”تم کسی فلمی کا ڈانٹ ڈاؤن، میں اپنے فیئرز کے سوالوں کے جواب نہیں دے رہی ہیں۔ تم سے یہ سب نہیں پوچھا تھا۔“

”کیا کروں، میری لائف میں بتانے لائن کچھ ہے ہی نہیں۔“

”یوں کہو، میں اس لائن نہیں۔“ میں نے دانستہ کھٹکی جتائی کہ شاید اس پہ میری ناراضگی بھرے جملے کا کچھ اثر ہو، لیکن وہ خاموش رہی تو میں نے ہار کے صرف اتنا کہا۔

”یعنی میں دوستی کا صرف پہلا ہی نہیں، واحد اور آخری دعوے دار بھی ہوں۔“

”جو مرضی سمجھ لو،“ وہ بے پروائی سے کہتی اپنی قابل اٹھا کے چل پڑی تو میں بیچ دو تاپ کما کر رہ گیا۔

”عجیب کھنی لڑکی ہے۔ پہلے اپنا نیت جتا کے مجھ سے سب آگوا لیا اور اب اپنی باری

میں کیسے پیر سیٹ کے چل گئی۔ ایسا کیا ہو سکتا ہے اس کی زندگی میں جو وہ بتانے سے کترا رہی ہے۔ کچھ تو ایسا ہوگا، جس پہ پڑے ڈالے جا رہے ہیں، ٹھیک ہے، باپ فوکی بندہ تھا لیکن کیا تاکسی ٹھیکین جرم کے سلسلے میں کورٹ مارشل ہو چکا ہو..... جاب کرتی ہے تو پھر ضرور مالی حالت محذوڑ ہوگی۔ لیکن وہ نئے ڈال کی کار، رکھ رکھاؤ، وہ اعلیٰ طور اطوار..... پھر ضرور کوئی اور مجبوری ہوگی..... ہو سکتا ہے کوئی نہ کوئی بھائی نشے کا عادی ہو۔ جرائم پیشہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے اس کی بیٹی مقروض ہو۔ اور..... اور..... ممکن ہے وہ کسی ناکام شادی کا نچوڑ رہی ہو اسے ایم بی اے کیے ڈھائی تین سال ہو رہے ہیں۔ اگر شوقیہ جاب کرنا ہو تو تب بھی کہہ سکتی۔“

اپنے تصور کے کھوڑے ہر طرف دوڑانے اور ہر امکان کو سامنے رکھنے کے بعد میں نے خود سے سوال کیا۔

”کیا میں اسے اپنانے کی ہمت کر پاؤں گا۔ اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا.....“

”ہرگز نہیں۔“ میرا فوری رد عمل تھا۔ ”اپنانا تو ایک طرف، میں ایسا سوچنے کی ہمت بھی نہ کر پاؤں گا۔“

میرا دل پھر سے تھپتھپا لگا رہا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ جیسے مجھے غچ دے کر نکل گئی تھی، میں بعد میں کافی دیر تک شیڈنا رہا۔ اپنی عادت کے خلاف میں خود کسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پہ مجبور ہوا اور پھر روایتی میں ہی بس، اچانکے پن میں ہی کبھی جھج جھج دوستی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس سے اپنی اپنی پرسل باتیں بھی کر گیا۔ لیکن جب میں نے اس سے پوچھا تو..... کیسے وہ صاف پہلے ہی کھٹکی۔ میں کی دن اس سے کچھ اٹھٹھا سا رہا۔ شاید اس نے میرے گریڈ کو محسوس بھی کیا تھا یا نہیں، میں اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کا انداز نارمل ہی رہا۔ میں سخت الجھن محسوس کرتا رہا۔ ایک طرف دل کی بے چینی تھی، دوسری طرف دماغ کے پے در پے کریدتے ہوئے سوالات اس کا محتاط طرز عمل اور ان سب سے سوا میری اپنی خود پسند فطرت..... میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں دوستی میں پہل کر بیٹھا تھا، اب مسلسل اس کے بارے میں دوپہی کا اظہار کر کے اسے یہ جتانے چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے اتنی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن شاید میرا رد و تھا اسے سارو یہ بھی یہ بات جتانے کا ایک انجانا سطر لپٹے تھے میں خود پہ بھی ظاہر نہ کر رہا تھا، کچھ ہی دن بعد اس نے پھر سے وہ ذکر

خود ہی چھیڑ دیا۔
”عاشر! اگر آپ اپنے اس دعوے پر اب تک قائم ہوں تو کیا میں آپ سے ایک

سوال کر سکتی ہوں؟“
میٹنگ پر حاضری ہونے کے بعد سب ہی کبین سے نکل گئے۔ لیکن زینیا وہیں

موجود تھی۔ اس کے پوچھنے پہ میں نے پچھلے آدھ گھنٹے کے دوران چوٹی بار سلگایا

ہوا سکرٹ ایک طرف رکھ کے کہا۔
”اول تو میں دعوے کرتا ہی نہیں اور اگر کروں تو دستبردار نہیں ہوتا۔“

”اس کا مطلب ہے میں سوال کر سکتی ہوں۔“
”نہیں اس کا مطلب ہے فی الحال تم صرف جواب دہی کر سکتی ہو۔“

”اوہ یعنی جانی کارروائی؟“ پھر وہی جھکی نظروں کے ساتھ گہری ہوئی مسکراہٹ۔
”میں دعوے نہیں کرتی عاشر! یقین ضرور دلاتی ہوں۔“ چانک اس نے نظریں

اٹھاتے ہوئے کہا۔
”اسوکنگ تو خیر آپ کرتے ہی ہیں، لیکن آج کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ اب پلیز

یہ مت کہنا کہ پریشانی کی وجہ سے.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کے پہلے ہی واضح کر دیا اور میں

جو بچ بچ یہ ہی کہنے جا رہا تھا، منہ بند کر کے اس کے سامنے لگا۔
”اور اگر واقعی ایسا ہے تو کیا تم مجھ سے اپنی پریشانی شیئر نہیں کر دے گے۔“ وہ پھر سے

”آپ۔“ سے ”تم۔“ پر آگئی۔ میں ایک بار پھر ٹریپ ہو گیا اور بتانے لگا۔
”ای کی طبیعت کل سے کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ رات کو ہاسپٹل ایڈمٹ کرانا پڑا۔

پی پی خاصا ہلکی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے فائج کا خطرہ ہے۔ اس لیے ایک دو دن کے لیے

آبزرویشن رکھا ہے۔ صبح بھی میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ میٹنگ کے دوران بھی دھیان

امی کی جانب ہی لگا رہا۔“
”کون سے ہاسپٹل میں ہیں؟“

”ڈاکٹر ز ہاسپٹل.....“ میں نے مختصر اُنٹایا اور مجھے بالکل گمان نہ تھا کہ وہ شام کو

واقعی انہیں دیکھنے آ جائے گی۔
میں آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا اور پچھلے چار گھنٹوں سے امی جان کے ساتھ تھا۔ باقر

بھائی جان بس صبح آدھ گھنٹے کے لیے کھڑے کھڑے آئے تھے۔ ان کی چپٹی بیوی کو تو کل

سے اپنی توفیق بھی نہ ہوئی تھی، میں شاید آفس بھی نہ جاتا کرتا جان کی ٹیلی انہیں دیکھنے

نہ جانی بتاتی امی اپنی بڑی بہو کے ساتھ وہیں رک گئیں اور میرے آنے تک انہوں نے

امی جان کا خاصا دھیان رکھا۔ جاتے جاتے وہ بھی شرمین کی لاپرواہی اور بے بسی پہ سو

باتیں سناتی گئیں۔ میرا جی ٹکڑ ٹکڑ ہو گیا۔
”دوبہ، چند گھنٹے یہاں بیٹھنا کیا پڑ گیا۔ جیسے ہمارے گھر پہ تنقید کرنے کا حق ہی

حاصل ہو گیا ہے انہیں۔“
”بھابھی نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔“ امی نے صفائی پیش کی۔

”اور وہ جو کہا جا رہا تھا کہ رفعت تم نے بہو کو سر پڑھا رکھا ہے۔ باقر کی لگا میں کھینچ

کر رکھو۔ کیونکہ طریقہ ہے وغیرہ وغیرہ انہیں کیا حق ہے ہمارے پرسنل معاملات

ڈسکس کرنے کا۔“
”ہمارا کوئی پرسنل معاملہ ان سے الگ ہے نا ان کا ہم سے عاشر بچے زندگی یوں

سب سے کٹ کے نہیں گزرتی تھی اور باقر کل کو میرے بعد کیا پونہی ایک دوسرے سے

سمت جاؤ گے۔ کیا تمہارا فائدہ ہے باقر کا تمہاری زندگی کوئی حق نہیں رہ جائے گا۔ وہ بھی

تمہارے مرحوم والد کے بھائی کا گھر ہے۔ دیکھو دولت پر اپنے ہی کام آتے ہیں۔ بھلے

گھر الگ الگ ہیں۔ میں اپنے گھر اور بچوں میں مصروف، بھابھی اپنے کنبے کے

بکھیروں میں ابھی ہوئی، ہفتوں ملاقاتیں نہیں ہو پاتی لیکن دکھ درد تکلیف میں بھی رشتے

نا تے کام آتے ہیں۔“
امی جان نے ہمیشہ کی طرح مجھے رشتوں اور ان کی اہمیت کے بارے میں

لیکچر دینا چاہا۔ میں نے بور ہو کے ان کے لیے سبب کا کافی شروع کر دیا۔
”پلیز امی اس وقت تو خاموشی سے لیٹ جائے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

“اچانک میری نظر دروازے پر پڑی۔ آدھ گھنٹے بے آواز دروازے میں وہ زینیا تھی، جو

بڑے دھیان سے امی کے ”فرمودات“ ذہن نشین کر رہی تھی۔
”اے زینیا! تم! آؤ.....“ میں پر جوش سا ہو کے کھڑا ہو گیا۔

واقعی اس کا کیا ان نامیرے لیے غیر متوقع تھا، لیکن مجھے اتنی زیادہ اور بے ساختہ

خوشی ہوگی، یہ خود میرے لیے زیادہ غیر متوقع تھا شاید میرے چہرے پہ۔ میرے لہجے میں

خوشی کے رنگ اتنے واضح تھے کہ چھلک چھلک کے ان دونوں پہ جا گرے۔ ناشائسی

نظروں سے اسے دیکھتی امی جان بھی میرے چہرے کو کھینچنے لگیں اور خود زینیا بھی اس

صورتحال سے عجیب سی ہنسی کے پزل ہو گئی۔ میں نے جلد ہی خود پہ کنٹرول کیا۔
”امی! یہ زینیا میری ہیں، میرے ساتھ آفس میں ہوئی ہیں۔ بہت ذہین بہت قابل

”اچھی دوست ہیں۔“ اس نے میرا جملہ مکمل کر کے مجھے یوں دیکھا۔ جیسے جباری ہو ”لو اب دھوی مکمل ہوا“

”آؤ بیٹی! یہاں بیٹھو“ اسی نے فوراً ”اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ اسی سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے انہیں مے سے جانتی ہو۔ امی نے اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے گفتگو کا رخ اپنے سیکے کی جانب موڑا۔

”کشمیری خاندان سے تعلق ہے میرا۔ میری امی تو اللہ بخشے اصلی کشمیری خاتون تھیں۔ بعد میں والد صاحب لاہور آ کر بس گئے۔“

”ارے آنٹی! عجیب اتفاق ہے کہ میرے ماما پاپا بھی کشمیری فیملی سے ہیں، لیکن لاہور رہتے آئے ہیں۔“

”اچھا تب ہی میں کہوں اپنی امی کی لگ رہی ہو۔ وہ لہجہ، وہی دل چال۔“ امی کو اپنی ہم ذات، ہم نسل خواہتیں سے مل کے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ میں یوں تو اس ذات بات وغیرہ پورا یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اس وقت اس کے بارے میں یہ حقیقت جان کے دل کو طمانیت ہی محسوس ہوئی۔

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“

”جی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ویسے وہ ہجرت تھے۔ اور ماما تو بہت پہلے وفات پا گئی تھیں۔“

”اوہ.....! بہت افسوس ہوا۔ دیکھو ذرا، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور ماں باپ دونوں کے سامنے سے محرومی، خیر اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ نمائے کیا کیا لے کر کیا کیا نوازا دیتا ہے۔ اور تمہارے بہن بھائی کتنے ہیں اور کسے ہیں؟“ میرا مطلب ہے شادی شدہ ہیں یا ابھی بڑھ رہے ہیں۔“ امی نے باقاعدہ انٹرویو شروع کر دیا۔

”جی میرے دونوں بھائی بڑے ہیں مجھ سے۔ میرڈ ہیں، ایک کینیڈا میں ہوتے ہیں۔“

”اچھا اچھا، اور کرتے کیا ہیں دونوں؟“ میں نے کوفت سے امی جان کو دیکھا جو طبیعت کی خرابی وغیرہ سب بھولے کر مے سے سوال پر سوال کر رہی تھیں۔ زینیا کے چہرے سے ذرا نہ لگ رہا تھا کہ سوالوں سے تنگ آ رہی ہے، اس کے لبوں پہ وہی پرنس زندہ سی مسکراہٹ تھی۔

”بڑے بھیا بیورو کریٹ ہیں انہیں گریڈ کے آفیسر اور دوسرے کینیڈا میں پاکستانی ایجنسی میں ہوتے ہیں۔“

اس کے بتانے پہ میں ایک بار پھر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں اپنے متعلق بتا رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی ہلکا سا اشارہ تک نہ دیا تھا کہ اس کے دونوں بھائی

اتنے اونچے عہدوں پہ فائز ہیں۔ ایک بیورو کریسی میں اعلیٰ گریڈ آفیسر تھا، دوسرا فارن منسٹری میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ بلیک اینڈ وائٹ کنٹراسٹ کے کاشن کے شلوار قمیض میں ملیں، بلیک شال اوڑھے، بیروں میں بلیک کینوز شوز، کانوں میں ہلکے سے گولڈ کے ٹائیس، ناک میں چمکتی سفید لوگ، سادہ مانگ کے ساتھ کھینچ کے بنائی ہوئی، بغیر کسی میک اپ کے گھر بیٹے سے علیے کے ساتھ وہ اس وقت میرا چھوڑا ہوا سیب پھیل رہی تھی۔ اس نے نفاس سے قاشیں کاٹ کے امی کے آگے رکھیں۔ صفائی سے ترشے مصنوعی روغن سے پاک ناخنوں اور لمبی انگلیوں والا ہاتھ..... وہ کہیں سے بھی اس کلاس کی نہیں لگ رہی تھی جس نے کہ اسے ہونا چاہیے تھا، ایسے اونچے عہدوں پہ فائز بھائیوں کی وجہ سے۔

”میں تنگ آ گئی ہوں پھل کھا کھا کے۔“ انہوں نے شکایتا کہا۔

”سوپ پینے پہ آپ تیار ہیں، دلہ کھانے سے آپ کو اُنکائی آتی ہے۔ پھل کھا کھا کے آپ تنگ آ چکی ہیں۔ آخر آپ کی خدمت میں کیا چنیں کیا جائے؟“ میں نے تنگ آ کے کہا بہاری کے دردار امی کھانے پینے پہ ایسے ہی خرمے کیا کرتی تھیں۔

”آپ آئی کوان کی پسند کی چیزیں لا دیجئے ناں۔“ زینیا کی سفارش پر میں نے اسے مطلع کر نامزدی جاتا۔

”ان کی پسند کی چیزیں، کڑھی، بیٹنگن کے پکڑے، قیہ بھرے کر لیے۔ ماش کی وال، مولیٰ کا رٹا..... ان کی پسند دیکھو اور ایک نظریہ ہی سی جی کی رپورٹس پہ ڈالو۔“

”واقعی آنٹی! تو ابھی بات نہیں۔ اپنا خیال سب سے پہلے خود رکھنا چاہیے۔ عاشر کل سے اتنے پریشان ہیں آپ کے بارے میں، اپنے پیاروں کو پریشان تو نہیں کرنا چاہیے۔ جب یہ چھوٹے تھے تو آپ نے بھی ہزاروں بار انہیں بد پرہیزی پہ ٹوکا ہوگا، جتنی سے مصرت چیزوں سے دور رکھا ہوگا۔ گا خراب ہے، آکس کریم نہیں کھائی، زکام ہے کولڈ ڈرکس نہیں پینا۔ امی گندی چیز سے، سوئس سے دانتوں میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ زیادہ جتنے کھانے سے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ.....“ اس کے یوں گنوانے پہ امی ہنس پڑیں۔

”تو اب میری باری ہے۔“

”بالکل، پر پھر تو کرنا ہوگا۔“

”پر پھر تو کھک ہے، لیکن یہ بزرگ سوپ اور دلے طلق سے نہیں اترتے، ڈاکٹر نے زیادہ مریض سالے اور کھی بند کیا ہے۔ تنگ کر کے کو کہا ہے، یہ تو نہیں کہا کہ دنیا کی ہر

نعت حرام ہوگئی ہے مجھ پر۔“

”پلیس آج رات کا کھانا میں بھیجتی ہوں آپ کے لیے اور کل تک تو شاید آپ دسپارچ ہو جائیں گی۔ کیوں عاشر؟“

”انشاء اللہ، بس ابھی ڈاکٹر آتی ہیں تو پتا چل جائے گا، لیکن تم پلیز کھانا بھیجنے کی تکلیف مت کرنا۔ اسی کا کھانا ہا چل پیس سے آتا ہے۔“

”تکلیف کیسی۔“ واکنگ ڈسٹنس پر میرا گھر ہے، بالکل قریب ہی میں تو یونہی ٹہلنے ٹہلنے آگئی، اچھا آئی اب اجازت دیجئے۔ میں چلتی ہوں۔“

”چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں نہیں، آئی اکیلی ہیں، میں چلی جاؤں گی۔“

اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ کھانے سمیت موجود تھی۔ اس نے ہاٹ پاٹ کھول کر انی کے سامنے رکھا۔

”یہ دیسی مرغی کی بخنی میں کھجوری پکائی ہے۔ سالے بالکل نہیں، اور تیل بالکل کم ہے۔ مرغی کے ہی بالکل ڈرا ذرا سے پیس کر کے کس کر دیئے ہیں۔ اور یہ کس سبزی بالکل مرغج کے بغیر ہے، انشیم کی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ یہ پھلکا بھی ہے۔“ اس نے ایک ایک چیز نکال کے پیش کی۔

”اور میرے لیے کچھ نہیں لائیں؟“ مجھے سخت جھوک محسوس ہو رہی تھی۔

”سوری، اگر میں کچھ اور لانی تو پھر آئی سے یہ کھانا مشکل ہو جاتا۔“

”کھجوری تو واقعی بہت لذیذ ہے۔“ اسی نے رغبت سے کھانا شروع کیا۔

اسنے میں باقر بھائی اچانک اندر داخل ہوئے، وہ حیرت سے اسی کے قریب ہی بیٹھ کر بے تکلفی سے بیٹھی زینیا کو دیکھ رہے تھے۔ تو میں ان کے عقب میں ہوتا چائے کھڑی شرتین کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے آئی سے کونسا کوارا کر لیا تھا۔ مارے بندھے اس نے

سایا کو سلام بھی کر ڈالا۔ میں نے زینیا کا تعارف ان دونوں سے کرایا وہ بے چینی سے ان دونوں کے پیچھے کسی کو ڈھونڈنے لگی پھر باپس ہی ہو کے پوچھ بیٹھی۔

”فہم نہیں آیا۔“

سب کے ساتھ ساتھ میں بھی متعجب ہو گیا۔ شرتین کی تو باقاعدہ تیوریاں چڑھ گئیں وہ بیچارے خود شرمندہ ہو گئی۔ سب کے تاثرات دیکھ کے پھر اپنی بھیچپ مٹانے کے لیے کہنے لگی۔

”دراصل عاشر اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں اس کا اور ابھی آئی نے بھی اس کی اتنی

بیاری بیاری باتیں بتائیں کہ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہنے لگا۔“

”جیوں کا ہاسٹل میں کیا کام، ہزاروں طرح کے جراثیم ہوتے ہیں، اسے کیا ساتھ لاکے بیمار کرنا تھا میں نے۔“

شرمتین تنک کے بولی ترقن کرنے اور چبا چبا کے بولنے کی اسے ایسی بڑی بیاری ہو گئی تھی کہ اب وہ نازل لہجے میں قیامت کہہ رہی نہیں سکتی تھی۔ ہم سب تو عادی تھے لیکن کسی انجان کے سامنے اس کا ایسا چھتا لہجہ برا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے بھی زینیا کی گھبراہٹ محسوس کر کے اسے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

”ای کو کوئی جھوٹ کی بیماری تو نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ اسی کی جانب بھیگی تو ایک ٹاپے کو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں۔ پھر جیسے نہال ہو کے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس کا پیار لینے کا یہ انداز شرتین کو اور سہلکا گیا۔ خود وہ ان کی بہو اور بھانجی ہونے کے باوجود بھی قریب تک بیٹھنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اس کے آنے کے بعد مجھے ہاسٹل کے اس کمرے میں ٹھنکی محسوس ہونے لگی میں زینیا کو گھر چھوڑنے کے بہانے وہاں سے نکل آیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، صرف باج منٹ کی واک ہے، جی دن میں اس کا گھر تھا۔ چھوٹا سا جتنے سا منٹل اسٹوری مکان۔ بمشکل دو بیڈرومز پر مشتمل ہوگا، میں ایک بار پھر ابھمن کا شکار ہو گیا تھا۔ اسنے آئے نوجے رتوں والے بھائی کو بہن اس باج منٹ کے، چند لاکھ کی مالیت والے مکان میں رہتی ہے۔ اتنا یقین تو مجھے تھا کہ کم از کم اس کے بھائی وہاں نہ

رہتے ہوں گے۔ مکان کے باہر تو کسی سرکاری افسر کے نام کی پلٹی تھی نہ ہی سفارت کار کی پورچ میں سرکاری نمبر پلیٹ والی مرسلہ بڑا عجیب و غریب کے بجائے زینیا کی اپنی مرزا کھڑی تھی۔ اسے کی ہول میں چالی گھماتے دیکھ کے میں نے پوچھا۔

”تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟“

”نہیں چھو چھو ہو گئی ہوں گی، اس لیے میں ڈپلی کیٹ چاہی لے آئی۔“ اس نے کیٹ کھولا اور اندر جانے سے پہلے مکر کے مجھے دیکھا۔

”او کے عاشر! گڈ نائٹ، آئی کا خیال رکھا۔“ وہ فوراً اندر چلی گئی اور دھڑ سے کیٹ بند ہو لاک کی آواز سے لاک لگا اور میری کنکشنات کھنکھن گئیں۔

”دیری روڈ، کم از کم مجھے ایک کپ کافی تو آفر کر سکتی تھی۔“ میں نے اس کی بے نیازی پر تمللاتے ہوئے سوچا۔ مجھے کافی کی وقتی طلب نہ تھی۔ جتنا کہ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش رکھتا تھا۔ میں سب جانتا چاہتا تھا، سب کچھ مجھے

اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہیے تھے۔ میں اپنے پرہیزگاروں کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔
 شاید میں اندر سے اب تک وہی آنچور، جذباتی سا عاشق تھا۔ جس نے ایک بار
 شر میں نہ تار دلانے پہ پڑے پہنچ میرے انداز میں کہا تھا۔
 ”میری پسند کی ہوا تک نہیں لگ سکتی تھیں۔“
 ”تم کیا۔ زمانہ دیکھو گا عاشق ملک کی شریک حیات۔ ہر لحاظ سے بے مثال ہوگی۔“
 ”میں صرف ”بہترین“ کے لیے بے جا ہوں۔“

اس بات کو محض گزر چکا تھا۔ لیکن میرے کہیں اندر یہ پہنچ اب تک کسمار ہا تھا اپنا
 آپ منوانے کے لیے اس دور کی باتوں کو بچپنا کہہ کر چھلادینے والا میں اب تک اسی
 جذبہ باتیت کے زیر اثر تھا۔ شر میں سے قطع تعلق اور ہر طرح کی لاپرواہی کر سنے کا دعویٰ
 کرنے والا میں دانستہ اور نادانستہ ہر بات میں اب بھی اس کا مقابلہ کرتا۔ اس نے کسی
 زمانے میں ریشم کے حوالے سے مجھ سے جو طے پڑے تھے کہیں نہیں میں لاشعوری طور پر اب
 تک ان کے زیر اثر تھا اور دوبارہ کبھی یہ طے نہ سننے کی پیش بندی کر رہا تھا۔

میں زینیا سے متاثر تھا، اسے پسند کرنے لگا تھا، اسے اپنا نا بھی چاہتا تھا، لیکن ہر
 طرح سے مطمئن ہونے کے بعد.... اس کے ہر طرح سے عمل اور ”بہترین“ ہونے
 کے یقین کے ساتھ ابھی تک بہت سی ایسی باتیں تھیں جو جاننا پاتی تھیں، میں اس کی ظاہری
 عادات و رکھ رکھاؤ، قابلیت و ذہانت کا قائل تھا۔ اس کے فنی بیک گراؤڈ سے واقف
 ہو چکا تھا لیکن اس کا اپنے بھائیوں سے کٹ کر رہنا مجھے شک و شبہات میں مبتلا کر گیا
 ۔ مجھے اور کئی طرح کے وہم ستانے لگے۔ اسی بے چینی کے زیر اثر میں اگلے ہی روز آفس
 میں پھر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم ہاشاء اللہ سے اتنے عجز سے قسم کے بھائیوں کی اکلوتی
 بہن ہو۔“

”اس بات کا تو میری جاب سے تعلق ہے اور نہ ہی ہماری دوستی سے.... پھر میں
 ذکر کیوں کرتی.... بلکہ عاشق صاف بات تو یہ ہے کہ ان کا مجھ سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس
 لیے اس تکلیف دہ ذکر کو روکنے دیں۔“

وہ اس موضوع سے فوراً ”گھبرا اٹھی۔ اس کی آنکھوں کی جوت مدہم پڑ گئی۔ اب
 وہ آنکھیں کسی جوگی کی آنکھیں تھیں۔ سب کچھ تباہ دینے والے جوگی کی۔ میں نے کہا
 تھا تا یہ آنکھیں، یہ آنکھیں عام آنکھیں نہیں تھیں۔ پل پل رنگ بدلنے والی۔ تیر
 بدلنے والی۔

”کیا وہ تمہارے نگے بھائی نہیں؟“ میں نے قیاس کیا۔ ہوسکتا ہے زینیا میر
 صاحب کی دوسری بیوی کی اولاد ہو۔“
 ”گئے....“ وہ استہزائیہ ہنسی۔ ”وہ دونوں گئے ہیں.... گئے....“
 ”تو پھر تمہارا اس طرح ان سے الگ، اکیلے رہنا، مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔“ میں نے
 کریدنا جاری رکھا۔

”مجھے بھی نہیں....“ اب وہ آنکھیں کسی میٹے میں کھوئی ہر اسان بچی کی آنکھیں
 تھیں۔ شاید میں اور بھی کچھ پوچھتا۔ شاید وہ اور بھی کچھ بتاتی۔ لیکن اتنے میں نوید کی آمد
 نے ہم دونوں کو یہ موضوع بدلنے پہ مجبور کر دیا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بے چینی اور
 اضطراب پر قابو نہیں پا رہی۔ مجھے کسی غیر معمولی بات کے ہونے کا اندیشہ خردوار کرنے لگا۔
 اسی اب پہلے سے کافی بہتر تھیں۔ ہاسٹل میں قابل ڈاکٹر زکی دوروز تک ٹریٹمنٹ
 نے انہیں بھلا چکا کر دیا تھا۔ کچھ وہ بھی اپنا دھیان رکھنے لگی تھیں۔ پر میری کھانا کھایا
 جاتا، شام کو لان میں واک بھی کرتیں، سب زینیا کے اس روز کے بچکر کا اثر تھا اس شام
 انہیں کسلندی سے بستر پہ پڑے دیکھ کے میں ٹھٹھکا۔

”کہاں کا بلڈ پریشر اور کسی بیماری۔ میری جان کو تو ایک ہی روگ لگا ہوا ہے
 ۔ شر میں اور باخری نا چانی اور کل کل.....“ وہ چل کے بولیں۔

”آپ نے پھر سے ان کی نیشن کو سر پر سوار کرنا شروع کر دیا۔“
 لگتا ہے زینیا کے بچکر کے اثرات کم ہونے لگے ہیں۔ اس سے کہوں گا ایک ڈوز اور
 دے جائے۔ اس کے ذکر پر ای کا بھی دھیان اسی طرف چلا گیا۔

”ہاں کسی بھانے وہ آئے تو سہی۔ ج بڑی اپنی اپنی سی گلی وہ چلی مجھے، لگتا ہی نہ تھا
 کہ پہلی بار ملی۔ نہ کوئی ملاوٹ، نہ بناوٹ، اس دنیا کی تو لگتی ہی نہیں۔“
 ”اچھا میں بتاؤں گا، آپ اسے صریح کی مخلوق کہہ رہی تھیں۔“

”چل بہن.... مگر اسے یہ ضرور کہنا میں اسے یاد کر رہی تھی۔ تاکہ نہ کرنا کسی روز
 بہت سارے وقت کے لیے مجھ سے ملنے گھر پہ آئے۔ کاش.... کاش میری کوئی اس جیسی
 بیٹی ہوتی۔“ بڑے عرصے کے بعد ای جان کو اپنی بھولی بھری خواہش یاد آئی۔ میں کہتے
 کہتے رہ گیا کہ ”آپ چاہیں تو آپ کی بیٹی بن بھی سکتی ہے۔“

”ایسی بابرکت، مسادت مند بچیاں ہی تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ ایسی بچیوں کا
 وجود نعمت ہوتا ہے۔“ وہ حسرت زدہ نگے میں کہتی رہیں اور میں سوچتا رہا۔ ”یہ رونق، یہ
 نعمت اب بھی ہمارا نصیب بن سکتا ہے۔“ میں غصہ ہی رہا کہ شاید وہ باتوں باتوں میں کوئی

ایسا اشارہ دے، اس کے حوالے سے مجھ سے کوئی رائے طلب کریں۔ اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں۔ لیکن وہ صرف اس کی تقریفوں میں رطب اللسان رہیں، پورہو کے میں اٹھ گیا۔ یہ سب تو میں پہلے سے جانتا تھا۔ بہر حال اگلے ہی روز میں نے ای کی خواہش ضرور زینیا کے سامنے دہرا دی۔ وہ کچھ نہ بولی صرف لگا ہیں جھکائے ہر کوہلی ہلی سی جنبش دیتے ہوئے مسکرائی رہی۔ مسکرائی رہی اور میں.... میرا ہاتھ.... وہ کس.... وہ اہانت.... وہ ٹھنڈک۔

”عاشرا تم نے زینیا کو کہا نہیں کہ گھر آئے۔“ ای نے پوچھا۔

”کہا تھا ہی!۔“ میں نے فہد کو دھمکی میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔ آج اتوار ہے۔ آج ہی آ جانی۔ تم نے ڈھنگ سے کہا بھی نہیں ہوگا۔“

”اب اور کس ڈھنگ سے کہتا۔“ میں زچ ہو کے بولا۔

”گڑ گڑاتے ہوئے، ہاتھ جوڑتے ہوئے، اللہ کے واسطے دیتے ہوئے۔“

شرمین نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنی کڑوی زبان کے جوہر اگلے، میرا حلق تک کڑوا کر ہر ہو گیا، گڑ گڑاتے، ہاتھ جوڑتے اور اللہ کے واسطے دینے کے شعور سے وہ مجھے دے رہی تھی۔ عاشرا ملک کوک میں طیش کے مارے فہد کو ایک طرف اُتار کے اس کی طرف بڑھا۔ وہ بہیم کے دو قدم پیچھے سرکی۔ ای نے دہل کے مجھے آواز دی۔

”عاشرا! خدا کے لیے بیٹا۔۔۔!“ وہ میرے تہروں سے ڈر گئی تھی۔

اور شاید شرمین بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میری خاموشی اور سرخ چہرے سے لیکن ذرا سنبھل کے اس نے پھر سے مجھے بھڑکانا چاہا۔

”اتنا عرصہ ہو گیا، باقر کے آفس سے کوئی دو گر گھر تک نہیں آیا۔ یہ تیار و اج نکلا ہے ملازموں کو گھر تک بلا کے ساتھ بٹھا کے لاؤ جتانے کا۔“

”وہ ملازم نہیں ہے۔ بہتر ہو گا اپنی یہ سربا بہ دار اور زمیندار قسم کی سوچ بدل لو۔ تعلیم تم حاصل کر بھی لیتیں تو تمہارا کچھ نہ بگڑتا۔ لیکن بدلنے وقت کے تھا سب تک تمہارے ذہن کو ہوا نہیں لگا رہے۔ وہ جتنی کوالٹی فائز اور جیسکس ہے تم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتیں۔“ میں نے دانستہ اس پر زینیا کا تعلیم یافتہ ہونا بتلایا تھا۔ اصل میں اس کا اسے معمولی درکار اور ملازمہ کہہ کے بلانا تھا تاؤ دلا گیا تھا۔

”ہونہر، جینٹلس ہوگی تو اسے گھر ہوگی۔“ وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی۔ ”میں تو صرف اتنا جانتا چاہ رہی تھی اس طرح ایک غیر لڑکی کے لیے اتنی بے جا تالی کھانے کا کیا

مطلب ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے، امی کے پاس اور کوئی ٹاپک ہی نہیں۔ زینیا، زینیا ہو رہا ہے۔“

”اس بات کا تم سے کیا تعلق؟۔ کیوں بے کار میں الجھنا شروع کر دیتی ہو۔ عادت ہو گئی ہے تمہیں تماشے لگنے کی۔“ باقر بھائی جان بھی کمرے سے نکل آئے۔ ”وہ زینیا کو یاد کریں یا کسی کو بھی تمہیں کیا تکلیف ہے۔“

”مجھے تکلیف اس بات کی ہے کہ یہ سب مجھے سنانے کے لئے کہا جاتا ہے، مجھ پہ یہ جتانے کے لیے کہ، ایک میرے سوا اور سب کی اہمیت ہے اور سب اچھے ہیں صرف میں ہی بری ہوں۔“

وہ چنچی، فہد سہم کے میری ناگوں سے لپٹ گیا۔ میں اس کے بال سہلا کے دھیرے سے اسے الگ کر کے امی کے حوالے کرنے کے بعد گھر سے نکل گیا۔ گھنٹوں بے مقصد گاڑی سڑکوں پہ دوڑانے کے بعد میں تھکے ہوئے دودھ اور شل ہوئے دماغ کے ساتھ گھر لوٹا تو پورچ میں زینیا کی مردا کھڑی دیکھی۔ بے تابی سرے میں اندر کی طرف بڑھا، وہ جانے کے لیے نکلنے ہی والی تھی۔

”بس تم گئے ہی تھے کہ زینیا آ گئی میں نے کہا بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔“

ای نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور یہ ذکر کیا تھا، اگر زینیا جان لیتی تو اُلے قدموں لوٹ جاتی۔ میں نے سب کا واقعہ یاد لے لیا۔ ای جان کی بشارت کو حیرت سے محسوس کیا۔ اسکی ہر جتنی کے بعد وہوں بڑھ حال رہیں، لیکن یہ شاید زینیا کی آمد کا اعجاز تھا۔ میں نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔

”اب میں آیا ہوں، تو تم چل پڑی ہو، کچھ ریٹھو تو سہی۔“

”نہیں.... پھر کبھی، کافی دیر ہو گئی ہے۔ چھو پھو کیلی ہوں گی۔“ اس نے حتیٰ لچے میں کہا۔ فہد نے اس کے بڑھ کے اس کی انگلی تھام لی۔

”رگ جاکیں نا آئی!۔ اتنا مزہ آ رہا ہے۔“

”مزہ“ میں نے ادھر ادھر شرمین کو ڈھونڈنا چاہا۔ بھلا اس کے ہوتے ہوئے کیا مزہ آ سکتا تھا۔ وہ تو صرف ”مزہ چکھنا نا۔“ جانتی ہے۔

”باقر اور شرمین کو عید بھائی کی طرف جانا تھا۔ آج ارمین کے دن رکھنے ہیں۔“ چھوٹے ماموں کی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو نا تھی، جو نہ صرف شرمین کی چچا زاد بلکہ حالہ زاد بھی تھی اس لیے خراب موڈ کے باوجود وہ تقریب سے نہ کر سکی۔ فہد کو فلو تھا۔ شاید

اسی لیے وہ گھر پہ تھا۔ اور اب زینیا سے یوں چپکا کھڑا تھا جیسے برسوں پرانی دوستی ہو۔
”لگتا ہے خوب گھڑ جوڑ ہو گیا ہے۔“

”نہد ہے ہی، بہت اچھا، بڑا پیارا۔۔۔۔۔۔“ اس نے جبکے فہد کا گال چوما۔
”میں پھر اس کی، نہد سے ملنے۔“

اس نے سچے کو وعدہ سے بھلایا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میں گھر سے نکلا ہی کیوں۔ اگر مجھے ذرا بھی یاد ہوتا کہ شرمین کو تقریب میں جانا تھا تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوا چھٹی کا دن گھر پہ انجوائے کرتا۔ لیکن اس وقت اس سے فرار کے علاوہ اور کچھ سوچا بھی نہیں۔

”نہد تو یوں کھل ل گیا جیسے وہ اس کی سگی ہو۔ سچ ہے، بچہ محبت کا ہوتا ہے۔ جہاں پیارا نظر آئے وہیں کھینچتا ہے۔ ان معصوموں سے زیادہ محبت کی پہچان اور کسے ہوگی اور زینیا تو ہے ہی سر سے ہر چیز محبت سے گندھی ہوئی۔“ امی نے پھر سے اس کے تعقیدے پڑھنا شروع کر دیے۔

”لیجئے ابھی ایک ملاقات کا نشانہ آ رہی نہیں تھا کہ اب وہ پھر سے آپ کو اشارت کر گئی۔“ میں نے بظاہر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا، لیکن اندر سے میرا دل خوشی سے بھر رہا تھا۔

”خوشی۔۔۔۔۔۔ کیسی خوشی۔۔۔۔۔۔ کی اپنے کی، دل سے بہت قریب۔ حتیٰ کی، تعریف خوشی دیتی ہے۔ شاید اس لیے۔۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ اس لیے کہ اسی کا زینیا کی تعریف کرنا مجھے اپنی تعریف لگتا تھا، مجھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ مجھے سراہ رہی ہوں کہ میں نے زینیا کو ڈھونڈ نکالا۔ واقعی۔۔۔۔۔۔ قابل تعریف تو میں ہوں، جو ان کے لیے ہر لحاظ سے مکمل بہو تلاشنا چاہتا ہوں۔ ایک پرفیکٹ لیڈی، ایک ٹیلر بیوی اور پسندیدہ بہو۔ اگر میں زینیا کو ایسا ہی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو سارا کریڈٹ مجھے ہی ملنا چاہیے۔“

”بابا! کل جو آئی آئی تھیں، انہوں نے مجھے دس اس طرح لگائی کہ میری ناک ایک دم سے ٹھنک گئی۔“

مئی دنوں سے سینے میں جکڑن اور بند ناک کی تکلیف میں مبتلا نہد کی طبیعت عجیب دکھ کے باقر بھائی نے ناشے کی ٹیبل سے اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ شرمین سلاکس پہ جام لگاتے لگاتے رک کے اسے دیکھنے لگی، پھر اس کی سوالیہ نظریں مجھ سے ہوئی ای یہ جارکیں۔ اسی کل کی بدتر سگی سے خائف تھیں، بوکھلا کے انہوں نے موضوع بدلتا چاہا، لیکن میں نے شرمین کو چڑانے کے لیے نہد سے پوچھا۔

”ارے کہیں مجھے پھر کے کھلا تو نہیں ڈھلی۔“

”چاہو۔۔۔۔۔۔! آپ بھی بس۔۔۔۔۔۔“ وہ کھلکھلانے لگا ”بھلا دس بھی کوئی کھاتا ہے۔ آئی نے گرم پانی میں دس گھولی۔ میرا منہ اس پہ کر کے زور زور سے سانس لینے کو کہا اور میں ٹھیک ہو گیا۔“

”اور اگر یہ گر جاتا گرم پانی میں، کون سی نیم حکیم آئی آئی تھی، میرے پیچے پہ تجربے کرنے کے لیے۔“

”کوئی نہیں شرمین۔۔۔۔۔۔! وہ تو زینیا آئی تھی۔ میری خیریت دریافت کرنے فہد کو سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی اس لیے اس نے دس کی بھاپ دی۔“ امی نے وضاحت کی۔

”وہ تو آخر منت سماجت کر کے عاشر اسے لی ہی آیا۔ ویسے سوچنے کی بات ہے، عاشر نے کبھی کھائے کا سودا کیا تو نہیں۔ پھر اس لڑکی سے ایسا کیا مفاد وابستہ ہے جو یوں سر آنکھوں پہ بٹھایا جا رہا ہے۔“

”کم از کم صبح تو اپنی کھانا بندر کھا کر۔“ باقر بھائی جان نے زور سے کپ میز پر بٹھا۔ ”تم کیوں دوسروں کے معاملات میں دخل دیتی ہو۔ جب کہ خود تمہیں اپنے کسی معاملے میں دوسرے کی دخل اندازی پسند نہیں۔ یہ صرف تمہارا گھر نہیں۔ یہاں کون کس سے ملنے آتا ہے۔ کون کس کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ سب تم سے اجازت لینے کے بعد نہیں ملے ہوگا۔“ اب بھائی جان خود ہی کافی تھے۔ کچھ اس لیے بھی میں خاموش رہتا تھا۔

”اگر تم یوں میری بے عزتی نہ کرو تو شاید میری بھی کوئی حیثیت بن جائے، اس گھر میں لیکن میں بیوی ہوں تمہاری اور تم۔۔۔۔۔۔ تم مجھے بھی ذلیل کرنے پہ تلے ہوئے ہو۔“ ”تمہاری حرکتیں ہی ذلیل کروانے والی ہوتی ہیں۔ تم خود دوسروں کو ذلیل کر دیتی تو بدلے میں ذلت ہی حاصل کر دیتی۔“ وہ ناشے سے اٹھ گئے۔

شرمین نے نی پان تھ کے دھکے سے ٹیبل پہ الٹا گرم گرم چائے اچھل کے فہد تک مچی وہ جج کے پیچھے ہوا اور کرسی الٹ جانے سے نیچے جا گر۔ میں اور امی فوراً ”اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کی طرف لپکے۔ کمرے کی طرف جاتے بھائی جان بھی پلٹ آئے۔ شرمین قہقہے ہوتے چہرے کے ساتھ ابھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائی بھاگ گئی۔ نہد حلق چھڑکے رو رہا تھا۔ میں نے اس کا ریٹھی بالوں سے ڈھکا سر ٹٹولا، کسی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں تھا۔ کارٹ وہیے بھی خاصا دیر تھا وہ امی سے لپٹ کر دھڑاڑیں مار رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں جان گیا وہ کیوں رو رہا تھا، اسے گرنے سے چوٹ نہیں آئی۔ اس کے اندر کچھ گرا تھا۔

اس روز سارا وقت میرا موڈ خراب رہا۔ وہ رہ کہ فہد کی سسکیاں یاد آئیں۔ میں مٹھیاں پیچنے کے رہ جاتا۔ دل کر رہا تھا ابھی گھر جاؤں اور فہد کے ایک ایک آنسو کا بدلہ اس سے لوں، اس سے.... فہد کی ماں سے.... اور یہ خیال مجھے ست کر دیتا۔ جو بھی تھا بہر حال اس کی ماں تھی اور میں محض چاہوں، وہ میری نسبت اس پر زیادہ حق رکھتی ہے۔ ”تم باپ کچھ زیادہ ہی اُٹھے اُٹھے سے رہنے کے ہو؟“ میرے مسلسل عدم دلچسپی کے اظہار پر یہ زینا نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اور کوئی کاسٹیکس میرے بارے میں اندازے لگانے کے علاوہ۔“ میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ہمیشہ میرے اندر سے بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی اور جب بھی میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا دیتی۔ ”درست اندازے۔“ اس نے بوئے سکون سے ہنسی کی۔ ”تمہاری الجھن کا سبب ضد ہے۔ اس نے پوچھا نہیں، بتایا اس کے بیچ کے درست اندازے پر میں حیران ضرور ہوا لیکن تسلیم کر کے اسے مغرور ہونے کا موقع دینے کے بجائے میں نے جھٹلانا چاہا۔ ”فہد، فہد کیوں۔ وہ نکھاسا سچے کیسے میری پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ تم زیادہ سائیکا ٹرسٹ بننے کی کوشش مت کرو۔“

”یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ تم سائیکلک ہو۔“

”واٹ ڈو یو مین۔“ میں بھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

”میں تم سے صرف بات کر رہی ہوں اور تم مجھے ٹوک رہے ہو کہ میں ایسا نہ کروں، کیونکہ میں سائیکا ٹرسٹ نہیں ہوں اس کا مطلب یہی ہوا ناں کہ تمہیں سائیکا ٹرسٹ کی ضرورت ہے۔“

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں جو اندازے لگاتی رہتی ہو۔ وہ درست نہیں۔“ عاشر ملک کو بھٹاتا آسان نہیں۔

”او کم آں، تم کوئی بھڑکتا نہیں، ایک سیدھے سادے کھلی کتاب کے جیسے نارل سے فرد ہو۔“

”سیدھا سادا، ہلکا ہلکا کتاب بابا بابا.....“ میں دل ہی دل میں خوب ہنسنے لگا تھا تو اس کھلی کتاب میں کیا لکھا ہے۔

”سہلا نام تو تمہارا اپنا ہے، یعنی سب سے زیادہ محبت تم خود سے کرتے ہو۔“ میں نے پوری کوشش کی کہ میرے تاثرات چہرے پر یہ ظاہر نہ ہوں۔

”دوسرا نام ”امی“ ہیں، اور تیسرا نام فہد کا ہے۔“ اتنا کہہ کے وہ رکی مسکرائی۔ میرے تنے تھے اعصاب کو اس جسم کا کلس پر سکون کرنے لگا۔ کیا بھی کسی نے کسی مسکراہٹ کا کلس محسوس کیا ہے۔ میں نے کیا ہے۔ ہزار بار کیا ہے۔ ہزار بار جب وہ مسکراتی ہے۔

”تم ان دونوں کی وجہ سے پریشان ہو سکتے ہو۔ لیکن چونکہ امی کی اکثر پریشانیوں کا حل تمہارے پاس ہے یا یوں کہہ لو کہ تم ان کو کم کرنے کا اختیار رکھتے ہو اس لیے میں فہد کا نام لے رہی ہوں کیونکہ تمہاری پریشانی میں ایک طرح کی بے بسی چل رہی ہے جیسے تم چاہتے ہوئے کچھ نہیں کر پا رہے۔“

”لیکن میں کروں گا ضرور۔۔۔۔۔“ میں نے تسلیم بے شک نہ کیا، لیکن انکار بھی نہ کر سکا۔ اس کی قیافہ شناسی کا میں ایک بار پھر قائل ہو چکا تھا۔

واقعی فہد کے وجود سے شرمین کا منسلک ہونا مجھے تکلیف دیتا تھا، وہ مجھے پیارا لگتا تھا۔ دل خود بخود اس کی جانب کھینچتا تھا لیکن اس کی ماں، وہ عورت مجھے اس کی ماں کی حیثیت سے ہرگز قبول نہیں تھی۔ فہد میرے لیے ایک ایسا پھول تھا جو شرمین جیسے کانٹے کی جڑ، وجہ سے میری دسترس سے دور تھا۔ میں اکثر سوچتا..... کیا تھا جو شرمین نہ ہوتی مگر فہد ہوتا..... اور پھر خود بھی اسے خیال یہ منس پڑتا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے زینا۔ میں آج تک باقر بھائی جان اور زینا کے تعلق کو سمجھ نہیں پایا۔ دونوں ایک دوسرے سے ہزار ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں چنانچہ وہ دونوں الگ کیوں نہیں ہو جاتے۔“

”تم اس انتخاب کیوں سوچتے ہو، کیا اس بات کا فہد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

”نہیں وہ بہت سے برے اثرات سے دور ہو جائے گا۔ میری بے بسی اور غصے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سے وہ پیدا ہوا، امی یا پھر کسی حد تک میں اس کا دھیان رکھ رہا ہوں وہ دونوں اس کے ماں باپ ہیں مگر صرف کسی حد تک میں پوچھتا ہوں کیا حق ہے انہیں اس بچے کو اپنے پر اپریلی بھٹنے کا۔“

”پر اپریلی تو تم اسے بنارہے ہو عاشر! تمہیں اس سے پیار ہے، تم اس کا خیال رکھتے ہو۔ یہ ایک فطری ہی بات ہے، تمہارا اس سے خون کا رشتہ ہے۔ تم اس کے چچا ہو۔ لیکن تم اس رشتے سے بھی تو اس کے لیے کچھ کر سکتے ہو تم اس کا سب کچھ کیوں بٹنا چاہتے ہو۔ کیوں یہ چاہتے ہو کہ وہ اپنے ماں باپ کا نہ رہے صرف تمہارا بن کر رہے۔“

وہ کوئی چیز نہیں، انسان ہے۔ انسان کسی کی بھی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ تمہارا اپنا بچہ..... عاشر..... تمہارا اپنا بچہ بھی صرف تمہارا نہیں ہو سکتا۔ اس میں بھی کوئی دوسری ہستی تمہاری حصے دار ہوگی۔ تو فہد تو پھر تمہارے بھائی کا بچہ ہے۔ شرین تمہارے لیے کتنی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسے فہد کی ماں خدا نے بنایا ہے۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہو۔“ مجھے اعتراض ہے.....“ میں نے زور دے کے کہا۔ ”میں اس کے لیے سب اچھا چاہتا ہوں۔ بہترین۔“

”تمہارا مسئلہ پتہ ہے کیا ہے عاشر.... اتم ہر چیز صرف بہترین ہی نہیں چاہتے، مکمل اپنی بھی چاہتے ہو۔ بلکہ اپنی دسترس میں۔ اپنی مٹھی میں۔ ماں صرف تمہاری، بھائی صرف تمہارا.... یہ کیسے ہو سکتا ہے ماں صرف تمہاری تب ہوتی جب تم اکلوتے ہو۔ جب خدا نے ایسا نامعلوم کیا تو تم بھی اس قسم کو کھلے دل سے مان لو۔ رہی شرین..... کو تمہارے تسلط پسند روئیے کو کچھ کچھ جانے ہوئے تم یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے بجائے کوئی اور عورت بھی تمہارے بھائی کی بیوی ہوتی تم اسے ناپسند ہی کرتے۔“

”کیواس، ہنری کیواس۔“ اس کی ہر بات گنجی تھی۔ میرے دل کا چور دیک کے سنتا رہا لیکن آخر میں اس کے انداز سے غلط جگہ پڑ گئے۔ مجھے احتجاج کرنے کا موقع مل گیا۔ ”تم دور بھی نہیں اس انداز سے لگاتی رہنا۔ تم یقین کرو۔ وہ اس بچے کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر شرین کی قابل ہوئی، بھائی جان اپنی ازادگی کی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوتے تو وہ فہد کو بھی توجہ دیتے۔ پیار دیتے، لیکن اس شادی نے انہیں سوائے ٹیشن کے کچھ نہیں دیا، نتیجہً وہ فہد سے بھی پیڑا ہو گئے۔ ماں اور شرین، اسے نہ شوہر سے دلچسپی ہے، نہ اولاد سے، نہ گھر سے۔ مجھ تو لگتا ہے اسے خود سے بھی دلچسپی نہیں۔ اگر اس کم از کم خود سے ہی محبت ہوتی تو وہ اپنی زندگی خطرناک بنانے رکھنے کے لیے اور کچھ نہیں تو سمجھو ہی کر لیتی یا پھر..... طلاق لے لیتی۔ بھائی جان کا مسئلہ یہ ہے وہ بنیادی طور پر شریف انسان ہیں۔ یہ رشتہ ای کا بنایا ہوا ہے۔ وہ سارے نتائج بھٹکنے کے لیے ای کو آ کے کر کے خود ایک طرف ہو گئے ہیں۔ تاکہ کسی دن وہ خود ہی تنگ آ کے اس رشتے کو ختم کرنے کا حکم دے دیں اور وہ تابعداری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ حکم بجا لائیں کہ جیسی آپ کی مرضی.... آپ نے ہی پہلے باندھی، آپ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ ای کا بھی ایک مسئلہ ہے وہ وہی صدیوں پرانے مشرقی میکہ نواز رومانسزم کا شکار ہیں۔ شرین ان کے چہیتے بھائی کی جیتی جی رہی ہے۔ لیکن شرین کا مسئلہ میری مجھ سے باہر ہے۔ وہ چاہے تو آسانی سے آزادی

حاصل کر سکتی ہے۔ بارہا وہ کہہ چکی ہے کہ یہ شادی اس کے لیے قید ہے، سزائے عمر کی۔ کیوں نہیں اپنے گروڈ پیس باپ کے ذریعے اس قید سے بھٹکارا پاتی، آئے دن شوہر کو اپنے باپ کے ہاتھوں ڈھیل کر داکتی ہے، تو طلاق بھی لے سکتی ہے۔ لیکن میں نے کہا ناں کہ اسے خود تک سے دلچسپی نہیں وہ اپنے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی۔“

”وہ اس کی وجہ یہ تو ہو سکتی ہے کہ شرین تمہارے بھائی سے سچ محبت کرتی ہو اس لیے ہزار اختلافات اور ٹکڑیوں کے باوجود سناٹا بھرنے پر مجبور ہو۔“

”محبت..... اور شرین اور وہ بھی باہر بھائی جان سے۔“ میں دل کھول کے ہنسا۔

”سنئے سالوں میں، میں نے آج تک اس کے چہرے پر محبت کی ہلکی سی رتھ تک نہیں دیکھی ان کے لیے شروع دنوں میں بھائی جان ضرور اس کے دیوانے تھے، آگے پیچھے پھرا کرتے۔ اس کی بے نیازیاں، کج ادائیگیوں کو ادائیں جان کے شمار ہو کر تے۔ ہر گستاخی بدتمیزی پر دے ڈالا کرتے۔ لیکن وہ اول زور سے ایسی ہے۔ شاید اسی لیے رفتہ رفتہ بھائی جان کی محبت یا کشش، جو بھی کہہ لو مایوس ہوتے ہوتے بالا آخر نفوت ہو گئی۔ میں تو اکثر سڑی سے کہتا ہوں لوگ اپنی ویلنگ اپنی دوسری مناتے ہیں، انہیں بری مانتا چاہیے۔“ تنفس کرتے کہتے کہتے میں نے اسے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

آکھیں اب کسی دشت زدہ برنی کی آکھیں تھیں۔

”ہیلو.....“ میں نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا ”تم سن رہی ہو۔“

”آؤں..... ہاں..... تم کہہ رہے تھے۔ بری.....“ وہ بوڑھائی۔

”مجھے یاد ہی نہ رہا۔“

”کیا۔“

”تم سے ایک بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا وقت پہ یاد آ گئی۔ پرسوں منڈے کو میں آفس نہیں آ پاؤں گی۔ ایک ضروری کام ہے۔“

”سیدم منڈے کو اسٹراٹیک ہے۔ ویسے بھی آفس بند ہوگا۔“ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

اکٹھی وہ پھٹیاں، مجھے بورر کر رہی تھیں۔ منڈے کو تو میں فہد اور ای کو لے کر آؤنگ ہو نکل گیا، لیکن منڈے کو شرین اپنے میکے چلے گئی بعد فہد کے، اور ایسے ہی موقع ہوتے جب مجھے بے بسی کا احساس ہوتا۔ کیوں کیوں مجھ سے زیادہ حق کوئی اس پہ جمانے، جس سے میں محبت کرتا ہوں۔

مجھ کے بعد میں صوفے پہ پڑا جینل پہ جینل چنچ کر ہاتھ، جب میری نظر لاؤنج کی

کھڑکی سے باہر گئی۔ ایک ٹیکسی اندر آ کے رکی تھی۔ میں اُنھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی میں کون آ سکتا ہے۔ اور زینا کو ٹیکسی سے نکلے دیکھ کے تو میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ اندر آئی تو واضح طور پر ڈسٹر بگ رہی تھی۔ ٹیکسی ٹھہری تھی۔

”زینا تم.... ٹیکسی میں....“ میں اس کے آنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”ہاں وہ.... میری گاڑی کل سے درکشپ میں ہے۔“ اُمی بھی اس کی خبر ملتے ہی کمرے سے نکل آئیں۔ وہ ان سے ملنے کیلئے ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔

”خیریت تو ہے زینا، کوئی ایرضی بھی کیا۔ کیسے آنا ہوا۔“

”پاکل ہوئے ہو عاشر! کیا ہمارے گھر آنے کے لیے کسی ایرضی کا ہونا ضروری ہے۔“ اُمی نے ٹوکا۔

”نہیں! ای! دراصل زینا کی گاڑی خراب ہے۔ میرا مطلب تو یہ تھا اگر کوئی ضروری کام تھا تو مجھے فون کرنی، میں لینے آ جاتا۔“

”کام تو کوئی نہیں تھا۔ بس پوہنی آپ سب سے ملنے کو دل چاہا اس لیے چلی آئی۔“ شاید میرے ردعمل سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی میں نے اس کے آپ سب۔“ کوئی خوش کن مضمون نکالنا چاہا، مگر اس کے متصل چہرے نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

”فہد کہاں ہے۔ بہت خاموشی ہے گھر میں۔ اس نے پوچھا۔

”فہد تو اپنے نانا، نانی سے ملنے گیا ہے۔ اسی لیے ہاں بیٹا یوں منہ سے بیٹھے ہیں۔ اچھا ہوا، تم چلی آئیں۔ میرا دل بہل جائے گا۔“

”اور میرا....“ اس کے لبوں نے نامحسوس حرکت کی۔ ”میں تو فہد سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو خود جنہیں یاد کرتا رہتا ہے۔ گھر ہوتا تو بہت خوش ہوتا، ارے تم اب تک کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھی....“ اُمی نے اس کا ہاتھ تھما چاہا۔

”نہیں آئی، میں چلتی ہوں۔ بس میں تو فہد۔ فہد سے اچھا خدا حافظ....“ وہ ٹوٹے الفاظ ادا کر کے چلی۔ اُمی بھی ہکا بکا کھیں اور میں بھی۔ وہ تو حیرت کی شدت سے اسے روک تک نہ سکیں۔ میں ہی پکار بیٹھا۔

”کو، زینا! میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ میں نے چاہیا ان اٹھائیں۔

”زینا بیٹا! کچھ دیر رک جائیں۔“

”میں پھر آؤں گی آئی، ابھی نہیں۔ ابھی میں۔“ وہ لب کاٹنے لگی۔

سارے راستے وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے ڈرائیونگ کے دوران کئی بار کن اٹھیں۔ اسے اے دیکھا۔ ہلکے ہلکے رنگ کا سوٹ لٹکوں نے پہن تھا۔ دوپٹے کا ایک پلو پیچے تنک جا رہا تھا۔ سوکے لب چمکی چمکیں.... ایسی تو میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”لو، تمہارا گھر آ گیا۔“ میں نے بریک لگائی اس نے میرا کئی انداز میں لاک کھول کے قدم باہر نکالا، میں اُتر کے تیل دینے لگا۔ ایک سالوئی سی لڑکی نے دروازہ کھولا جو شاید ملازمہ تھی۔

”نہی کھتے چلے گئے سی باجی، خالہ، ہوراں بڑے پریشان سی۔“ آپ کدھر چلی گئی تھیں باجی خالہ جی بہت پریشان تھیں! اس نے ہاتھ سے ملازمہ کو پیچھے ہٹایا اور اندر بڑھی۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کے منہ کھولے کھڑی رہی۔

”زینا کہاں تھیں تم؟“ ایک عمر رسیدہ پریشان صورت خاتون آگے بڑھیں اور مجھے دیکھ کے ڈگ گئیں۔ مجھے اپنے اب تک دروازے پہ ڈھٹائی سے جے رہے سخت خفت محسوس ہوئی۔ میں سلام کر کے کھٹکے کو تھا کر انہوں نے پوچھا۔

”آپ عاشر بیٹا ہو؟“ پتا نہیں وہ مجھے کبھی جانتی تھیں۔ خیر میرے اثبات میں سر ہلانے پہ انہوں نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ بظاہر ان کے پرزور اصرار پہ میں اندر داخل ہو گیا۔

”بیٹا! تم بیٹھو، معاف کرنا۔ میں نماز پڑھ رہی تھی۔ دو نفل رہتے ہیں۔“ انہوں نے چہرے کے گرد بیٹنی چادر اور درست کی۔ ان کے اشارے پہ میں پہلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سفید اور پیلے رنگ کی آرائش سے آراستہ اس کمرے کی فضا نے حدافردہ تھی۔

گلدان میں پیلے رنگ کے گلاب سوکھ رہے تھے اور بیڈ کے کراؤن پہ بڑا سائن فلاڈ نقش تھا۔ سفید پردوں پہ بھی پیلے گلابوں کے نقش تھے۔ اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور سکیلے چہرے کو تھپتھپائی زینا باہر نکلی اب وہ قدرے بہتر لگ رہی تھی۔

”ہاں اب بتاؤ، کیوں فرار ہو بیٹھی وہاں سے....؟“ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے کھنگالتی آئی تھی۔ اب میری باری تھی۔

”میں تمہارے گھر سے فرار ہو کے نہیں آئی، بلکہ فرار ہو کے وہاں گئی تھی۔ مگر پناہ نہ ملی۔“

”کیا مطلب؟“

”بھی میں فہد سے ملتی تھی۔ وہ نہیں تھا اس لیے واپس آ گئی۔“ اس کے کچکپاتے لہجے سے صاف لگ رہا تھا وہ زبردستی کی یہ بشت پیدا کرنے کے لیے کتنا زور لگا رہی ہے۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میں تھا، ای بھی تھیں۔ انہوں نے تمہیں اتنے پیار سے رکنے کے لیے کہا اور تم باہر نکلتی چلی گئیں۔“

”میں ان سے سوری کہہ دوں گی۔“ وہ مسکرائی۔ میرے ہاتھ سے کسی کا کچکپاتا تم ہاتھ میں ہوا۔

”لیکن پھر بھی کوئی توجہ ہوگی جو تم بغیر گاڑی کے اتنی پریشان سی حالت میں اور.....“

”تمہیں میرا گھر کیسا لگا..... ارے پھوپھو نے تم سے چائے، کافی کا پوچھا۔“ لہجہ تو کیا ہے ناں تم نے؟“ اس نے میری بات ٹالنے کے لیے اس کے تئیں ملے چار سوالات الٹ دیئے۔

”میں تمہاری پھوپھو کا نہیں تمہارا مہمان ہوں، لہجہ میں کر کے آیا ہوں۔ کافی کا موڈ نہیں۔ چائے اگر ابھی بنائی ہو تو ضرور پیوں گا۔ اور تمہارا گھر مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ ہر شے سے اداسی اور بے بسیت لپک رہی ہے۔ سفید رنگ پاکیزگی، اسن اور سکون کی علامت ہے لیکن تم نے اس میں جا بجا زرد رنگ کی آمیزش کر کے اسے وحشت زدہ سا بنا رکھا ہے۔ میرا بالکل خیال نہیں تھا کہ تم اندر سے اتنی بدذوق قسم کی خاتون ثابت ہوگی۔ آفس میں تو.....“

”میں چائے بالکل اچھی نہیں بناتی۔ پھوپھو سے کہتی ہوں۔“ میری بات کا مٹی وہ کر کے سے نکل گئی۔ میں سچ و تاب کھا کر دے گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا، آج اس کی شخصیت سے سارے پردے نوج کے رہوں گا، آریا پارا..... کچھ تو فیصلہ ہو۔

اندرونی اندر میرا دل ایک بار سکڑ سا گیا
”اور اگر تمہارا ایک بھی امکان حقیقت نکل آ یا تو.....“

”تو کیا؟“ ”بہتر“ سے۔ بہترین کی تلاش۔“

”اور یہ عام سی لڑکی.... جو کبھی کبھی خاص لگتی ہے۔“

”اے اپنا آپ خاص ثابت کرنا پڑے گا۔“
”تم نے بتایا نہیں، اتنا ڈر نہیں قسم کا ماحول کیوں طاری کر رکھا ہے تم نے اپنے گھر پر۔“ اس کے دوبارہ کرے میں آنے پر میں نے پوچھا۔

”تمہیں یونہی لگ رہا ہے، ظاہر ہے اپنے جنگلے کے آگے تمہیں یہ غریبانہ سماکان ڈپریشن کا شکار بنی گئے گا اور میری مسکین سی متاع، بدذوقی، کا شاہکار۔“ اس نے کھوکھلا ہتھ بٹھو لگا دیا۔

”غریبانہ..... مسکین.....“ میں طنز پر انداز میں چبا چبا کے بولا۔
”جولائی اتنے نامی گرامی بھائیوں کی اکٹوتی بہن ہوا، ایسی زندگی اس کی اپنی پسند ہوتی ہو، اللہ نے تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔“

”اب تم خدائی کاموں میں تو دل اندازی مت کرو۔“ میرے ذوق اور معیار میں جتنے کپڑے نگالنے ہیں نکال لو۔“

”تمہارے ذوق اور معیار کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اسی لیے گھر پہ تمہارا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر دھچکا سا لگا ہے۔“

خود کو جان پوچھ کر قنوطیت پسند بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ جا بجا زرد رنگ، یہ سر ہانے رکھے سوکھے پیلے گلاب، یہ غروب آفتاب کے منظر کی پیٹنگ۔“ میں کھڑا ہو کے جائزہ لینے لگا اور ایک ایک چیز کی نشاندہی کرنے لگا۔

”فیض، ناصر کاظمی اور جون ایلیا کے شعری مجموعے، یہ بھسے شاہ کی کافیاں، یہ غلام علی کی غزلیں اور یہ.... یہ کون ہے۔“

ڈریننگ ٹیبل پر سلور فریم میں جی ہتے مسکراتے بچے کی تصویر دیکھ کے میں نے پوچھا۔

”یہ فہد ہے میرا فہد۔“ وہ یوں ہار مان کے بولی جیسے اب بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

”یہ فہد ہے، میرا فہد۔“

میں نے یقین سا ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے بارے میں سوچ کے رکھے وہ تمام امکان میرا منہ چرانے لگے۔ کسی حقیقت پسندی سے وہ سب سوچتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ سنایا تھا کہ اگر ان میں سے میرا ایک وہم بھی حقیقت نکلا تو میں زینبا کو اپنے ذہن سے جھٹکنے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گا اور اب بغیر ہلکے جھٹکے میں اس کے جھٹکے سر اور رزنی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اپنی جڑیں ہی میرے اندر بچھایا رکھی ہوں گی تو بھلا مجھے کتنی دیر اور لگے گی اپنے وجود سے اس کا پھینکنے.... اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور تصویر کو دیکھنے لگی وہ شفاف پوتر آنسو.... اور ان سے وضو کرتی کچی کچی آنکھیں.... جڑیں اور تیزی سے پھیلنے لگیں۔ میرے دل میں، دماغ میں، ہونچوں میں

ہر طرف ایک جنگل پل ہی پل میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس جنگل کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔ جڑیں جلادینا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بچے کی ماں، طلاق یافتہ یا پھر شاید بیوہ عورت کو میں.....

”میں..... اس کی.....“ کتنی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ میں چونک اٹھا۔

”وہ میرا فہد تھا، عاشر.... میرا اپنا.... میرا سب کچھ۔“ وہ بتانے لگی اور میں پورے دھیان سے سننے لگا۔

”میں نے ابھی ابھی بچپن سے دامن چھڑا تھا کہ میری اماں مجھے چھوڑ کے چلی گئیں۔ اس عمر میں میں نے زندگی میں پہلی بار خود کو تنہا محسوس کیا، حالانکہ گھر میں صرف میں نہ تھی، پاپا تھے۔ بڑے بھیا زید فاروق اور چچو نے بھیا زین فاروق تھے۔ میری بیوہ چچو پھونگی ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہتی چلی آئی تھیں۔ وہ بے اولاد تھیں اور مجھے ہمیشہ سے انہوں نے اپنی بیٹی جانا، کیونکہ جب وہ شوہر کی وفات کے بعد اس گھر میں آئیں تو میں صرف دو ماہ کی تھی۔

میرا بچپن ویسا ہی گزرا جیسا کہ کسی بھی آسودہ حال مکمل فیملی میں رہنے والے بچے کا گزرتا ہے۔ سلکھا ہوا ماحول، دولت کی فراوانی، محبت کرنے والے ماں باپ، دو قابل فخر بھائی، عمدہ اسکولنگ.... زندگی ایک سیدھے ٹریک پر رواں رواں تھی کہ ماما کی اچانک ڈسبھہ بھی ہلا کے رکھ دیا میں تب فرسٹ ایئر بن گئی۔

بھائیوں نے جلد ہی خود کو مستہال لپا۔ زید بھیا نے سی ایس ایس نمایاں کامیابی کے ساتھ کیتھ کر لیا تھا۔ ماما کی معنکی اپنی بھانجی سے اپنی زندگی میں کر گئی تھیں۔ زین بھیا کی تعلیم بھی آخری مراحل میں تھی۔

ماما کو گزرے سال بھی نہ ہوا تھا کہ آئی نے زویا کی نصیحتی کا ایڈھو کھڑا کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاپا ان سے، بھیا سے، مجھ سے، چچو سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پاتے۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید وہ ماما کے فورا "بعد گھر میں شادی نہیں رکھوانا چاہتے۔ خیر پورے خاندان کے مشورے سے ماما کی پہلی بری کے دو ماہ بعد شادی مقرر ہوئی۔ پاپا حیرت انگیز طور پر پرسکون نظر آنے لگے۔ اکثر ان کی چچو چچو سے لمبی لمبی مینٹلز چلا کرتیں۔ وہ عموماً نہیں آہستہ آہستہ آواز میں کچھ سمجھایا کرتیں وہ بھی تو بے زاری سے اثبات میں سر ہلاتے رہتے۔ کبھی شدت سے لگی میں سر ہلانے لگتے۔ مجھے اس سے زیادہ غور کرنے کا وقت نہ ملا۔ گھر کی پہلی شادی تھی۔

بھابھی کو گھر آئے دو ماہ ہوئے تھے۔ اس دن زید بھیا ایک عجیب سی خبر لے کے آئے۔

”زینی! میں مکمل تصدیق کے بعد ہی یہ راز تمہارے سامنے کھول رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بابا نے تمہیک گیارہ ماہ پہلے یعنی ماما کی ڈسبھہ کے صرف چھ ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ دوسری بیوی انہوں نے مری والے کا بیٹا میں رکھی ہوئی ہے اور ان کا ہر ویک اینڈ وہیں گزر رہا ہے۔“

”اور ہم سمجھ رہے ہیں کہ ماما کے بعد ان کا دل گھر میں نہیں لگتا، دوستوں میں وقت گزارتے ہیں۔“

”یہ تو جانتے ہیں تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ نہیں، ایک عورت کے پاس دل بہلاتے ہیں۔“ زین بھیا بھی تملارہے تھے۔

زویا بھابی کیوں پیچھے رہیں۔

”اور جب میری ماما نے شادی کا مسئلہ اٹھایا تو سب کہنے لگے، ابھی تو آؤ غنی کو گئے سال ہوا ہے۔ بری کے فورا بعد شادی رکھ لی..... جب کہ انکل نے تو بری تک کا انتظار نہ کیا۔“

میں اگرچہ صدمے کی کیفیت میں تھی لیکن زویا بھابھی کے منہ سے پاپا کے بارے میں ایسے تحقیر آمیز کھلے اچھے نہ لگے۔ چچو بھو بول پڑیں۔

”بس کن روز دیا! تمہیں اسے سر کے معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔“

”چچو چچو، وہ بھی اسی گھر کی فرد ہے، وہ بھی اسی صدمے سے گزر رہی ہے۔“ زید بھیا سے بیوی کی بچاری سی شکل دیکھی نہ گئی۔

”اور کیا کیا تمہیں تم نہیں کہ انکل نے آؤ غنی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہ ہونے دی۔ اتنے سالوں کے ساتھ کوئی جلدی بھلا دیا۔“

”لیجوزو! آؤ غنی کوئی غیر شرعی فعل نہیں کیا، نہ ہی کسی کا حق غصب کیا ہے۔ ہاں جو ان میں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے اس سے اور میں تو اس سے کہتی ہی رہی کہ یہ باتیں بھلا پھپھانے سے چھٹی ہیں، خود ہی بیٹوں کو اعتماد میں لے لو۔“

”چچو چچو! آپ جانتی نہیں۔“ دونوں بھائی ان سے بھی شکا کی ہو گئے بھابھی کو اور موقع مل گیا۔

”اُمی عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ چچو چچو آپ کو اپنی اس بھابھی کا ذرا خیال! آہ! انکل نے تو خیر بیوی کی وفا میں بھلائی دی تھی۔“

”زویا زیادہ بڑھ چڑھ کے مت بولو۔ ورنہ میں نے کچھ کہہ دیا تو منہ چھپاتی بھرد گی۔ میری بھابھی کو خدا جنت نصیب کرے۔ وہ واقعی ایک بہترین عورت تھی۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں اور عمر کو اللہ نے اور مذہب نے حق دیا۔ جس کا اس نے استعمال کرنے کے بعد مجھے صرف مطلع کیا، اس میں کس عورت پر ظلم ہوا۔ اور میں وہاں میں بھلائے کی بات.... تو وہ بھوتہا اگر عمر پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرتا جیسا کہ تمہارے بھائی نے کی۔“

”دیکھیں.... دیکھیں.... زید! آپ دیکھیں ذرا پھوپھو کو۔“ وہ شٹیا گئیں۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بڑھ چڑھ کے مت بولو ورنہ، اب تم عورت پر عورت کے ظلم کی بات کرتی ہو، تمہاری بڑی بہن سارہ بھی تو کمال عمر کی پہلی بیوی کو طلاق دلوانے کے بعد بیاہی گئی ہے۔“

پھوپھو ایسی ہی تھیں، کھری کھری سناتے والی۔

یہ مسئلہ تو پھوپھو کی مداخلت کے باعث دب گیا، اب مرحلہ پایا سے بات کرنے کا، پھوپھو نے اس موقع پر بھی مکمل تعاون کیا۔

پاپا آئے، شرمندہ شرمندہ سے، چھپچھپتے سے۔ کچھ گلے شکوے ہوئے، کچھ صفائیاں پیش ہوئیں۔ زندگی پھر نئے سرے سے شروع ہو گئی۔ پاپا پہلے کی طرح ہفتے میں دو تین دن مری گزارنے لگے۔ تب ہم اسلام آباد میں رہا کرتے تھے۔

پاپا کی شرمندگی بھی رفتہ رفتہ زائل ہو گئی۔ لیکن ان میں اور اولاد میں ایک پردہ سا حائل ہو چکا تھا۔ اسی طرح دو ڈھائی سال اور گزر گئے۔ میں نے اپنے بی بی کام کے ایگزیکٹو دے رکھے تھے۔ اور گھر پر وقت گزار رہی تھی۔ زید بھی بیاہیں تھے لیکن زین بھی کی پوسٹنگ آئرلینڈ ہو چکی تھی۔ زویا بھابی کے دو بچے تھے اب پھوپھو کے ذریعے اطلاع ملی کہ پاپا کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا ہے۔ مجھے بہت عجیب محسوس ہوا۔ بھیجا بیٹے نے فقرے سنا کے رہ گئے۔ زویا بھابی اب پھوپھو کے رعب میں نہ آئی تھیں۔ جو دل چاہتا کر جائیں کہہ جاتیں۔ پھوپھو کا سارا دم اورد بد بھی ہوا ہو چکا تھا۔

جب بھائی نے اپنا ہی احترام اولاد کے آگے کھویا تو وہ اولاد نہیں کیا احترام دیتی۔

پاپا نے فیصلہ سنایا کہ اب وہ روہینہ (ان کی دوسری بیوی) اور بچے کو مری میں نہیں رکھیں گئے۔ وہ اسی گھر میں رہیں گے، اس فیصلے نے تین سال سے طاری جھوڑ اور جھگڑوت کی فضا کو تیس تیس کر رکھ دیا۔ دونوں بھائی بھڑک گئے۔ زین بھیافون پر مسلسل رابطے پر تھے۔ دونوں نے اپنا جوابی فیصلہ سنایا کہ یا تو اس گھر میں وہ عورت رہے گی یا پھر ان

کے بیٹے۔

یہ فیصلہ فون پر پاپا کو سنایا گیا، انہوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا، صرف یہ کہا کہ ہم پرسوں آرہے ہیں۔ زویا بھابی نے اپنا سارا میک اپ اکٹھا کر لیا گھر میں اس دن ہمارا سارا خاندان پاپا کو کھن طعن کرنے کے لیے جمع تھا، زید بھیابھرے بیٹھے تھے۔

اور پھر وہی ہوا جو پاپا نے کہا تھا اور وہ بھی جو بھیا نے کہا تھا۔

پاپا نے کہا تھا اب وہ روہینہ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ دونوں اب ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہنے کے لیے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ ایک کارا ایکڈنٹ نے دونوں کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا تھا۔

بھیا نے کہا تھا انہیں اس گھر میں جگہ نہیں ملے گی، نہ ان کا ٹھکانہ کہیں اور ہوگا۔ اس گھر میں یا تو وہ رہیں گے یا پاپا.... اور پاپا کو واقعی اس گھر میں اب جگہ نہیں مل پائی ان کا ٹھکانا تو اب قبرستان تھا۔

اس صورت کی آخری رسومات کا انتظام دونوں بھائیوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسی گھر میں کیا، وہ پاپا کے ساتھ ہی رخصت ہوئی۔

اس کا باپ، بہن اور دیگر رشتہ دار ہمارے گھر جمع تھے جو شکل سے اور عادات سے بھی اپنا ہلکا پن ظاہر کر رہے تھے۔ یقیناً پاپا ان فریبی لوگوں کے ساتھ بری طرح ٹریپ ہوئے تھے۔ جب سوئم کے بعد بھیا نے ان لوگوں کو یہاں سے جانے کے لیے کہا تو کچھ عجیب سے حساب کتاب کھلنے لگے۔ بھیا نے دونوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اس عمر کی امید مت رکھیں۔ پاپا کی وصیت میں صرف ان تین بہن بھائیوں کا ذکر ہے۔ کسی کو پھوپھو کو زنی تک نہ ملے گی۔ شاید پاپا کو خود بھی زندگی سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ دوسری شادی کے بعد انہوں نے وصیت میں ترمیم کی فی الحال ضرورت نہ سمجھی تھی۔ وہ لوگ چاہتے تو بھیا کو عدالتی کارروائی کی دھمکی دے سکتے تھے، آخر وہ وصیت تب کی تھی جب انہوں نے ان کی بیٹی سے شادی نہیں کی تھی۔

میرے بھائیوں کے مرتے اور وصیت سے مرعوب ہو کے وہ دب گئے، لیکن جاتے جاتے ایک تنہا سچندن کا بچہ آکھ رکھے۔ بلکہ رکھ کیا گئے، پھیک گئے یہ کہتے ہوئے۔ ”ہم نے بھی پرانی اولاد میں سے کھینچنا چاہتے تھے۔ اس کا باپ تمہارا بھی باپ تھا، اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ اس لیے تم ہی اسے سنبھالو۔“

بھیا خوب گرے، لیکن وہ کان لپیٹے اس بوجھ کو اتار کر چلتے بنے۔ زویا بھابی، زین

بھیانے سوچا، مرتو وہ رہا ہے، یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر لاوارث مرا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

مگر وہ بچ گیا۔ ادھر وہاں، ادھر مر اس۔ ایک گردہ ناکارہ ہونے کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا، کمزوری نے اسے تنکے برابر کو چھوڑا تھا، اس میں دوسرے بچوں کی طرح چلا کر رونے کی ہمت تک نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر زنے ویسے بھی سختی سے کہا تھا کہ اسے رونے سے ہر ممکن بچانا ہے۔ وہ مرل سارچہ پھوپھو سینے سے لگائے گھر لوٹیں تو سب شیشا کے رہ گئے۔ پھوپھو نے صاف کہہ دیا۔

”یہ بچہ اللہ نے میرے لیے بچایا ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو تمہاری ماں سمجھ کے اپنی ممتا کی تسکین کی تھی، ہم لوگوں نے مجھے ماں سمجھنے سے انکار کر دیا تو میرے رب نے مجھے پھر سے ماں بنادیا۔“

کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اماور پاپا دونوں نے ساری عمر پھوپھو کا اتنا احترام کیا تھا کہ ہم لوگ ان سے گفتگو کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں بھی پاپا نے وصیت میں اپنی بڑی بہنوں کے لیے کافی کچھ چھوڑا تھا۔ اگر بسا انہیں یہاں سے نکل جانے پر مجبور کر بھی دیتے تو اٹاٹا ہی کی جگہ بنائی ہوتی، پھوپھو کا کیا نقصان ہوتا۔ ذریعہ بھائی البتہ ضرور بڑبڑائیں۔

”میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور یہ تو پیدائشی یرقان کا مارا ہوا ہے۔ سارے گھر میں اب ہائپاسیا کے جراثیم پھیل گئے۔“

پھوپھو چپ چاپ انہی میں شفت ہو گئیں۔ اماور پاپا کے بعد وہی میرا جذباتی سہارا اور انکی سیس، بسیا تو اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔

بھائی نے بھی قریب آئی تھی، دیا ایسے میں پھوپھو بھی جب فہم میں گم ہو کے رہ گئیں تو میں اور اکیلی ہو گئی، میں پھوپھو سے شاک بھی تھی اور فہم سے نالاں بھی۔ ہاں فہم۔ وہ فہم تھا۔ پھوپھو نے اس کا نام فہم رکھا تھا۔ فہم عمر بچ بھائی اتفاق تھا۔ پاپا نے اپنے نام عرفا قو مرتضیٰ کے نام کا ایک حصہ فاروق دونوں بیٹوں کے نام کے آگے لگایا تھا اور دوسرا حصہ عرفا بیٹی کے نام کے آگے لگایا تھا اور اب پھوپھو نے بھی اس کے نام کے آگے عمر لگایا۔ پتا نہیں کیوں؟

میں رزلٹ آنے کے بعد اپنی اسٹڈیز میں بڑی ہو گئی۔ پھوپھو سے انہی اب بھی ویسی کی ویسی تھی اگرچہ وہ گھر کے اندرونی حصے سے ذرا دور انکیسی میں رہتی تھیں لیکن گھر کے کینوں سے زیادہ میرا خیال رہتیں۔

بھیا، زید، بھیا سب کا تھلاہٹ کے مارے برا حال تھا۔ خود میں کوفت اور بیزاری کے طے جلتے جذبات کے ساتھ کارپٹ پر بڑے ننھے سے کیڑے کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے ناگھیں چلا چلا کے خود سے لپٹا کر ابل پیچ کر اپنا تھاب اس کی سوکھی سوکھی زرد ناگھیں ہوا میں چل رہی تھیں۔ اس کے کپڑے حد سے زیادہ لمبے اور بدبودار تھے۔ شاید پچھلے دو تین دن سے انہیں بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ اس کا پچکا ہوا پیٹ ہر سانس کے ساتھ ہسیلوں سے الگ ہو کے بالکل کمر سے جالٹا اس کے نیلے پڑتے ہونٹ اور حلق سے رونے کی کوشش میں عجیب سی خراہٹ نکل رہی تھی۔

تنہی مٹھالی اس زور سے پتلی ہوئی تھیں کہ انگلیاں ہر سی سفید ہو رہی تھیں۔ بھائیوں کے عیض و غضب کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف پھوپھو کی نظر چاک اس پر پڑی تو ترب کے آگے بڑھیں۔ ایک شکایت آمیزی نظر مجھ پہ ڈالی جو قریب ہی بیٹھی اسے سانس لینے کی جدوجہد میں مصروف دیکھ رہی تھی۔

”غضب خدا کا، اتنے سے بچے کو ٹھنڈی زمین پہ ڈال گئے۔ خون سفید ہو گیا ہے خوف خدا تک نہیں رہا، بچے تو معصوم فرشتے ہوتے ہیں ان سے کیا نفرت۔۔۔۔۔“

مجھے ایسے لگا جیسے پھوپھو پر وہ مجھے سنار ہی ہوں۔ میں تیر پتلی اندر چلی گئی۔ بعد میں کسی رشتہ دار خاتون کے تعاون سے پھوپھو اسے ہسپتال لے کر گئیں۔ اس بچے پر یرقان اور مومبے نے اکٹھا حملہ کیا تھا۔ پھوپھو نے ایک بار پھر بھائیوں کے آگے دوہائی دی۔

”کیوں باپ کی روح کو دکھی کرتے ہو۔ اللہ کا ڈر خوف بھی نہیں ہے، لیکن اس دنیا کا تو خوف کرلو جس میں رہ رہے ہو۔ کل تک تمہارے ساتھ بڑھ چڑھ کے عمر کی دوسری شادی کے خلاف بولنے والے لوگ اب تمہاری بے حسی اور تنگ دلی پہ بھرے کمر رہے ہیں کیوں خود کو تباہ بنا رہے ہو۔“

اور پھر شاید خوف خدا سے لرز کے، باپ پھر پاپا کی روح کی تسکین کے لیے باپا شادی چنچ دنیا کے اعتراضات سے ڈر کے۔ انہوں نے اس کے علاج معالجہ میں خاطر خواہ دلچسپی لے لی۔

اس بچے کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق مومبے نے اس کے پھوپھو میں پھر اثر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی وارد ہونے والے یرقان نے جگر اور گردے تباہ کر دیے تھے۔

لیکن میں نے کبھی ان سے یہ نہ پوچھا کہ انہیں ایک بیمار، چھوٹے سے بچے کو سنبھالنے میں کوئی مشکل تو نہیں پیش آ رہی، فہد کا ذکر ہمارے درمیان آتا مگر کیلٹر فوڈ وہ بنی باتیں۔ کل اس نے ساری رات چگایا۔ صبح وہ مسکرایا۔ آج اس کی طبیعت بہتر تھی۔ میں چپ چاپ سوتی رہتی۔

رفتہ رفتہ میں اس کے ذکر میں دلچسپی لینے لگی، لیکن میں نے کبھی وہ دلچسپی ظاہر نہ کی۔ رات کو انہی سے آتی تھی گھنٹی سی سسکائیں مجھے اٹھ کے کھڑکی تک آنے پر مجبور کرتیں اور میں اپنی کھڑکی سے انہی کی کھڑکی کے اس طرف پھوپھو کو گود میں پیراٹھائے تھکیاں دیتے یہاں سے وہاں ٹپٹے دیکھتی۔ اس عمر میں پھوپھو کے یہ رت چمکے۔ یہ مشقتیں مجھے بے چین کر دیتے۔

انہوں نے ایک بار بڑے جھلکے سے ٹھوہ کیا تھا۔

”رینیا! تم سے، زین اور زید سے میرا رشتہ عمر کی وجہ سے ہے، میں تمہاری پھوپھو ہوں۔ یعنی باپ کی بہن، اور چاتی ہو فہد کی میں کیالٹی ہوں، پھوپھو یعنی اس کے بھی باپ کی بہن ہوں۔ اگر میں نے اپنا بہن ہونے کا فرض ادا نہ کیا تو میں عمر کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ مجھے میرے فرض کی ادائیگی پر مت ٹوکو۔ آخر عمر کے پاس جانے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔“

پھوپھو فہد کو کبھی اپنے ساتھ نہ لاتیں عموماً اسے سلانے کے بعد مجھ سے ملنے آتیں۔ دودن تک جب وہ نہ آئیں تو میں بے چین ہو جاتی۔ مجھے یہی گمان گزرا کہ ضرور اس بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی، اس لیے وہ آ نہ گئیں۔ کیونکہ کچھ دن پہلے انہوں نے اس کی بیماری کا ذکر کیا تھا، اسے کوئی دودھ بھی تو سوس نہیں کرتا تھا۔ ایک دودن میں نے ضبط کیا پھر تیسرے دن اس خیال کی سخت چلی آئی کہ بعد میں پھوپھو یہ نہ کہیں کہ میں ان کا پتہ کرنے بھی نہ آئی۔

یہ تو مجھے خیال تک نہ آتا تھا کہ پھوپھو خود بھی بیمار ہو سکتی ہیں۔ ان کی دگرگوں حالت دیکھ کے میں دنگ رہ گئی۔ فہد، ہماری ملازمہ پروین کی گود میں سو رہا تھا اور پھوپھو، نڈھال وجود، تومر سرخ آنکھوں کے ساتھ چادر اوڑھے نہیں جانے کی تیاری میں تھیں۔

”بیمار ہو رہا ہے پھیلے چار دن سے۔ ساتھ میں بلڈ پریشر بھی پانی رہا ہے۔ فہد کی بیماری نے مجھے تھکا ڈالا۔ شکر ہے اب وہ کچھ بہتر ہے، لیکن میرا حال برا ہو گیا تم نے بھی.....“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں میں نے فوراً ”صفائی پیش کی۔

”پھوپھو! میرے ٹیبت ہو رہے تھے، لیکن مجھے یہ گمان بھی تو نہ تھا کہ آپ بیمار ہو گئی۔ دودن ٹیبت ہوتے ہی تو میں آ جاتی۔ آپ ڈاکٹر کی طرف جارہی ہیں، آئیے میں لے چلوں۔“

ڈاکٹر کے پاس تو پھیلے ایک ہفتے سے پکڑ لگا رہی ہوں، مگر فہد کے لیے..... اپنی خاطر دیکھ کھانے کی ہمت نہیں، پہلے زید پوچھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھ میں لحاظ تھا، اب تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے، اس کے سامنے انہی کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہوں، قریب سے گاڑی لے کر گزر جاتا ہے۔

ان کے دردمجر سے مجھے یہ میں شرمندہ ہو گئی۔

”نی! الجال تو میں بینک جا رہی تھی۔ کچھ پیسے نکوانے ہیں۔ فہد کو عام ڈے کا دودھ موافق نہیں۔ ڈاکٹر نے کوئی اور دودھ لکھ کے دیا ہے۔ اچھا خاصا مریگا ڈے ہے۔ میں انکھے لے کے رکھ لیتی ہوں، لیکن اس نے چھینٹے دو ہفتے بہت دودھ لیا اس کا معدہ اتنا کمزور ہے کہ اب تک محض غذا ہضم نہیں کرتا۔ حالانکہ چھ مہینے کا ہو چکا ہے۔ کل پروین سے میں نے سوردے ادھار لے کر ڈے منگوا یا۔ میرا بلڈ پریشر اتنا بھی تھا کہ اسے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ پکڑ آیا اور ڈے منچے کر گیا۔ تقریباً ”آدھے سے زیادہ دودھ ضائع ہو گیا۔ اب سوچا، ہمت کر کے باہر نکلوں، بچے کو بھوکا تو نہیں مارا۔“

میں لرز کے رہ گئی۔ پھوپھو تکلف میں ہیں اس کا اندازہ مجھے تھا، لیکن پھوپھو سے ہمدردی کر کے میں زید بھیا کی ڈانٹ نہیں کھانا چاہتی تھی۔ لیکن اس وقت میں خود کو نرم پڑنے سے روک نہ پائی۔

میں پھوپھو کو پہلے ڈاکٹر کے پاس اور پھر بینک لے کر گئی۔ ڈاکٹر کے مطابق پھوپھو جسمانی کمزوری کے ساتھ ساتھ ذہنی تھا، انہیں کمی اور ڈپریشن کا شکار تھیں۔

راستے میں انسور بے رک کے صرف پھوپھو کی تسلی اور خوشی کے لیے فہد کی بے شمار چیزیں خریدیں۔ ڈپریشن کے بیک، دودھ کے ڈبے، سیریلیک کے فلیور بے بی لوشن، فیئر، کھلونے وغیرہ۔

میں نے انہیں آرام زیادہ سے زیادہ کرنے کی تلقین کی جو ابادہ فہد کو دیکھنے لگیں، میں نظریں چرا گئی۔ پروین چلی گئی تو پھوپھو کو اپنے سامنے کھانا کھلا کے، دوا پلا کے، سلانے کے بعد میں آہستہ سے وہاں سے نکلی۔ ابھی دوا زہندی کی تھا کہ فہد کے رونے کی آواز آنی شاید بھوک سے بے تاب ہو کہ وہ جاگ گیا تھا، میں نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر ایک پل سے زیادہ نہ کر سکی۔ اگر میں اندر جا کے اسے نہ بھلاتی، تو پھوپھو جاگ کے اسے

سنہالنے لگتیں۔ مجبوراً مجھے اندر جانا پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کرتی، پھوپھو مجھے دیکھ کے مطمئن ہو کر پھر لیٹ گئیں۔ شاید انہیں یقین تھا میں فہد کو سنبال لوں گی اور میں نے ان کا یقین نہ توڑا، میں نے فہد کو..... فہد عمر کو اپنے بھائی کو۔ اپنے پایا کی آخری نشانی کو..... اس کی آواز کانہی۔

”فہد کو پہلی بار پھوپھو۔ میرے جسم میں گرمی لہر دو گئی، جیسے ڈھیروں خون شریانوں میں اُمنڈ آیا ہو۔ اسے خاموش کرانے کے لیے بے ساختہ سینے سے لگا کر تھپکا تو جیسے دھڑکنوں میں حلاطم آ گیا۔ میری آنکھیں اُمنڈ آئیں۔ اس کی پٹیا بدلتے ہوئے فہد پر تیار کرتے ہوئے، کھٹنے پہ لٹا کے دودھ پلاتے ہوئے۔ لہلہا کر اسے سلانے کی کوشش کرتے ہوئے میں روتی رہی۔ سلسل روتی رہی۔ وہ سو گیا، میری گود میں بے فکر، منہ میں اگھوٹا دبائے سو گیا۔ میرا چہرہ آلسوؤں سے اور میرا وجود یک یک ممتا سے بھجک چکا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر اپنا پہلا بوسہ دیا اور میرے لبوں سے اس کی پیشانی تک ایک انوٹ رشتہ بندھ گیا۔ اب وہ میرا فہد تھا۔“

وہ چپ ہو گئی۔ آنکھیں ساکت تھیں، لیکن لب مسکرا رہے تھے، جیسے ابھی ابھی کسی نرم سی پیشانی کے گدگداتے لمس نے انہیں کھلنے پہ مجبور کر دیا ہو۔ کچھ دیر اسے اسی طرح کم صدم دیکھتے رہنے کے بعد میں ضبط نہ کر سکا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا۔ تمہارے بھائی سے تو یہ برداشت نہ ہوا ہوگا۔“

”برداشت۔“ وہ پھر سے ماضی میں چلی گئی۔

”برداشت تو کیا، وہ تسلیم کرنے پہ بھی تیار نہیں تھے کہ میں حق پہ ہوں اور وہ غلطی پہ۔“ انہوں نے اب پھوپھو سے میری ساری لفظ بالائے طاق رکھ دیے۔ ان کے مطابق پھوپھو نے مجھے درغلا یا ہے۔ اور وہ جانیدار کے لیے کبھی میں محاذ قائم کرنے کی خاطر مجھے استعمال کر رہی ہیں۔ بہت ہنگامے ہوئے، لیکن میں ڈٹی رہی۔ اتنے بڑے اور ریک ازام نے پھوپھو کو سخت دل گرفتہ کیا۔ انہوں نے مجھے پلٹنے کو کہا اور یہ بھی کر وہ اکیلے اسے پال سکتی ہیں۔ لیکن میں نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔ میرا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ وہ تھا پایا کا بیٹا..... زینیا عمر کا بھائی۔ فہد عمر.....

میں نے کوئی پروا نہ کی اور پھوپھو اور فہد کے ساتھ گن ہو گئی۔

وہ اب مجھے پہچانے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کے ہوا میں ہاتھ بلند کر لینا، جیسے اڈ کے مجھ تک آنا چاہتا ہو۔ اس نے پہلا قدم میری اٹھانگ کے اٹھایا تھا۔ اس کے لبوں سے پہلا لفظ ”آپ“ نکلا تھا وہ چار سال کا ہو چکا تھا۔ البتہ اس کی صحت پہلے جیسی تھی۔ جب اس کی

حالت بگڑتی، میں کانپ جاتی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر آ کر مایا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی حملہ آور ہونے والے برقان اور نمونیا اور پھر ابتدائی طور پہ برقی کلاپروانی اور غفلت نے اس کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔

وہ انتہائی سردیوں کے دن تھے، پھوپھو کی اور میری لاکھا احتیاط کے باوجود وہ پھر سے نمونے کا شکار ہو گیا۔ ہاپتلا نہ کرنے کے بعد، اینٹی بائیوٹکس کے بے دریغ استعمال نے اس کے اگلوتے گردے پہ برا اثر ڈالا۔ نمونے کے اثرات دور ہو گئے، لیکن ڈاکٹر کے مطابق یہ گردہ اب اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جیسا ہی طور پر اتنا کمزور تھا اور صحت کی دیگر پیچیدگیاں کچھ اس طرح اس کی جان سے جمنی ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر تہہ بلی گردہ کا آپریشن کرنے سے ہچکچا رہے تھے اور یہی واحد حل تھا اسے پہچانے کا۔ ڈاکٹر حمید کے مشورے کے مطابق میں نے شکاگو ہاپتلا میں منیٹ کے ذریعے اس کی رپورٹس وغیرہ پیچیدگی۔ جلد ہی اس کا حوصلہ افزا جواب آ گیا۔ لیکن علاج اور کنٹ کے اخراجات میرے اور پھوپھو کے اعتبار سے باہر تھے۔

پھوپھو کے نام وصیت میں نہانے کس لیے پاپا نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں یہ جانیدار بیچ نہیں سکتی تھیں، شاید انہوں نے بیوہ اور بے اولاد بہن کا اس میں کوئی بھلا سوچا ہو کہ کہیں کوئی انہیں بیچنے پہ مجبور کر کے خالی ہاتھ نہ کر دے۔ ان کے حصے میں آئی آباؤی زمینوں کے علاوہ ایک مکان تھا اور بینک اکاؤنٹ میں چند لاکھ روپے جو اب تیزی سے ختم ہو رہے تھے، بھائی نے ان کی طرف سے بالکل ہاتھ ہٹچ رکھا تھا۔ وہ اتنا عرصہ اسی بینک اکاؤنٹ سے فہد کو باقی آئی تھیں۔ ”مجبوراً“ ہم دونوں نے زید بھیا کے آگے فہد کی زندگی کے لیے ہاتھ پھیلا یا۔ اور انہوں نے مرے ہوئے باپ کی لاج نہ رکھی تھی۔

ماں جیسی پھوپھو کی زندگی سے خارج کر دیا تھا تو پھیلے ہوئے ہاتھوں کا مان کیا رکھتے۔ بات چند لاکھ نہیں تھی، بات ان کی ضد تھی۔ وہ ہر حال میں فہد کو منظر سے غائب دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے ان کی منت سماجت بھی کر کے دیکھ لی، خون کا حوالہ بھی دیا، خاندان کے چند سرکردہ بزرگوں کی سفارش بھی کرائی، خدا کا خوف بھی دلایا اور واسطہ بھی دیا۔ سب بے سود.....

اب میرے پاس آخری کارڈ تھا اور میں نے اس آخری حرفے کو آ زمانے کا فیصلہ کر لیا، اب میں کوئی سترہ اٹھارہ سال کی کا بچہ لڑکی نہ تھی جو بھائیوں کے نقش قدم پہ چلتی۔

آخر کار زین اور زید بھادوں کی جانب سے صاف انکار سننے کے بعد میں نے وہ آخری قدم اٹھانے کا سوچ ہی لیا۔ پھوپھو نے مجھے بہت روکنا چاہا۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ میں اپنے بھائیوں کی سوسائٹی میں پوزیشن فراموش کر چکی تھی، مجھے صرف ہند کو انصاف دلانا تھا۔ پھوپھو نے ایک بار پھر سمجھا نا چاہا۔

”کیوں خود کو تنہا کر رہی ہو۔ نہ ماں ہے، نہ باپ، یہ دو بھائی ہی تمہاری جھپٹ ہیں اور یہی سہارا۔“

وہ بے لحاظ اور بے مروت ہو چکے ہیں، اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر، ہر قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے دل نفرت نے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ خیریت ای میں ہے کہ مجھ کو نہ لگو۔ اگر ہند کی زندگی ہوئی تو تمہیں اس سے کون الگ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا نے اس کی عمر اتنی ہی لکھی ہے تو تمہارے کچھ بھی کرنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں البتہ تم ساری عمر کے خسارے میں رہو گی۔“

”نہیں پھوپھو۔۔۔۔۔! میں ہند کو یوں بے بسی اور لا چاری سے مرستے نہیں دیکھ سکتی۔“ میں نے تہیہ کر لیا اور ای شام وکیل سے ملی۔ اگلے ہی دن میں نے کورٹ میں ہند کی سرپرست کی حیثیت سے زید فاروقی بھی پر جائیداد میں حصہ کی اپیل کر دی۔ ہند کے وارث ہونے کے دعوے کو ثابت کرنے کی میں نے خوب کوشش کی۔ لیکن جانتے ہو عاشر کیا ہوا۔۔۔۔؟ میں سمجھتی تھی قانون ہند کو عمر فاروق کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے برابر کا حق دے گا میں اسے علاج کے لیے باہر لے جاؤں گی۔

پتہ ہے۔۔۔۔۔ عاشر! بات میرے وہم و گمان سے بچی آگے تھی میں تو کیا مجھے اچھا برا سمجھانے والی پھوپھو تک دنگ رہ گئیں۔

انہیں اپنے بھائی کے خون سے اس بلکے پین کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے تو وہ کیا کہ میں کسی کو یہ بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس کر بی ہوں کہ میرے بھائی ہیں۔ میرے اپنے بھائی۔ میرے اپنے باپ کی اولاد۔ جنہوں نے اپنے ہی باپ کی اولاد کو۔۔۔۔۔ ”وہ اب کانے لگی تو میں بے تالی سے کہہ اٹھا۔“

”کیا انہوں نے ہند کو مر وادیا۔؟“

”انہوں نے اپنے مرے ہوئے باپ کو ایک بار پھر بار دیا۔“ اس نے ہنسی لی۔

”عاشر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ہند کی ماں کے رشتہ داروں کو خرید لیا اور نکاح نامے کو غائب کرتے ہی عدالت میں بی ثابت کر دیا کہ ہند ان کے باپ کا ناجائز اولاد تھا۔ ہند کے تانا نے بھی مری ہوئی بیٹی کی قیمت وصول کرتے ہوئے

ہنسی کا مظاہرہ نہ کیا۔ میں اتنی حیران ہوئی کہ عدالتی کارروائی کے خلاف احتجاج تک نہ کر سکی۔ مجھے یقین بھی نہیں آیا کہ یہ حرکت میرے تعلیم یافتہ، اعلیٰ نسب خاندانی بھائیوں نے کی ہے۔

میں یہ تیل بدل برداشت نہ کر سکی۔ اس دن میں نے اور پھوپھو نے ہند کے ساتھ وہ انہی خالی کردی۔ وقت بہت کم تھا۔ اور ہند کی حالت دن بدن خراب ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا واحد کردہ جینے کی کوشش میں اور بھی پکڑا ہوا جا رہا تھا، میں نے دوسرا نمبر ”نجیا“ آسان راستہ منتخب کیا۔ میں چوبیس سال کی ہو چکی تھی۔ میری تعلیم مکمل تھی۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور بھائیوں نے لاتعلقی اختیار کرنے کا قانونی نوٹس دے دیا تھا۔ عدالت میں جائے بغیر بڑی آسانی سے صرف ایک نوٹس کے ذریعے میرا وکیل جائیداد میں سے میرا حصہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے اونے پونے وہ ساری جائیداد بیچی۔ ویزا لگوا یا۔ پاسپورٹ بنوایا، میں پھوپھو اور ہند کے ساتھ جانے کی تیاری میں تھی کہ۔۔۔۔۔ ہند۔۔۔۔۔ عاشر وہ مر گیا۔ عاشر۔۔۔۔۔ میں نے ایک بار پھر صبر کر لیا کیا کرتی اس بار بھی لینے والا اللہ تھا۔ ہاں بھیا کو میں نے خدا نہیں بنے دیا۔ ان کو میں ہر آفتی لکھی۔ اتنا اطمینان تو مجھے تھا لیکن ہند۔۔۔۔۔ میرا ہند۔۔۔۔۔ ”وہ گھنٹوں پہر رکھ کے روئے لگی میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھ کے اس کے قریب آ بیٹھا۔

”زیینا! بس کرو اس معصوم بچے کو تکلیف ہو رہی ہو گی۔“

”مجھے یہ احساس کچھ کے دیتا رہتا ہے۔ اگر بھیا اس کے علاج میں تاخیر کا سبب نہ بنے تو شاید آج وہ جی رہا ہوتا۔ پتا ہے آج اس کی دوسری برسی ہے۔“

ہند کی وفات کے بعد بھیا مجھے مٹانے آئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اب کاٹنا درمیان سے نکل چکا ہے۔ اور اس طرح اکلوتی بہن کا بھائیوں سے الگ رہنا ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھا میں نے جانے سے انکار کر دیا۔

ان کے بار بار تنگ کرنے پر میں نے اسلام آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا رزلٹ آچکا تھا۔ حسب سابق میں نے پوزیشن لی تھی۔

پاپا کی محبت کا قرض اور ہند کی محبت کا تقاضا تھا کہ میں زندگی بھر زید بھیا اور زین بھیا کی شکل نہ دیکھوں، کیونکہ وہ دونوں ان دونوں کے بچرم تھے۔ اور اس کا واحد صل تھا کہ میں اپنے بطن کو بٹے پہ جینے کی کوشش کرتی۔ اپنی پر اپنی اونے پونے بیچ کے میں ویسے ہی نقصان اٹھا چکی تھی۔ جو بچہ وہ سیٹھ کے پھوپھو کے ساتھ لاہور چلی آئی۔ اتنا کچھ تو تھا کہ

بیٹھ کے بھی کھا سکتی تھی، لیکن خود کو بھلانے کے لیے جاب کر لی۔ یہ چھوٹا سا گھر خیرا۔ جاب کرنے سے واقعی دل بھلا۔ تم جیسے دوست ملے۔ ملنا جلنا ہوا۔ پتا چلا کہ دنیا کسی ایک کے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ تمہارے گھر بندے کی تو احساس ہوا میرا فہم دنیا میں ایک ہی نہیں تھا۔ یہاں تو ہزاروں فہم ہیں۔ سب پیارے ہیں۔“ وہ آنسو ایک بار پھر صاف کرتے ہوئے مسکرائے گی۔

”آج اس کی دوسری برسی رہی میں رو نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تمہارے گھر گئی فہم سے مل کے فہم کی یاد کو بھلانا چاہتی تھی۔

فہم کے بارے میں اور کیا بتاؤں، سوائے اس کے کہ وہ میرا سب کچھ تھا اب میں بالکل خالی تھا ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔“

”میں ہوں نہ بیٹا.....! میں ہوں تمہارے پاس۔“ میں کہنا تو چاہتا تھا، لیکن خود کو اس سپردگی پر آمادہ نہ کر سکا۔ میرے ہاتھ بڑھے، لیکن اسے سہارا دینے کے بجائے صرف دلاسا دے کر دھکے۔ میں اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”میں نہیں جانتا کہ فرشتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر ہوں گی تو شاید، بلکہ یقیناً! ایسی ہی ہوں گی۔ پاک آنسوؤں سے دھلی پاک آنکھیں۔ یہ آنسو نہ پچھتاوے کے تھے نہ پشیمانی کے۔ نہ دکھ کے، نہ تو بڑے انوکھے سے غم کے انوکھے سے آنسو تھے۔ میں دیر تک اٹکی کی پور پر میرے کئی کی طرح دیکھنے اس آنسو کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

”اور آنسو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ گدنے، مٹیالے سے بدبودار.....“ اپنی سیٹھ پہ بیٹھے بیٹھے اچانک حال میں واپس آتے ہوئے میں نے اپنی اٹکی کی پور کو دیکھا، جہاں کچھ دیر قبل میری بھی آنکھ سے ایک آنسو آزاد ہو کر تھا۔ آنسو خشک ہو چکا تھا..... یا شاید گر گیا تھا اب میری اٹکی پر ایک ہونٹا سیاہ دھبہ باقی تھا۔

”کیا یہ میرے دل کی سیاہی تھی جو آنسو کے راستے باہر آ گئی۔ آنسو دل کے رستے ہی تو آتے ہیں۔ کیا اپنے دل کی سیاہی مکمل صاف کرنے کے لیے مجھے اور رونا چاہیے۔“

☆☆☆

اس کی اصلیت جان کر میں اب اسے پہلے سے بڑھ کے پسند کرنے لگا تھا۔ بھلے مجھ میں سو خامیاں ہوں، لیکن ہر نازل انسان کی طرح میرا ایک آئیڈیل تھا۔ خامیوں سے پاک، ہر برائی سے ہر اعلیٰ ظرف، بلند کردار، بھجوں کی انتہا چھو جانے والا ایک مثالی کردار..... وہ ایسی ہی تھی۔

امی سے اور سب سے بڑھ کے فہم سے اس کا لگاؤ بھی نہیں اور قریب لے آیا اب ہمارے تعلقات آفس تک محدود نہیں رہے تھے۔

وہ تو اپنی تمام زندگی میرے سامنے کھول ہی چکی تھی۔ میں بھی اپنی ہر قابل ذکر پریشانی اس سے شیر کر لگا۔ لیکن میرے بڑا یہ تو مسئلہ ایسے تھے جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ ان سے میرا اندر عیاں ہوتا تھا۔ زینا نے اپنا آپ اس لیے عیاں کیا تھا کہ اسے اپنے ہونے پر شرمندگی نہیں تھی۔ جب کہ میں..... میں اب گھبرا لگا اپنے اندر کے عاشر ملک سے اپنی پر تکبر شخصیت اور خود غرض فطرت سے۔ ترک کرنے کا حوصلہ اب بھی نہیں تھا۔ بس پر دے ڈالنے کا ہنر آ گیا تھا۔ میں اپنے غرور سے الگ ہو کے جی نہیں سکتا تھا۔ یہی اگر مجھے اس کے آگے اٹھایا نہیں ڈالنے دے رہی تھی۔ وہ لاکھ اچھی سہی۔ میں اسے اپنی مرحومیت کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ یہی تو میری غلطی تھی۔

میرا دل اس کے آگے مجھے کرتا تھا اور میں خود پر شرمندہ ہوتا رہتا کہ وہ اس سے..... ایک عام سی لڑکی سے مرعوب ہے۔ اس عام سی لڑکی سے جو زمانے بھر سے خاص لگتی ہے۔ اس کے اسی خاص پن سے متاثر ہونے کے باوجود میرے اندر کا عاشر ملک چاہتا تھا کہ وہ اوروں کے لیے بے شک خاص، بلکہ خاص تر بنی رہے۔ مگر میرے سامنے ایک عام سی لڑکی ہی بن کر رہے۔ عام سی لڑکی، جو راتوں کو میرے خواب دیکھے۔ دن کو میرے خیالوں میں گم رہے۔ میرے نام کی باللاہینے والی۔ میرے ساتھ کی دعا میں مانگنے والی۔ میرے نام کی انگوٹھی پہننے کی تمنا رکھنے والی۔ اور اپنے نام کے آگے میرا نام لینے کی خواہش میں جیسے مرنے والی عام سی لڑکی..... میں اس کے عام ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پہل میں کسز اتار رہا۔

فہم کے لیے وہ دیوانی تھی۔ شرمین کے بد صورت رویے کے باوجود جتنے میں ایک آدھ بار چاکلیش اور کھلونوں کے ساتھ اس سے ملنے آ جاتی۔

اس دن جب وہ فہم سے ملنے آئی تو سوئے اتفاق شرمین پہلے سے کسی بات پر بھری بیٹھی تھی۔ فہم نے اس کے سامنے اس کا موازنہ کسی بات پر نہ بیٹھا سے کیا تھا اور اپنی فطری چنگا نہ سادہ دلی سے کام لیتے ہوئے اپنی فیورٹ زینا آئی کو زبانیہ مارکس دے ڈالے۔

شرمین سے یہ سچائی ہضم نہ ہو سکی، اس نے نہ صرف فہم کو جھڑکے رکھا بلکہ زینا کو بھی غایانہ بے نقطہ سنیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہو۔ میرا بھڑک کے بول اٹھنا اسے مزید مشتعل کر گیا۔ ابھی ہماری کھار جاری تھی کہ زینا کی آمد ہو گئی۔ سارے معاملے سے یکسر انجان وہ بے چاری فہم کا بسورتا چہرہ اور خفا خفا انداز دیکھ کے پریشان ہو بیٹھی اور

صرف اتنا پوچھ بیٹھی۔

”کس نے ستایا۔ میرے بچے کو... مجھے نام بتاؤ؟“ اس کا پچکارنا شرمن کو ایک آنکھ نہ بھایا زہرے لکچ میں چھکارا۔

میں ہوں نا اس گھر کی واحد ڈائن، میرا ہی منوں سایہ ہے اس بے چارے سے بچے پہ، آؤ میرا کام تمام کرو۔ مارڈالو مجھے۔ فہد کو میرے آسپ سے چھٹکارا دلا دو۔“

”آپ... شرمن، یہ آپ کیا کہہ...“ وہ بھونکی رہ گئی۔ خود مجھے اور ای کو بھی توقع نہیں تھی کہ وہ سارے لحاظ بالائے طاق رھتی ہوئی گھر آئی

مہمان کا تاجا بچہ کر کے پتر آئے گی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، جس طرح تم میری اولاد کو میرے ہی خلاف بھڑکا رہی ہو اس سے تمہارے بارے میں اور کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ ڈینا کو دھڑکے رکھ دے۔

”میں چلتی ہوں۔“ زینیا ابھی بیٹھی تھی کہ چل پڑی۔ منظر سے غائب ہونے کے سوا اور کوئی چارہ بھی اس کے پاس نہ تھا میں نے آگے بڑھ کے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”ایک منٹ زینیا! تم جاسکتی ہو مگر ایسے نہیں۔ پہلے شرمن تم سے معافی مانگے گی۔ شرمن تم نے زینیا کی جو انسلف کی ہے اس کازالہ تمہارے دو لفظوں سے نہیں ہو سکتا مگر تم

یہ بھی کہہ دو تین مہینے معاف کر دوں گا۔“

ای میرے کہنے پہ چپ ہی رہیں۔ جس کا مطلب تھا زینیا سے ہونے والی بدسلوکی اور شرمن کی بدتمیزی انہیں بھی گراں گزری ہے۔ مجھے اور شرمن۔

”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا۔“ وہ یوں کھڑی تھی جیسے میرا یہ حکم اس کی توقع سے باہر ہو۔ اچانک وہ دھاڑی۔

”معافی... اور میں... اور وہ بھی اس سے۔“

”رہنے دو، عاشر! کوئی بات نہیں۔“ زینیا نے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے اسے بولنے سے باز رہنے کا اشارہ دیا۔

”زینیا تم میری مہمان ہو۔ تمہاری انسلف میری انسلف ہے۔“

”اور میں... میں تمہاری کچھ نہیں لگتی۔“ میرے مقابلے میں تم ایک معمولی سی درکر کو ابھیت دے رہے ہو۔“ شرمن نے میری بات سنتے ہی ذہنی کیفیت طاری ہو گئی۔

”وہ معمولی نہیں ہے، معمولی تم ہو، تمہاری ذہنیت ہے اور تمہاری خصلت ہے۔ اپنا

مقابلہ اس سے کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تم... تم عاشر...! مجھے ہمیشہ ذلیل کراتے ہو۔ تمہارے ہوتے میں کبھی خوش رہ ہی نہیں سکتی۔ اللہ کرے یا تم مر جاؤ، یا میں مر جاؤں۔“ اپنے بال نوچتی وہ جاہل عورتوں کی طرح بد دعاؤں پتر آئی۔ اب تک خاموش کھڑی ای نے اسے تنبیہ کی۔

”بند کرو یہ تمنا شرمن! تم میرے سامنے میرے بیٹے کو کوس رہی ہو۔“

”تمہارا بیٹا، تمہارا بیٹا۔“ وہ بدتمیزی کی انتہا پہ اتر آئی اور اچانک فہد پہ لگی۔ ”یہ تو میرا بیٹا ہے۔“ میرا اپنا بیٹا۔ میرا جودل چاہے گا کروں گی۔ کوئی روک سکتا ہے تو روک لے۔“

اس نے اچانک فہد کو بے تحاشا بیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ حیرت کی شدت سے چیخا تک بھول گیا اور کسی بے جاں گڈے کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کے جنونی ہاتھوں کی گرفت میں مار کھاتا رہا۔ زینیا کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ میں اور ای فوراً

”اسے پھرانے کے لیے چلے جائے۔“ مشکل اس کے ہاتھوں سے فہد کو پھرانے میں کامیاب ہوئے۔ شرمن سر پٹ بھٹکی اسے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ لاک ہو گیا۔ زینیا

میرے پکارنے پہ ہی فہد کو برسی آنکھوں سے دھکیلتی اٹنے قدموں واپس لوٹ گئی۔

رات کو ساری روانداد باقر بھائی جان تک پہنچی۔ کچھ امی کے بتانے پر کہ شرمن نے نہ صرف مہمان کی عزت کی بلکہ ان کے ساتھ بھی تو بھار ہوئی، ان کے بیٹے کو منہ بھر کے بدعامیہ دیں۔ اور کچھ فہد کی حالت دیکھ کے وہ سخت مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے

شرمن سے باز پرس کرنا نکتہ نہ ضروری جاننا اور اس پہ اتھار اٹھالیا۔ یہ آخری قدم تھا جو ان کے ساتھ تعلقات کو تباہی لے، ہانے تک لے آیا۔ شرمن اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ فہد کو

بھائی جان نے لے جانے نہیں دیا۔

ایک روز زینیا کو یہ سارا قصہ سنایا تو وہ سخت نام ہو گئی۔

”یہ سب نیکی ہے۔“ وہ اب عاشر۔ نہیں وہاں آئی، نہ یہ سب بد مزگی پیدا ہوئی۔“ وہ تاف سے باہر مل رہی تھی۔

”تم ان زینیا یا یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ شرمن اور بھائی جان آخر اور کتنا عرصہ اس تعلق کو بحال کیے بغیر تو اس کا خاتمہ ہونا ہی تھا۔ تم خواہ مخواہ کٹنی قتل مت کرو۔ اس پاگل عورت کو بھانا چاہیے تھا تمنا کشا کرنے کا۔“

”کوئی ایسے ہی پاگل نہیں ہوتا عاشر کوئی توجہ ہوگی۔“

”وجہ اس کا حسد تھا اور تسلط پسند رویہ وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ فہد اس کا اپنا بیٹا

کامیاب نہ ہو سکیں۔

”عجیب بہت دھرم اور سخت دل عورت ہے۔ مہینہ ہو چلا ہے گھر سے نکلے۔ پلٹ کے شوہر اور بچے کی خبر نہیں لی۔ چلو میاں سے تو بارہنگی ہے، بچے سے کیا لڑائی۔ کیا بچے کی یاد بے چین نہ کرتی ہوگی اس کی عقل کو وہ تو سارے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔ چلو نہ جھکے، ہم ہی جھک جاتے ہیں۔ ایک بار فون پہ آئے تو سہی، ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لوں گی، بہو رانی سے ٹھیک ہی ہے۔ غیروں کے لیے اسے گھر میں کیوں فساد پیدا ہو۔ اگر اسے نہیں پسند تو میں منع کر دوں گی۔ زینیا کو فہد سے ملنے کے لیے، اگر چاہے تو باقر کے کان بھی اس کے سامنے پہنچ لوں گی۔ مگر بی بی بات تو کرے۔“ وہ مسلسل بڑبڑاتی رہیں۔ میں چپ چاپ سنتا رہتا۔ میری چپ تب بھی نہ ٹوٹی۔ چپ باقر بھائی جان کو شرمین کی جانب سے چلنے کا نوٹس ملا۔ اس انتہائی قدم کی امید کسی کو نہ تھی۔

طلاق کے بارے میں شاید باقر بھائی جان نے بھی نہ سوچا ہو۔ یا شاید وہ سوچ چکے ہوں لیکن بیوی کی طرف سے ملنے والا نوٹس ان کی مردانہ انا پہ کاری ضرب کا باعث بنا۔ تذلیل کے احساس سے وہ پھرے ہوئے تھے۔ ای جان نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کر کے ماموں کے گھر فون کیا۔ وہ الگ پریشان تھے۔

”کیا کروں آیا آپاں خود سمجھ نہیں پا رہا۔ اس نے پچھلے ہفتے پہلی بار مجھ سے ذکر کیا میں نے تو ظاہر پہ فوراً انکار کر دیا۔ ڈانٹا ڈپٹا، سمجھا بھی کہ طلاق یافتہ عورت کا معاشرے میں کیا مقام ہے۔ لیکن وہ مجھے سے اکڑ گئی۔ کچھ سننے پہ تیار ہی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ اس نے خود کشی کی دھمکی دے دی کہ اگر باقر سے اس کی طلاق نہ کروائی گئی تو وہ زہر لٹالے گی۔“

”اور تم دار کہنے۔“ اسی نے شرم دلائی۔

”جانتے بھی ہو کہ دس قدر جذباتی اور غصیلی لڑکی ہے، لیکن کم ہمت بھی۔ مرنے کی باتیں اس میں ہیں، تم اس کی خالی فون کی محکموں میں آکے اس کی زندگی برباد کر رہے ہو۔“

”وہ اب کم ہمت نہیں رہی آبا۔ آپ نے محسوس ہی نہیں کیا وہ کتنی بدل چکی ہے۔ فونی وہ وہل بنے۔ لیکن میں تو اسے جھوٹی تسلی سے ٹال رہا تھا۔ لیکن اس نے چپ چاپ اپنے طور پر نوٹس بھجوا دیا۔ اب آپ ہی بتا دیجئے کہ اس میں اتنی ہمت آئی ہے تو اس نے اپنے بل بوتے پہ یہ قدم اٹھالیا۔“

”یہ تم بھی تم نے ہی دی ہے قاسم! اس کی ہر جا بے جا ضد پوری کی۔ اس کی ہر

ہوتے ہوئے تمہارے زیادہ قریب ہو جائے۔“

”تمہارا تجزیہ کسی حد تک درست ہے لیکن میں اسے فہد والے معاملے پہ لاگو نہیں کر سکتی۔ فہد کے بارے میں وہ لاکھ بچتی ہو لیکن ایک ماں کے اندر اتنا یقین ہوتا ہے کہ اس کی اولاد صرف اس کی اپنی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ جڈ پہ رقت تو تھا، لیکن اس کی جڑیں کہیں اور گڑی ہوئی ہیں۔ سو بچی نظروں سے وہ جتنے جتنے ہوئے کہنے لگی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ میں چونکا۔

”تم نے ایک بار کہا تھا کہ شرمین کسی سے محبت نہیں کرتی۔ بلکہ کسی سے کیا وہ اپنے آپ سے محبت بھی نہیں کرتی۔ اسے خود سے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں عاشر! کل میں نے جانا ہے کہ تمہارا تجزیہ کتنا درست تھا اور کتنا غلط تھا۔“

اس نے کہیں اچھٹے ٹکے کا پتلا چہرہ دونوں شہادت کی انگلیوں کے سرے پہ نکاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھوں میں اپنی کھوج بھری آنکھیں گاڑ دیں۔

”تم صاف صاف بات کر دے پلینز۔“

”اسے کسی سے محبت ہے عاشر۔“ اس نے ”ہے“ پہ زور دے کر کہا۔

”اتنی کہ اس نے خود سے بھی محبت کرنا چھوڑ دی۔ اس محبت نے اسے اس بڑی طرح مجروح کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی تک سے بیزار ہو گئی ہے۔ اس محبت کو نہ تو اظہار کا راستہ ملانے پڑیائی کا۔ لانا دکھار اور نفرت نصیب ہوئی۔ بدلے میں اس نے بھی اپنی محبت کو نفرت کا پہنا دے دیا۔ لیکن عاشر اندر سے یہ محبت جہنم جیلا سے جھوٹی رہی۔ کل اس کی اس محبت نے حسد اور رقابت کی آگ میں جل کے نفرت اور کینے کے احساس سے مسلک کیے اپنی ہی زندگی کو ڈس لیا۔ یہ آخری ظلم تھا۔ جو اس محبت نے اس لڑکی پہ ڈھالیا۔“

”کیسی محبت۔۔۔“

”وہ محبت..... عاشر..... جو شرمین کو تم سے تھی اور ہے۔“ اس نے دھماکا کیا۔

☆☆☆

اس بار شرمین اس کی گئی تھی۔ فہد گھر پہ ہی تھا اس لیے ابھی تک بھائی جان اس کے پیچھے سسرال تک نہیں گئے تھے۔ کچھ بات کی شرمین گئی یا خوف بھی تھا کہ ماموں جان کا سامنا کیسے کریں گے۔ اس سے پہلے بھی ان دونوں کے درمیان کئی جھگڑے ہوئے مگر نوبت مار کٹائی تک نہیں پہنچی تھی۔ ای جان سے تو وہ کئی بار ڈانٹنے کے لیے جانے پہ تیار نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کے کہنے کے مطابق اپنے سسرال بیوی کو مٹانے کے لیے جانے پہ تیار نہ ہوئے۔ ای جان نے دو تین بار بھائی کے گھر فون کیا لیکن شرمین سے بات کرنے میں

بے وقوفی میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے گھر بسانے کی تعلیم دی ہوتی تو اب اس کے کام آتی، وہ تنہا رہے کہیں بھی نہ ہوتی۔“

ای نے ان کی تربیت کو الزام دیا تو اب تک تحمل سے بات کرتے ماموں جان بھڑک گئے۔

”بس کیجئے آپا! زندگی میری بچی کی برباد ہو رہی ہے اور باتیں مجھے سننا پڑ رہی ہیں۔ یہ تو میری شرافت ہے جو کل سے معاملہ سنہانے کی کوشش کر رہا ہوں، ورنہ پہلے تو باقر سے باز پرس کرتا کہ آخر اس نے ایسا کیا کیا کہ میری بچی اس حد تک خود سے اور زندگی سے بیزار ہو گئی۔

اور اگر وہ میرے کہنے میں نہ ہوتی تو باقر سے شادی ہی کیوں کرتی۔ اس نے کتنی بار کہنا چاہا کہ اس کی اور باقر کی عمریں بہت فرق ہے، لیکن میں نے سختی سے یہ اعتراض رو کر دیا کہ عمر کا یہ فرق تب میرے نزدیک متعی نہیں رکھتا تھا۔

پھر ساری عمر بیٹی سے شرمندہ ہی رہا۔ بار بار اس کے میکے آنے کے بعد اس کے سوالوں کے جواب دینا پڑے۔ ڈیڑی آپ تو کہتے تھے.....

آپا! اب میرے بس میں نہیں رہی۔ باقر سے کہیں وہ اگر یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے تو اپنے طور پر کوشش کرے۔ شاید معاملہ دب جائے۔“

بڑی مشکل سے ای جان نے باقر بھائی جان کو پیش واسطے دے کر فون کرنے پر آمادہ کیا۔ ادھر ماموں بھی بمشکل شرمین کو فون تک لاسکے۔ طوعاً کرہاً بھائی جان نے اپنے طرز عمل کی معافی مانگی، آئندہ ایسا کچھ نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرانی۔ وہ بڑے تسخّر سے ہنسی۔ بھائی جان نے فون کے اسپیکر آن کر کئے تھے تاکہ امی کو اندازہ ہو سکے انہوں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

”آئندہ ایسا ہوگا بھی کیسے۔ بس تمہارا اور میرا ساتھ یہیں تک تھا، مسٹر باقر.....!“

”شرمین! ابھی ہمارے سامنے زندگی بڑی ہے۔“

”ہاں وہ تو ہے، بلکہ میری زندگی تو شروع ہی اب ہوگی۔ تمہارا نام اپنے نام کے آگے سے کھرپے کے بعد، میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔“

”میں نے تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔“

”تمہیں کیا پتا میری خوش کیا ہے؟“

”تم نے بھی بتانے کی ضرورت بھی تو محسوس نہیں کی۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کتنے سال پھر سے سر پھوڑتا۔ میں نے تمہیں بے تحاشا محبت دی، مان دیا تمہاری ہر

بات چاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو برداشت کی، لیکن تمہاری سرد مہری ختم نہ کر سکا۔“ جھٹک کر میری محبت بھی بار مان گئی۔ لیکن اگر تم ساتھ دو تو وہ دن پھر لوٹ سکتے ہیں۔ میں سب بھول جاؤں گا۔ کھلم کھلا پہلے کی طرح مجھ سے اکھڑی اکھڑی رہو۔ میں پھر بھی تمہیں.....“

”مجھے نہیں چاہیے تمہاری یک طرفہ فقیّرانہ محبت۔“ بھائی جان کی اس درجہ مفاہمت پر بھی اس کا لہجہ نرم پڑا نہ دل۔

”نہیں چاہیے ایسی زندگی جس میں... میں خود.... کسی کو پیار کرنے کے لیے ترستی رہوں۔ مجھے صرف تمہاری محبت نہیں چاہیے، میں جب خود تم سے محبت نہیں کر سکتی تو تمہارے ساتھ کیسے رہوں کس طرح؟“

”تم.....“ غصے کی زیادتی سے وہ کچھ بول نہ سکے۔ یہ سب سے بڑا حملہ تھا، جو ایک عورت نے ایک مرد کے پندار پر کیا تھا۔

”تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں، میں خود تم پر قہو کننا تک پسند نہیں کرتا۔ یہ میری ماں کی خواہش بھی اور میرے بچے کی زندگی کا سوال۔ اس لیے تمہیں فون کر لیا۔ تمہیں عزت داس نہیں آئی تو ٹھیک ہے۔ تمہیں طلاق نامہ مل جائے گا، مگر صرف.... طلاق نامہ، فہد کا خیال تک دل میں مت لاتا۔

وہ صرف میرا بیٹا ہے، صرف میرا..... خردار جو اس کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ میں اسے مار ڈالوں گا، مگر اپنا خون ایسی عورت کے حوالے نہیں کروں گا جو مجھے نفرت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔“

ان کا خیال تھا شاید یہ دھمکی شرمین کو لرزے کے رکھ دے گی۔

وہ روئے گی، گونگڑا گئے گی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا، چند سیکنڈ وہ چپ رہی پھر اس کی آواز آئی۔

”مجھے منظور ہے، بلکہ میں لکھ کے دینے پہ تیار ہوں کہ میں غلیڈگی کے بعد فہد کا مطالبہ ہرگز نہیں کروں گی۔ میرا وکیل یہ کاغذات تیار کروا کے ثبوت کے طور پر تمہیں بھیجوا دے گا۔ سندر کھانا۔“

”تم اور تمہارا وکیل.....!“ بھائی جان طیش کے مارے گا لیاں سکے گئے۔ ای نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کھنا چاہا، تاکہ شرمین کے کسی اور اشتعال انگیز فقرے سے کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائیں۔ لیکن وہ ایک ہاتھ سے انہیں پرے کرتے بولتے رہے۔

”سنہیال کے رکھواپنے وکیل کو اور اپنے کاغذات کو میں لعنت بھیجتا ہوں عدالتوں پر تم میری طرف سے ابھی اسی وقت فارغ ہو۔ لو سنہیال اس آخری تھکے کو۔ تم اسی کے لائق نہیں، تمہیں زورمندی میں بھی بیٹھ ملنا چاہیے تھا۔ طلاق طلاق“ ایک طوفان آگے گزر گیا۔

ای کی دن فہد کو گود میں لیے آنسو بھائی رہیں۔ باقر بھائی جان نے خود کو لا پروا ظاہر کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں میں حیرت انگیز طور پر پرسکون تھا۔ یہ ہونا ہی تھا بلکہ یہی ہونا چاہیے تھا اس گھر کے لیے۔ ہم سب کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ شرین کا ہم سب سے دور جانا۔

زینیا کو بھی اس واقعے کا بے حد افسوس ہوا۔ اس نے مجھ سے اس بارے میں بات کرنا چاہی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ ”میرا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں، تم اب کیا جانتا چاہتی ہو۔ یہ باپ ختم ہوا۔ اگر تمہیں اس پر اتنا ہی افسوس ہے تو جاؤ جا کے اسی اور بھائی جان سے اظہار افسوس کر آؤ۔ بلکہ.....!“

لیکن اس مرے ہوئے رشتے کا پوسٹ مارٹم مت کرنے بیٹھ جانا۔ سوائے تعفن کے اور کچھ نہ ملے گا۔“ میں اس بے زاری سے بولا کہ وہ کتنی دیر شاکی نظروں سے مجھے بگھتی رہی۔

”تم کس قدر بے حس ہو۔“

”تمہیں آج پتا چلا ہے۔“ میں ہنسا۔ ”میں تو ہمیشہ بے حس ہوں۔“

”میں نے کہا تم بے حس“ ”جتنے ہو۔“ اس نے جتنے ہو پوچھ کر دے کہا۔

”اور اگر میں یہ کیوں کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس“ ”جتنی ہو۔“

میں نے جڑ کے جوانی کا ردوائی کی۔ بے کسی میرا پسندیدہ وصف تھا۔ مجھے اس پر اچھا خاصا فوج تھا اور وہ مجھے اس سے محروم ظاہر کر رہی تھی۔ بھلا بے کسی سے بڑھ کے نفرت اور کون سی ہوگی۔ زمانے بھر کا احساس پالے رکھنا تو زری درد سہی ہے۔

”کہہ لو، تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں جو ہوں۔ سو ہوں۔“

اس نے پورے اہتمام سے کہنا۔ وہ جوتی۔ واقعی بس وہ جوتی کوئی اور اس جیسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن میں اس سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں تو کھل کے خود سے بھی یہ اقرار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ مجھے اپنے دل کا اس کے آگے متاثر ہو جانے والا وہ دنیا نہ انداز ذرا پسند نہ آیا۔

کیا قیامت ہے کہ دل جس کا نگر ہے محسن

دل پہ اس کا بھی اجارہ دیکھا نہیں جاتا

زینیا کا گھر یہ آنا اور تسلسل سے بڑھ گیا۔ وہ اسی جان کی دلجوئی کرنے اور فہد کو سنہیالے کا فریضہ خوش دلی سے ادا کرے لگی۔ وہ دونوں اس کے عادی بننے جا رہے تھے اور میں زینیا کو ان دونوں کا خصوصاً ”فہد کا عادی بننا“ دیکھ کے مطمئن ہو رہا تھا، بس اب منزل کچھ ہی دور تھی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب زینیا ایک عام سی لڑکی بن کے میرے آگے اپنی بار بار جاتی اپنی خاموش محبت کو زبان دینے پہ مجبور ہو جاتی۔ مگر وہ دن ابھی نہیں رہا تھا۔ اس کی بچی آنکھوں والی پرس بھی مسکراہٹ اب میرے سامنے اور بھی رشیم سی ہو جاتی۔ میری پتیلیاں اس مسکراہٹ کی لطیف سی گرفت میں جک جاتیں اور مجھے یقین ہونے لگتا۔ عاشر ملک، زینیا عمر تمہیں چاہتی ہے۔ ٹوٹ کے چاہتی ہے، اسے چاہنے دو۔ چاہتے رہنے پہ مجبور کرے جاؤ۔ یہاں تک وہ خود ٹوٹ جائے۔ پھر اس ٹوٹی ہوئی عام سی دنیا بھر کو میں اپنے ہاتھوں سے جوڑ کے اسے گھر میں سجادوں گا۔ عاشر ملک کا حوالہ دے رہے وہ پھر سے عام سے خاص بن جائے گی، لیکن وہ ٹوٹ ہی نہ پاری تھی۔ میں نے لاکھ کوششیں کیں۔

دلیفائن ڈے بہ سرخ گلابوں کا بوکے اس کی ٹیبل پر رکھ کے میں خاموشی سے اپنی ٹیبل پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وال سے اس کے کہیں کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آئی، ٹھٹک کے بوکے کو دیکھنے لگی۔ چلیں جھک گئیں۔ دو تین بار سر بالکل ویسے ہی ہلایا۔ جیسے اپنی مسکراہٹ کی لطافت سے خود ہی منظور ہو رہی ہو اس کے ہاتھوں میں بوکے تھا۔ جب وہ اٹھکی ہی لمحے میرے کہیں میں موجود تھی۔

”یہ میری ٹیبل پر کیا کر رہا ہے۔؟“ حالانکہ میں نے اپنا نام نہیں لکھا تھا، لیکن وہ براہ راست مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

”سب کی ٹیبل پر کوئی نہ کوئی پھول، کوئی نہ کوئی گلاب پڑا تھا تمہاری خالی تھی، میں نے سوچا کہ تم دلیفائن ڈے کا حرا کیوں نہ لو۔“

”بڑی عینایت آپ کی۔ لیکن مجھے یہ مغربی روایات نہ پسند ہیں، نہ میں انہیں مانتی ہوں۔ خیر ٹیبل تو آپ کی چھی خالی ہے۔“ اس نے بوکے میری ہی ٹیبل کے ایک طرف رکھ دیا میں ہنسنے لگا۔

”تم ان سرخ گلابوں کے قائل ہی کہاں، تمہیں تو وہ منوں پیلے گلاب پسند ہیں اچھا ہوتا میں سرسوں کا پورا اکھاڑا لاتا تمہارے لیے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”لانا کیا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی پھول دو موقوفوں پہ اچھے لگتے ہیں، شادی پہ یا میت پہ.....“

”اچھا تو جب تم مرو گی ناں، تو جلیز مجھے ضرور بتانا، میں یہ پھول لے کر سب سے پہلے پہنچوں گا۔“

میں اس کی بے نیازی پہ چڑتا جا رہا تھا۔ کتنی مشکل سے میں نے خود کو اس پیش رفت پہ آمادہ کیا تھا کہ شاید ان گلابوں کی مہک سے مسور ہو کے اگلا قدم وہ اٹھالے لیکن وہ اٹانہ مذاق اڑانے جا رہی تھی۔

”تم نے شاید غور سے سنا نہیں، میں نے کہا، شادی پہ یا میت پہ تم دوسری جانب کیوں زور دے رہے ہو۔ میری شادی پہ کیا خالی ہاتھ آؤ گے۔“

بیچہ ویسے گھماتے ہوئے، بھیڑی بیک سے ٹیک لگائے وہ عجیب کریدتے انداز سے پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت کے ساتھ کچھ گھموا لینے کی خواہش بھی چمک رہی تھی۔ مجھ پر اچانک انکشاف سا ہوا کہ میری طرح وہ بھی میری جانب سے پہلے کے انتظار میں ہے۔ میں نے اپنے قلعے کے دروازے اُتر مضبوطی سے بند کر دیے۔

”خالی ہاتھ کیوں؟، آخر دوست ہوں تمہارا۔ پورا پھولوں کا خرک بھجوا دوں گا۔“

میں نے دوست پہ زور دے کے کہا۔ وہ جھٹکنا نہیں جانتی تو کیا عاشر ملک کوئی کمزور چیز ہے۔ جو گھٹنے ٹیک دے، مجھے توقع تھی۔ وہ بڑی آس سے پوچھ گئی۔ صرف

دوست..... لیکن اس نے فوراً ”ہاتھ آگے کیا۔“

”تو پھر وعدہ کرو، ہر کم از کم ایسا ہی ایک بوکے ضرور بھیجوں..... نہیں بلکہ لے کر آؤ گے۔“

میں نے ایک نظر اپنے آگے پھیلی اس گلابی ہتھیلی کو دیکھا۔ دل چربے ایمان سا ہو کے کہنے لگا کہ اس بوکے سے ایک گلاب توڑ کے اس ہتھیلی پہ بجا دوں، لیکن میں نے ان سنی کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

”وعدہ.....“

☆☆☆

”میں نے سرنج گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“

میں نے اپنی سیٹ پہ بیٹھ بیٹھ اپنے کونٹ کی اندرونی جب میں رکھے اس ہلکے گلابی کاغذ پہ انگلیاں پھیریں۔ وہ دس الفاظ پہ مشتمل فقرہ..... اور وہ تھا ایک فقرے سے سجا بہم سا خط..... یہ خط ہی باعث تھا، مجھے خوشخبریاں کی اس دلدار سے کھینچ لانے

کا۔

بہت دنوں بعد

تیرے خط کے اداس لفظوں نے

تیری جاہت کے ذائقوں کی تمام خوشبو

میری رگوں میں اندر ٹیل دی ہے

بہت دنوں بعد

تیری باتیں

تیری ملاقات کی دھبک سے دھکیں راتیں

اجاڑ آنکھوں کے پیاس پاتال کی تہوں میں

وصال وعدوں کی چاند چنگاریوں کو سانسوں کی آ آج دے کر

تیرے مہینے مہین لفظوں کی آ بشاریں

بہت دنوں بعد پھر سے

مجھ کو رلا گئی ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میرے اندر کی راکھ کے ڈھیر پہ ابھی تک

تیرے زمانے لکھے ہوئے ہیں

بہت دنوں بعد میں نے سوچا تو یاد آیا

کہ میں بھی کتاب بدل گیا ہوں

پتھر کے تھمے سے

کئی ٹکڑوں میں ڈھل گیا ہوں

میں اپنے سگریٹ کے بے ارادہ دھوئیں کی صورت

ہوا میں تحلیل ہو گیا ہوں

نڈھونڈ میری وفا کے نقش قدم کے ریزے

کہ میں تو تیری تلاش کے بے کنار صحرائیں

نجانے کس راہ میں کھو گیا ہوں

میں واقعی کھو گیا تھا، نجانے اس نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا۔ میں تو خود اپنی تلاش میں تھا۔ اس نے نہ صرف مجھے کھو نکالا بلکہ مجھے جھ سے ملوا بھی دیا اور میں عرصے بعد خود کو دیکھ کے حیران تھا پریشان تھا اور پریشان تھا..... یہ میں ہوں۔ عاشر ملک۔ کیا میں زندہ

ہوں، کیا میں زندہ تھا اگر تھا تو کہاں رہا.....

☆☆☆

”سوری راگ نمبر۔“

صبح سے پانچواں فون تھا جس پہ دوسری طرف سے آتی آواز کو سننے ہی میں راگ نمبر کہہ کے فون رکھ دیتا تھا۔ موبائل پہ الگ شور مچا ہوا تھا، آف تو کر کے نہیں رکھ سکتا تھا۔ البتہ نمبر بڑھ کے آن کرنے کی ہمت کوارا نہیں کی۔

آفس کے فون سینک کارڈ سیور تار کر کے رکھ نہیں سکتا تھا، کبھی ضروری فون آتے تھے۔ سارا دن یہی تماشا ہوتا رہا۔ آفس سے نکلے ہی میں نے اپنے موبائل سینک کو آف کیا۔ گھر پہنچنے ہی اسی کو جتنی سے تاکید کی، کسی کا بھی فون آئے مجھے ہرگز ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اپنے کمرے کے سینک سے میں نے پلگ کھینچ کے الگ کیا اور سکون سے بیڈ پہ لیٹ پکے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ای جی جان سے بات کرنے کا اب درست موقع آچکا تھا، اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو، ان سے بات کر لینی چاہیے۔ یہ بات کتنی ضروری تھی۔ میں جانتا تھا لیکن میں کروں گا کیسے، یہ نہ جانتا تھا، آخر کیسے.... کیسے میں اسی سے کہتا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ عاشق ملک کو کسی کی ضرورت ہے.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

”تو پھر کیا کہوں۔“ میں سوچتا۔ ”تو کہہ سکتا ہوں کہ اس گھر کو، آپ کو ہند کو زینیا کی ضرورت ہے، ہاں یہ ٹھیک ہے، دل کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور ای اور بھائی پہ احسان الگ کہ ان کی خاطر ایک عام لڑکی کو اپنا بے رحم مجبور ہو گیا۔“

اس نکتے پہ دل اور دماغ دونوں متفق ہو گئے۔ دل کی مراد بھی پوری ہو رہی تھی، بغیر جھگڑے آسانی سے سن پسند چیز حاصل ہو رہی تھی اور دماغ کے خو غرض تھا نے بھی پورے ہو جاتے، ایک اور احسان میرے کریڈٹ پہ آ جاتا، میں نے اگلے روز کا انتظار شروع کر دیا۔

اگلے روز ایک الگ تماشا میرا منتظر تھا۔ آفس جاتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران مسلسل موبائل کی بیپ اور اس پہ لکھا نمبر مجھے ڈسٹرب کرتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ اگلے ایک دو روز تک ایسا ہی ہونے والا ہے۔ میرا انور کرتے رہتا ہی اس مسئلے کا واحد حل تھا۔ آخر کوئی تک تک بند دروازوں سے سر بھجور سکتا ہے۔ بند دروازے کے اس طرف میں بڑے سکون سے بیٹھا یہ سوچتا رہا، یہ خیال تک نہ آیا، کہ دروازے توڑے بھی جاسکتے ہیں۔ اور دروازہ ٹوٹ ہی گیا۔

میں زینیا سے ہاشی گردپ کا پراجیکٹ ڈسکس کر رہا تھا۔ جس کی پریزنٹیشن کے لیے ہم دونوں کوئی کھل جانا تھا کہ میری سکرپٹری ٹیلم نے انٹرکام پہ مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی۔ ایک تاجیے کو تو میں شیٹا کے رہ گیا۔ مجھے تو یقین نہیں تھی کہ اس کی ہمت اتنی بڑھ جائے گی۔ میں نے فی الحال پس منظر میں رہنے کا جتنی سے حکم دیا تھا۔ تیرا اگر اسے اس معاملے کو اتنی جلدی مٹانا ہے تو ٹھیک ہے، مجھے بھی ٹینشن مول لینے کا شوق نہیں۔ اچھا ہے جتنی جلدی یہ قصہ تمام ہو، لیکن اس طرح.... زینیا کے سامنے سب کے سامنے اس بات کا کھانا میرے لیے دوسرا نہیں تھا۔

”کہہ دو، میں میننگ میں ہوں اور یہ بھی کہ یہ میرا آفس ہے، یہاں میں پرسنل میگزین کی ڈسکشن افورڈ نہیں کر سکتا۔“

میں نے سختی سے کہا۔ زینیا لیٹنا بھر کے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی اس نے انٹرکام پہ ٹیلم کے ذریعے سن لیا تھا کہ مجھ سے ملنے کون آیا ہے۔ اور میں کس سے ملنے سے کتر رہا ہوں، اس کے خاموش سوال کا جواب میں نے ٹال منوں سے دینا چاہا۔

”پاگل ہے، وہی فضول کے رونے، پہلے غصے میں اتنا بڑا اور ٹینک فیصلہ کر لیا، اب بچے کے لیے تڑپتی پھر رہی ہے۔“

اور دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا۔ شرین چیج تڑپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے اسے رونے کی کوشش کرتی ہوئی ٹیلم بھی میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ زینیا بھی پیچھے مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ زینیا کو کد کد کے وہیں رک گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ پرسنل، بے ترتیب لباس، بکھرے بال اسے اور دشت زندہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں دیوانگی ناچ رہی تھی۔ اب خنک تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پہلی بار میں خوفزدہ ہوا۔

میں نے ڈر سے ڈرے انداز سے زینیا کو دیکھا۔ شرین کے تیر میرا بنانا پھیل رہا بد کر سکتے تھے۔

”تو..... یہاں بھی موجود ہے، تب ہی.... تب ہی تم مجھ سے ملنے سے کتر رہے ہو.....“ وہ باری باری ہم دونوں کو کد کد کے کہنے لگی۔ میں نے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”یہ آفس ہے شرین! یہاں زینیا نہیں ہوگی تو کیا تم ہوگی۔ اور میں تم سے اس لیے.... میرا مطلب ہے فی الحال اس لیے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ میں ایک ضروری میننگ کر رہا تھا، پرسنل بائیں کہیں اور بھی، کسی اور بھی وقت ہو سکتی ہیں۔“

بظاہر ٹھنڈے لہجے میں لیکن شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے آخری الفاظ پر زور دے کر اسے کچھ یاد رکھایا۔

”اوکے عاشر! میرا خیال ہے آج کی میٹنگ کا نام تو ختم ہو گیا ہے، ہل میٹنگ میں ملاقات ہوگی ہاشی چیبرز میں۔“

زینیا اپنا یک اور فائلز اٹھاتی باہر نکل گئی۔ میرے سر سے ایک خطرہ تو تلا۔ اب میں باآسانی شرٹیں سے نمٹ سکتا تھا۔ آگے بڑھ کے اس کے بازو کو اپنی آگنی گرفت سے دبوچتے ہوئے میں نے خود غور لہجے میں کہا۔

”تم رہے کہا تھا کہ چپ چاپ بیٹھی رہنا، ذرا حالات قابو میں آجائیں تو میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“

”تمہیں حالات کی فکر ہے، میرا دل قابو میں نہیں آ رہا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام لیا اور ہلکے آٹھی۔

”اپنے دل اور جذبات پہ قابو پانا سیکھو۔“ میں نے جھکے سے اپنی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑائی۔

”یہ تم اب مجھے کہہ رہے ہو۔ میں نے تو کتنا عرصہ بند باندھ کر رکھا تھا۔ تم نے ہی مجھے بے قابو کیا اور اب جب میں خود کو بھی سنبھالنے سے قاصر ہوں تو تم مجھے سنبھالنے کا

مشورہ دے رہے ہو۔ مجھ سے کتنا رہے ہو۔ دونوں سے تم میں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں ہوں لیکن تم ہر طرح انگوڑ کر رہے ہو۔“

”تم کیوں نہیں سمجھتیں ابھی ہمارا ملنا مناسب نہیں ہے، اگر کسی کو شک ہو گیا تو.....“

”ہوتا رہے شک، اب چھپا کر کیا کرنا ہے۔ ہم ساری دنیا سے کٹ کے تو نہیں رہ سکتے۔ تم اب مجھے کیوں دینا سے ڈرا رہے ہو، تب تو تم نے ہی میرے سارے ڈر ختم کیے

تھے مجھے بے خوف کیا تھا یہ کہہ کر کہیں کسی کی پروا نہیں، کوئی کچھ بھی کہتا رہے، تم مجھے اپنا کے رہو گے۔ تمہاری یقین دہانی یہ میں نے باقر سے.....“

”پہلے کی بات اور کسی۔ مجھے بھی یہ سارا کھیل بہت آسان لگا۔ لیکن تم نے جارحانہ طرز عمل اپنانے کے سارا کھیل لگا دیا۔ اب بہت پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ تم نے باقر بھائی سے

اور امی جان سے جس طرح کا رویہ اپنایا۔ اب میرے لیے تمہیں اپنا اور مشکل ہو گیا ہے۔ خیر آسان تو پہلے بھی نہیں تھا۔ صاف بات کہوں تو اب یہ صرف مشکل بلکہ نامکن۔“ وہ

بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

”نامکن کا مطلب جانتے ہو تم۔ یعنی کہ اب یہ ہو نہیں سکتا۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔“

”تمہیں تمہکے قدموں سے پیچھے ہٹی دو دیوار سے جا لگی۔ اس کی تشکیلی دیکھ کے میری شرمندگی زائل ہوئی اور میرے اندر کا کمینہ انسان پوری طرح طاقتور ہو کے اس کو اور خرمیں لگانے لگا۔

”میں سب کچھ کر سکتا ہوں شرٹیں قاسم علی! جب تک تم شرٹیں باقر ملک تمہیں، سب کچھ کرنے کا خیال، بصری خیال ہی رہتا تھا لیکن اب جب کہ تم اپنے نام کے آگے سے

میرے بھائی کا حوالہ کھوجی ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں اس نام کو اٹھورا کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ سب کچھ..... میں تمہیں اکیلا بھی

کر سکتا ہوں، اور وہ میں نے کیا۔ میں دھوکا بھی دے سکتا ہوں اور وہ میں نے دیا ہے۔ میں جھوٹ بھی بول سکتا ہوں اور وہ میں نے دے دیلے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں فریب

بھی دے سکتا ہوں اور وہ میں نے دیا ہے، میں تمہیں بے وقوف بھی بنا سکتا ہوں اور شرٹیں..... وہ تم بن چکی ہو۔“

میں مزے لے لے کر کہنے لگا وہ کرب سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تو وہ سب فریب تھا۔ جھوٹ تھا۔“

”تو کیا چاہ تھا۔ تم نے عاشر ملک کو کچھ کیا رکھا ہے۔ مجھے کیا لڑکیوں کی کمی ہے، جو میں ایک شاد شدہ بچے کی ماں، ایک بے ڈول دی بھدی عورت کے پیچھے پاگل ہو کے

سارے خاندان سے دشمنی مول لوں۔ تم میں سے ہی کیا، جس کے دماغ میں تم میرے ان جھوٹے دعوؤں پہ ایمان لائے تھے، تم نے ایک بار بھی سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ تمہارے

اندر ایسی کیا بات ہے جو عاشر ملک جیسے انسان کو متاثر کرے۔ تمہارا حسن دھندلا چکا ہے، تمہاری خصوصیتوں کی زندگی سے جا چکی ہے۔ تم ایک برتی ہوئی بلکہ تھوکی ہوئی عورت ہو۔

تعلیم، ذہانت، کردار، اخلاق، آخر کیا ہے تم میں؟ کن ہتھیاروں سے لیس ہو کے تم مجھے فتح کرنے چلی تھیں۔“

”میں تو سارے ہتھیار ڈال کے آئی تھی۔ میں تمہیں فتح کب کرنے آئی تھی، میں تو اپنا آپ تمہیں دینے آئی تھی۔“

”اور میں کیا کروں گا تمہارا؟“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”مجھے اپنے گھر سے تمہیں دور کرنا تھا اور بس، تمہیں پتا ہے نا کہ مجھے ہر چیز ”بہترین۔“ چاہیے۔ مجھے سے برداشت نہ ہوتا تھا کہ تمہارے جیسی عورت میرے گھر پہ رہے، میرے بھائی سے وابستہ رہے اور

میرے فہد کی ماں کہلائے۔“

”تم نے پلانگ سے فہد کو بھی مجھ سے دور کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس سے جدائی اپنے فہد میں لکھ لی۔“ وہ سبک پڑی۔

پھر تو تم ایسا نہ کرتیں.....“ میں نے شانے اچکائے۔ ”میں نے کچھ بھی تم سے زبردستی نہیں کروایا جتنی کہ میں نے تو اصرار نہ کیا۔ صرف چند راستے بنائے تھے۔ جن پہ چلنا یا نہ چلنا تمہاری اپنی مرضی پہ منحصر تھا۔ اتنی ہی متا کی ماری ہو تیں تو ٹھکرا دویتیں میرے مشورے کو۔“

میں نے اسے آئینہ دکھایا جو چھ تھا۔ واقعی اگر وہ خود کچھ مٹی کی طرح میرے ایک اشارے پہ ڈھل نہ جاتی تو میں کیسے کامیاب ہو پاتا، اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچاتا میں۔

”بہت بڑے کھلاڑی ہو تا تم..... ہے نا عاشر ملک۔“ اس نے اچانک اپنے آنسو پونچھے۔

”بہت ادنیٰ گیم کہلائے تم نے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ تم مجھ ”بہترین۔“ چن چاہتے ہو تو عاشر ملک بھی اپنے دل کو زیادہ نہیں تو کچھ تو بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرنا۔ لیکن میں جانتی ہوں تم ایسا کرو گے نہیں، کیونکہ تم خود میں کسی خامی کو تسلیم کر ہی نہیں سکتے تو اسے سدھارنا تو بہت دور کی بات ہے۔ تم خود کو مرد کہتے ہو، تم نے ایک عورت کو ہر طرح سے تنہا کرنے کے بعد اس کی لاعلمی میں اس پہ وار کیا ہے لعنت ہے تمہاری مردانگی پہ۔“ اس نے زمین پہ جھوکا۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

”گھٹ آؤٹ۔“ میں نے لگی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے پاجامے پن کا لحاظ نہیں کروں گا۔ دھکے مارا کر کے ساری دنیا کے سامنے تمہارا بیاؤں گا۔“

”تمہا شاداب میں بناؤں گی، اور یاد رہے میں تمہاری طرح بزدل نہیں۔ میں تمہیں وارنگ دے رہی ہوں، خود کو بچا سکتے ہو تو بچاؤ۔ ورنہ تمہاری زندگی میں کچھ بھی بہتر نہیں رہے گا۔ نہ تم..... نہ تمہاری زندگی..... دونوں بد سے بدتر ہوتی جائیں گی۔“ وہ دھمکی دیتی چلی گئی۔

میں جانتا تھا وہ اپنی طور پہ مفلوج عورت میرا کیا لگاؤ رکھتی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے تو کچھ کر نہ سکی۔ میرا کیا نقصان کرے گی۔ بلکہ میں اب پر سکون تھا، پچھلے دوروں سے اس کی فون کاٹنے جو سڑنس پھیلا رہی تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کچھ کاٹنے آسانی سے تو

نہیں نکلتے۔ انہیں کھینچ کے اکھاڑنا پڑتا ہے اور میں نے شرمین کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

☆☆☆

اس دن امی جان نے ایسی بات کی کہ میں نے بے ساختہ خود کو اپنی بروقت پلاننگ پہ جی بھر کے داد پیش کی۔ سب کچھ میرے حسب فضا ہو رہا تھا۔ جیسا میں چاہتا تھا۔

”شرمین کے جانے سے گھر کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس نے خود کو گھر کا حصہ بنایا بھی کب تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا اس طرح ہم سب سے کٹ جانا سنا ہی تو ہے۔ باقر کا گھر بڑ گیا، فہد سے ماں بچھن گئی، چاہے وہ برائے نام ہی کسی، لیکن کبھی تو ماں..... یوں ادھورا ملنا پڑا سا گھر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“

”تو آپ بھائی جان کی دوسری شادی کروادیں۔ انہیں اس طرح اکیلا تو نہیں رکھنا ساری عمر۔“ میں نے بظاہر اطمینان بتتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے لیکن ابھی اتنی جلدی نہ میں اس سے یہ بات کرنا چاہتی ہوں اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر تیار ہوگا۔ تھوڑا وقت گزرے دو۔ اگر ہم کبھی باقر کو تو میں تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔“

میں خاموش رہا۔ فی الحال میں صرف انہیں سننا چاہتا تھا۔ کچھ دیر میرے رد عمل کو کھوجنے کی کوشش کرنے کے بعد امی جان نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

”دینے تو تمہارے لیے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ لیکن عاشر اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے۔ زینیا، اس کے سوا اب کوئی سوچتی ہی نہیں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میرا خیال۔“ میں چپ رہا مگر اندر سے قہقہے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

”تمہارا کیا خیال ہے۔“ زینیا نے مجھے چونکا کے بعد میری رائے طلب کی۔

اس کا تجربہ میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں کچھ نہ نہ سکا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔

”شرمین تم سے محبت کرتی ہے؟“

ادراب مجھے حیران کر دینے کے بعد وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ ”میرا کیا خیال ہے۔“

”میرا خیال..... میرے خیال میں تو تمہارا دماغ خراب ہے، تم نے ایسا سوچا ہی کیسے۔ تم مجھے اس محبت کی توقع نہیں تھی زینیا!.....! سچ تم نے واقعی مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

سے قبول نہیں کر پائی۔

دوسری بات.....

دیکھا جائے تو بھائی جان میں کیا کی تھی، وہ خاصہ کامیاب برنس میں تھے۔ فطرتاً شریف اور بھلے ماس انسان تھے۔ شروع کے سالوں میں انہوں نے بیوی کو ٹوٹ کے چاہا بھی تھا۔ ایک خوبصورت سا بچہ بھی اس تعلق کا تھوڑا تھا، لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے دل میں شوہر کے لیے جگہ نہیں پیدا کر سکی۔ اگر مالی آسودگی، وفا دار شوہر، صحت مند بچہ، بھی اسے اس زندگی کی جانب راغب نہیں کر سکا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ اس کے دل کی کھک اسے زندگی کی طرف لوٹنے نہ دیتی تھی۔ اور یہ کھک دینے والا اس سے کبھی دور نہ ہوا تھا۔ ورنہ شاید وہ اسے بھول جاتی۔ اور اس کے پاس ہونے نے اسے سمجھوتوں کے قریب نہ ہونے دیا۔

تیسری بات.....

چونکہ میرا دل اس کے رشتے کو کبھی تسلیم نہیں کر پایا تھا، اس لیے میرے اس سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے۔ جب ریشم کے معاملے میں اس نے اسی جان سے چند طعنے باتیں کہیں تو شاید وہ بھی اس کے جذبات کی ترجمان تھیں اس سے برداشت نہ ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اسی گھر میں میری من پسند ہستی کو بسا دیکھے۔ اس کا مغرور اور تکبرانہ انداز مجھے وہ پہنچنے کرنے پر مجبور کر گیا تھا کہ میں ہر حال میں اس سے لاکھ درجے بہتر شریک حیات پسند کر کے رہوں گا۔ میرا اس کے لیے حکم کھلا اٹھارنا پسندیدگی اسے واقعی سلگا جاتا ہو گا اسی لیے یہ زینا کو وہ سلتی ہوئی، جھلتی ہوئی نظر آتی تھی۔

چوتھی بات.....

جس طرح میں نے سب کے سامنے اس کی خامیاں اور زینیا کی خوبیاں گنوائیں اسے لگا اب اس کے پاس امید کی کوئی کرن نہیں رہی۔ اس لیے وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ وہ ہار گئی۔ اپنے ہی جذبات کے ہاتھوں شکست کھاٹی تھی اس نے، اسی لیے اس کا اندر بکا بکا عیاں ہو گیا۔ وہ ایک لرزش زینیا کی کچڑ میں آ گئی۔

میں نے اس کی کچڑ کو بے ساختہ داد دی۔ رہا میرا رد عمل تو وہ زینیا کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لیے ضروری تھا۔ میں اس میں کامیاب رہا تھا وہ اپنی انتہا نے میں کبھی بات پر معذرت طلب کر لی، واپس چلی گئی تھی لیکن میرے لیے ایک دلچسپ کھیل کا آغاز کر گئی۔ زینیا نے ہی میرے اندر کے عاشق ملک کو تھپک تھپک کے سلایا تھا۔ چاہے جانے کا خواہاں عاشق اب چاہتے کا لطف ہی لینے لگا تھا۔ میری خود پسندی اب چپکے چپکے اس کو اور بھی

سراپنے لگی تھی۔ میں اپنی ذات سے نکل کے کسی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

اور وہی زینا عمر اس دن پھر سے اس عاشق ملک کو سمجھوتہ کے جگا گئی۔ وہ عاشق، جس کے لیے چاہے جانا ایک نشہ تھا، جسے دوسروں کو روندنے میں مزا آتا تھا۔ جسے خود پر حاوی ہوتے ہر انسان کو کچل دینے کی خواہش تھی۔

اس عاشق ملک نے ایک عجیب سی چال سوچی۔ اور اس پر عمل کرنے میں ایک دن کی دیر بھی نہ لگا گئی۔ میری پہلی فون کال پر شرمین مجھ سے بات کرنے پر رضامندی نہ ہوئی مگر دوسری ہی کال میں جب میں نے اس سے یہ کہا کہ میں اس سے اس کے شوہر کے بھائی کی حیثیت سے نہیں، اس دوست کی حیثیت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جس دوست کے ساتھ اس نے بچپن سے لڑکپن تک کا سفر طے کیا تھا۔ تو وہ نرم پڑ گئی۔ میں نے اسے ہمدردی کے جال میں پھنسا دیا۔ پیلے اپنے طرز سلوک کی وضاحت کی کہ اس کی وجہ ایسی ہے جس کا ذکر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میری اس بات پر چونک کے وہ یہ وجہ دریافت کرنے لگی جسے بڑی خوبصورتی سے مٹانے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔

”تم میری وجہ سے اپنی زندگی مت برباد کرو اپنے گھر لوٹ آؤ، تمہارے بچے اور شوہر کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں تو بس ایسے ہی ہواں کہ تمہارا ہوں۔ میری وجہ سے تم کیوں.....“

”تمہاری وجہ سے..... ہاں تمہاری وجہ سے.....“ وہ بڑبڑائی۔ ”صرف اک تمہاری وجہ سے۔“

”دراصل..... اب میں تم سے کیا کہوں۔ اصل میں شرمین مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں، یہ تو ساری قسمت کی بات تھی اور میں نہیں الزام دیتا رہا اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی سزا دیتا رہا اب تمہیں بھلا کیا پتا تھا کہ.....“

میں خود یہ مصنوعی قویطیت طاری کرتے ہوئے الجھے الجھے ڈائلاگ جھاڑتا رہا اور وہ ٹریپ ہوئی رہی۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو عاشق؟“ اس کے لہجے میں اب واضح ارتعاش تھا، ایک بچکانہ تھا

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری سب بدتمیزیاں، گستاخیاں بھلا کے گھر لوٹ آؤ۔ تم نے کہا تھا کہ صرف میری وجہ سے تم وہاں خوش نہیں ہو۔ تو دیکھو تمہاری خاطر میں یہ کر رہا ہوں کہ اپنا گھر، شہر، سب چھوڑ کے یہاں سے دور چار ہوں، اگر میں یہاں رہا تو پھر تمہارے لیے مشکلات کھڑی کر دوں گا۔ مجھے خود یہ بس نہیں رہتا۔ تمہارے

تے تاخیر کیوں تھی۔ میں جنہیں ہمیشہ اس گھر میں دیکھنا چاہتا تھا، مگر اس حیثیت سے نہیں جس حیثیت سے تم آج یہاں ہو بلکہ..... شرمین یہ نفرت نہیں بلکہ محبت ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میری یہ محبت تمہارے لیے سزا بن گئی ہے۔“

یہ سراسر جھوٹا اظہار محبت کرتے ہوئے نہ میری زبان لڑکھائی، نہ دل کا نپا، نہ ہی میری گھنڈی فطرت کو کوئی گزند پہنچا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ کچھ بولنے کا صرف سوچنا ہی تھا اور میرے خود ساختہ بت میں دراڑیں پڑنے لگتی تھیں۔ اس وقت اگر میں اس کے سامنے سر جھکا کر یہ کچھ ریشم کے جال بن رہا تھا تو صرف اس لیے کہ بعد میں اسی ریشم سے مجھے اس کی گردن گھونگی تھی۔

”میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، بہت دور۔“

”نہیں..... نہیں..... عاشر! ایسا مت کرو۔“ بس یہ انتہا تھی اس کے ضبط کی.... وہ چھٹ پڑی۔ میں وہ کہہ رہا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ میں وہ کہہ رہا تھا جو وہ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

”نہیں عاشر! خدا کے لیے کہیں مت جانا، میری نظروں سے دور مت ہونا۔ تم نہیں جانتے۔ میں تمہاری وجہ سے وہاں سے واپس نہیں آئی، مجھے زبردستی وہاں بھیجا گیا تھا اور اتنے سال میں نے صرف تمہاری وجہ سے وہاں گزارے۔“

میں خود سے بھی چھپ چھپا کر جنہیں چاہتی رہی، لیکن میرا ضمیر مجھے چین نہ لینے دیتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس سخت ملالت سے۔ اس لیے وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ تو میں نے سوچا تک نہ تھا کہ تم بھی مجھے چاہتے ہو گے۔

اس کے اندر سالوں سے پٹکا لاوا اہل اہل کے باہر نکلتا رہا، وہ خالی ہو گئی۔ اب مجھے اپنی مرضی سے اسے بھرتا تھا اور میں نے خوب بھرا، وہ کھلی کی طرح میری انگلیوں کے اشارے پہ ناچتی رہی۔ صرف ایک بار اس کے قدم ڈمکائے جب میں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ ہند سے استعفا داری کا تحریری بیان دے۔

”سچھا کر دشمن! باقر بھائی جان کو بھی تم سے دلچسپی نہیں رہی، لیکن ہند کی وجہ سے وہ طلاق دینے میں پس و پیش سے ضرور کام لیں گے۔ ابھی لو ہا گرم ہے، لیکن وقت گزرتا گیا تو ان کا خنڈا پڑنا غصہ مصالحت کی راہ نکالنے کے لیے سوچنے لگے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ طلاق کا مطالبہ صرف تمہاری وجہ سے ہو۔ بلکہ اسے تیرے دونوں کی جذباتی اور وقتی جلد بازی کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ بعد میں میں خاندان کی بھلائی اور ہند کی بہتری کی خاطر تم سے

تم فہم کی خاطر ایک دو بار خود کشی کی ناکام سی کوشش کرنا۔ امی مومہ جو جائیں گی۔ میں تم سے شادی کر کے ہند کو اور تمہیں لے کر باہر کہیں سہل ہو جاؤں گا۔ میں ہند کا چچا ہوں، بھائی جان اور امی جان اسے خوشی میرے حوالے کر دیں گے۔“

اور اس نے میرے کہنے پر عمل کیا۔ سب کچھ میری خواہش کے مطابق ہو چکا تھا۔ شرمین اس گھر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئی تھی۔

زینیا کے دل سے میں نے یہ شگ فراہمی دفع کر دیا تھا۔ یوں بھی اپنی تمام تر ذہانت اور معاملہ فہمی کے باوجود وہ بنیادی طور پر ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ شاید اس کے اپنے اصول پرست دماغ نے یہ ساری کہانی قبول نہ کی ہوگی۔ کیسے ایک شادی شدہ عورت، اپنے اس دور کے عشق میں.... وہ کیا جانتی تھی کہ کہانیاں سچ سے بھی بنی جاتی ہیں۔ تو ایک آدھ عورت شرمین جیسی بھی ہوئی ہے، رشتوں میں ڈنڈی مارنے سے نہ چوکنے والی تھی۔

ہند بھی میری توقع کے مطابق جلد ہی بھل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امی نے بھی زینیا کو دل میں جگہ دے دی تھی۔ مجھے لب کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اور وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

”اب میں تمہاری شادی کا سوچوں تو ذہن میں بس ایک ہی نام آتا ہے.... زینیا.... اس کے سوا اب کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ میں من کے سرگرا دیا۔

”میری بات کا جواب دو۔ زینیا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میری کیا رائے ہوئی ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”حالات اور ہوتے تو میری رائے بھی اچھی اور ہوتی، لیکن آپ کی اس بات سے میں بھی متفق ہوں کہ اس گھر کو زینیا بھی لڑکی کی ضرورت ہے۔ بہت عرصہ آپ نے گھر داری میں جان کھپائی۔ ہند کے لیے بھی زینیا سے بہتر کوئی اور نہیں۔ تنہا ہے امی جان، اس گھر کی بہتری کے لیے آپ نے جو سوچا ہے، اچھا ہی سوچا ہوگا۔“

”یہ کیا بات ہوئی، گھر اور ہند کے علاوہ زینیا تمہارے لیے بھی تو مناسب ہے، تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے۔“

”ایک ہی بات ہے امی جان! میں کیا اس گھر سے الگ ہوں۔“

نہ جانے کون سی بات تھی جو مجھے ماں تک کے آگے کھٹنے نہ دیتی تھی۔ کاش.... کاش.... میں تب اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر کہہ دیتا۔

زینبا نے خود ہی دفتر کے حق میں فیصلہ دیا۔ اسے غایت ہوتا ہے کہ وہ نہد کے لیے کئی جی ہے۔ اس کے لیے اس نے گھر آئے بہترین رشتے کو مسترد کر دیا۔ تاکہ ممتا کی سوتیلی بہن پوری اتر سکے۔ میں تو شکرانے کے نفل ادا کروں گی۔“ وہ اٹھ گئیں لیکن مجھے تو جین اور ذلت کے احساس سے سلگنا چھوڑ گئیں۔

”زینبا عمار! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ میرے بھوکے نفس کے آگے سے روٹی اٹھالی۔ اور بھوکا شیر لکنا خطرناک ہوتا ہے، تمہیں اندازہ ہی نہیں۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا۔ کس لیے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔

”یہ سوال میں تم سے نہیں کروں گا، کبھی بھی نہیں۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی۔ میرے دل میں کیا تھا۔ مجھے تمہاری قسمت پسند ہو رہا ہے۔ تم نے بڑے گھانے کا سودا کیا ہے۔ عمر بھر کی ذلت، پیچھا تار اور مردیاں خرید لی ہیں، یہ تمہیں وقت بتائے گا۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“

میں نے تجاہیر کر لیا تھا کل آفس میں اس سے معمول کے مطابق ملوں گا۔ اپنے رویے سے کسی طور یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ مجھے اس کے فیصلے سے کوئی فرق پڑا ہے، نہ اچھا نہ برا۔ اس سے کسی قسم کی جواب طلبی نہیں کروں گا۔ لیکن میں اس کی سزا ضرور دوں گا۔

میں نے خود کو خدا تصور کیا اور سزا اور جزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک ذلیل مامٹو بنانے لگا یہ جانے بغیر کہ اوپر جو خدا ایسا ہے۔

☆☆☆

”بڑھ سو روپیہ۔“

جیسی ایک جھپٹکے سے رُکی اور ڈرامائی طور پر کرائے کی رقم بتائی، مجھے اسی وقت احساس ہوا کہ میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ میں پریشان ہوا تھا۔

”میرے پاس تو صرف ڈالرز ہیں چل سکتے۔“

”نوسرا! اس نے صاف انکار کر دیا۔“ بڑا لمبا جھجھٹ ہے۔“

”بڑھ سو سے اوپر بنے گا۔“ میں نے چند ڈالرز اس کے آگے لہرائے وہ ہنوز انکاری تھا۔

”سر! آپ اندر سے تیار کر لیں۔“

”اندر۔۔۔۔۔“ میں نے گھر سے بڑے سے گیسٹ کے اندر جھانکا۔ باہر کھڑا گیسٹ کیمبر میرے لیے تیار تھا۔ میں نے گیسٹ کے اندر جھانکا چاہا، بڑا سا کار پورج خالی تھا۔ یقیناً

”بھائی جان گھر نہ تھے۔ میں کچھ سوچ کے آگے بڑھا۔ گارڈ سے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے بڑھ سو روپیہ طلب کیا۔

”ام کو کیا کھمبر بھرتو کون اسے۔ کھا خواہم کوڈ بڑھ سو روپیہ دے دیں۔ ام کو پاگل داگل سمجھا ہے۔“ اس نے پیچھے سے صاف انکار کر دیا۔

گیٹ کیمبر نے میرے کہنے پہ انکار کام پاندر سے کسی کو بلا یا ایک آیا ناپ عورت باہر نکلی، وہ مجھے میرے لیے آنا تھی۔

”باجی! یہ صاحب کھود کو بڑے صاحب کا بھائی بتاتی ہے۔“

”ہاں، ہاں میں نے ان کی تصویر اندر لگی دیکھی ہے۔ نہد کے کمرے میں بھی اور بڑے ہال کمرے میں بھی! آفس صاحب! اندر آئیں۔“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب تک میرا چہرہ، میرا وجود اس گھر کے کیمبروں کے لیے اچھا ہے۔ اسی ملازمہ نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور مجھے اندر لے آئی۔

”صاحب آپ کا کمرہ ریز صاف ہوتا ہے لیکن چایاں بڑے صاحب کے پاس ہیں، وہ ایک ٹور کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں، آج لوٹیں گے۔ نہد بابا سو رہے ہیں۔ آپ فی الحال گیسٹ روم میں آرام کیجئے۔ صاحب ناشتا چائے۔“

”صرف ایک کپ کافی۔“ میں کہہ کر اندر چلا آیا۔ گھر میں بہت سی تہہ پیاں آچکی تھیں اور بہت سی چیزیں اب تک وہی تھیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو گھر کی ظاہری حالت میں اب پہلے سے کہیں بڑھ کے امارت اور آسودگی ٹپک رہی تھی۔

”یہ کس کی کونج کا حاصل ہے۔۔۔۔۔“ میں نے گھوم پھر کے اعلا درجے کے نفیس اور قیمتی شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پہلے ہی دولت کی کمی تھی، نہ خوش ذوقی کی۔ مگر امی جان کی سادگی زیادہ خوشاکی محفل نہیں ہوتی تھی۔ اور اب وال ٹوال مجھے گھرے رنگوں کے کارپٹ، ڈیزائنڈ فیر، قیمتی فائوس اور امپورنڈ ڈیکوریشن پیشو۔

”کہیں باقر بھائی جان نے دوسری شادی تو نہیں کر لی۔“ پہلا خیال مجھے بھی آیا۔

”لیکن نہیں، ملازمہ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا۔“ میں نے خود ہی خیال رد کر دیا۔

”ضرور بھائی جان کی تنہائی نے گھر کی دیرانی کو دور کرنے کے لیے یہ مصنوعی اور کھوکھلے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔“

میں ایک نتیجے تک پہنچ گیا۔ پورے استحقاق کے ساتھ میں پورے گھر میں گھوم پھر کے جائزہ لے رہا تھا۔ ایک کپ گرم کافی نے بھی سفر کی ساری تھکان زائل کر دی۔ امی جان

کے کمرے کے بند دروازے کے آگے میں قہقہہ کیا۔ ہاتھ کے پلکے سے دھکیلنے پر دروازہ یوں کھل گیا جیسے میرے پھونے کا انتظار کر رہا ہو۔

سب کچھ دیکھنے کا دیکھا تھا، وہی اسی جان کے جہیز کا بڑا سا بیڈ، اس پر بھی سفید دودھ جیسی بے شکن چادر۔ اسی جان کی وہی پسندیدہ رضائی۔ میری خشک بجز آنکھوں کے فرش بل میں گیلے ہو گئے۔ میں نے کمرے کی دیوار پر لگی اپنی اور باقر بھائی جان کی تصویروں کو دیکھنا چاہا، سب ویسی کی ویسی تھیں، وہی تھیں ان میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔

اجانک میری نظر بائیں طرف والی دیوار پر لگی اسی کی بڑی سی تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر اس کمرے میں نیا اضافہ تھا۔ میں بے جان قدموں کو کھینچتا اس تصویر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اسی کے چہرے پر آسودگی تھی۔ آنکھوں میں خواب تھے۔ اور کھنکھائیاں پوری کرنے کا سرور بھی۔ یہ تصویر باقر بھائی جان کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی تھی اور جب آخری بار میں نے انہیں اتنا شاد و مطمئن دیکھا تھا۔ وہ کیا جانتی تھیں کہ یہ شادی..... پتہ نہیں یہ تصویر یہاں کب لگائی گئی۔ اپنی زندگی میں تو وہ کبھی ایسا نہ کرنے دیتیں۔ شاید یہ تصویر بھائی جان نے ان کے جانے کے بعد لگائی ہو۔

ان کی وفات کی خبر مجھے تب ملی جب انہیں گزرے دو ہفتے ہو چکے تھے اور مجھے نینو یارک آئے ڈیڑھ سال ہو رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کتنا عرصہ میں اس ڈر سے چھپا چھپا رہا کہ کوئی مجھے کھوج نہ لگالے۔ کئی بار جاننے کی خواہش دل میں ابھری کہ ایک بار پتہ تو کروں، وہاں سب کیسے ہیں، میرے جانے کے بعد کیا ہوا۔ لیکن کسی انہوئی کی خدشے سے دیک کے بیٹھ جاتا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں جب میرا ضمیر خود ہی مجھے گڑے مار مار کے تھک گیا اور میری بزدلی جسے میں ہمیشہ اپنا غرور سمجھتا رہا دم توڑ گئی تو میں نے ہمت کر کے پاکستان کی خبر لے لینا چاہی۔ اور پہلی خبر جو ملی وہ یہ تھی کہ ادا جان کو گزرے چندہ دن گزر چکے تھے۔ یہ خبر اتنی اندوہناک تھی میرے لیے کہ دوبارہ کبھی کسی خبر کو جاننے کی آرزو کبھی دل میں نہ جا گی۔

میں نے آہستہ آہستہ تصویر پر اپنی انگلیاں پھیریں۔

”مجھے معاف کر دیں اسی! میں آپ کے پیار کے قابل نہ تھا، میں بد نصیب تھا جو سب ٹھکرا رہا تھا۔ دعا میں بھی، وفا میں بھی۔ اور ایک وقت آیا کہ دعاؤں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وفائوں نے خود مجھ سے منہ موڑ لیا۔“

اور یہ سچ تھا مجھے دعا دینے والے لب لباب کے خاموش ہو چکے تھے، مجھ سے وفا کا عہد کرنے والے ہاتھ اب مجھے کچھ بھولے ہرے عہد یاد دل رہے تھے۔

ہر شخص میں ڈھونڈتا ہوں خود کو
شاید میں کسی میں کھو گیا ہوں
اب تیرا وصل رائیگاں ہے
میں کب کا اداس ہو چکا ہوں
اندھا ہوں پکڑ لے ہاتھ میرا
اے جگر کی شب، میں بے صفا ہوں
خوش ہو اے بلندیوں کی خواہش
میں لوگ سناں پہ سج گیا ہوں
دریا کو شکست دی ہے میں نے
مشکیزے میں پیاس بھر رہا ہوں
کرتا ہے کون قبول مجھ کو
کئے ہوئے ہاتھ کی دعا ہوں
سچ یہ ہے کہ اجنبی ہوں خود سے
کہنے کو میں سب سے آشنا ہوں

یہ چند اشعار..... یہ غزل گزرے ان برسوں میں میں نے اتنی بار پڑھی تھی کہ اب اس کے مصرعے وقت بے وقت میرے اندر گونجتے رہتے۔ میں نے سچ سچ اپنے مشکیزے میں پیاس ہی تو بھری۔ اپنے ہاتھوں صحرایہ کر لایا تھا۔
ماں کس کی سدا جیبتی راتی ہے۔ لیکن میں ان بد نصیبوں میں سے تھا، جنہیں ماں کا آخری دیدار تک نصیب نہیں ہوتا۔ جنہیں اپنی ماں کے گزرنے کے کئی دنوں بعد پتا چلتا ہے کہ ان سے کیا چھیننا چاہا ہے۔

☆☆☆

”چاچو! آپ میرے چاچو ہیں؟“

جاگنے کے بعد جیسے ہی لہجہ کو میرے آنے کی خبر ملی تو وہ دوڑ کے میرے کمرے میں آ گیا۔

”فہمد، میرا فہمد، چاچو کا فہمد“

میں نے اسے باہوں میں بھر لیا۔ کیا وقت تھا، جب یہ جان کر کہ زینا نے مجھ پر باقر بھیا کو صرف ضد کی وجہ سے فوٹیت دی ہے، مجھے اس معصوم بچے سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس بچے سے، جو دنیا کی واحد ہستی تھا۔ جس سے بے پناہ محبت کا اظہار

کرتے ہوئے میں کبھی ہچکچایا نہیں۔ یہ نفرت بھلے ہی بس ایک لمحے بھر کی تھی، لیکن پچھلے کئی سالوں سے میں اس ایک لمحے کو بھونے پہ بچھتا ہوا رہا۔ شرمندہ رہا۔ شاید میں عمر بھر اسے ٹوٹ کر چاہنے کے بعد بھی اس ایک بد صورت لمحے کا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔

کئی ہی دیر میں اسے بارودوں میں بھینچے، سینے سے لگے کھڑا رہا۔ وہ دس گیارہ سال کا دبلا پتلا بچہ بھائی جان کی طرح لہسا تھا۔ میرے شانوں سے اوپر آتا۔ وہ میرے احساسات کو نئے نئے پیرا بن اٹھتا رہا۔ اس کی تیز دھڑکنیں میرے سینے میں یوں دھک دھک کرتی بدغم ہو رہی تھیں جیسے اس کا دل میرے اندر گھس آنا چاہتا ہو۔

”کیا ابو جان بھی مجھے سینے سے لگے کے ایسا ہی محسوس کرتے تھے۔“

میں نے اس کی آری کنگک والے بکھرے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

اسے آنکھیں سے خود سے الگ کرتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کے غور سے دیکھنا چاہا، میرے دل نے ایک گھونسا سا لگا۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں والا بچہ۔ بچپن کو نہیں دور چھوڑ آیا تھا۔ اس کی سنجیدگی وقت سے کہیں پہلے سر پٹ بھاگ کے اس کے پاس آ پہنچی تھی۔ شاید ان سب کا بھی ذمہ دار میں ہی ہوں۔

وہ میرے پاس بیٹھا میرے چھوٹے چھوٹے نوالوں کا جواب دینے لگا۔ بھائی جان کے متعلق، ان کے برنس کے بارے میں، اپنے اسکول کی باتیں، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ، جب میں نے اس سے، اس کے دوستوں کے بارے میں پوچھا تو سب سے وہ شروع ہی ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار دلچسپی کے رنگ دیکھے۔ اس کے بہت سے دوست تھے اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کے دوست میرے دوستوں کی طرح محض ناظم پاس نہیں تھے۔ ان کے لیے محبت اور غلطوں اس کے لمحے سے ٹپک رہا تھا۔ رشتوں کی کمی نے شاید اسے دوستی کے سہارے تلاشنے پہ آکسیا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی پر جوش گفتگو سن رہا اور خود کو ملامت بھی کرتا رہا۔

”عاشق ملک! انہدی کی زندگی مکمل ہونے جارہی تھی۔ اس کو ماں ملنے والی تھی، صرف نام کی نہیں، بلکہ سچ سچ کی ماں.... شاید کڑے برس اسے بہن، بھائی کے رشتے بھی دے جاتے، لیکن تم نے سب اس سے ایک جھٹکے میں جھین لیا۔ ایک بار اس کی ماں تم نے اس لیے الگ کی کہ وہ تمہیں پسند نہ تھی اور دوسری بار تم نے اس کی ماں اس لیے بھیجی کہ وہ تمہیں پسند تھی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عاشق؟“ امی جان میری ہرزہ سرائی پہ دنگ رہ گئیں، میں نے بات بھی تو اپنی پریشان کن حد تک حیران کر دینے والی کی تھی۔

”بات یہ ہے امی جان! کہ..... سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے کہوں۔ اگر دنیا کے بارے میں آپ اتنی سنجیدہ نہ ہوتیں تو شاید میں بھی اس کی ذاتیات میں ڈل نہ دیتا۔ وہ میری کو لگے اور افسوس ناظم میں ہم اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں، فہمیدے اس نے اپنی افسیت ظاہر کی تو میں نے اس کے اپنے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا، لیکن آپ کے اسے بہو کے طور پر منتخب کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس کے بارے میں کچھ تو چھان بین کرنا چاہیے، زانہ بہت خراب ہے امی جان، لوگ ہزار چہرے ایک چہرے پہ سجا کے ملتے ہیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو، سیدھی طرح کہو؟“

”اس سے پہلے بھئی صاحب نے اور مس ایتنا دونوں نے اس کے بارے میں کچھ اندیشوں کا اظہار کیا تھا، لیکن میں نے اسے پرفیشنل جیسی جان کے جھٹلایا۔ اور پھر امی بڑے باوقوف ذرائع سے مجھے علم ہوا ہے کہ اس کا اپنے بھائیوں سے جھگڑا وہ نہیں جو اس نے مشہور کر رکھا ہے، اصل بات کچھ اور ہے۔ بدنامی کے خوف سے اس کے گھر والوں نے اس سے قطع تعلیق کر رکھا ہے۔ اس کے نام پہ تو کہتے ہیں وہ۔“

اور میری آنٹی بڑی بات پان کا حیران ہونا تو لازم تھا۔ میں نے اسی کا پتلا نہ کیا۔ ”اور وہ لڑکا جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس کا اپنا بچہ تھا۔ کچھ بتائیں، جائز یا ناجائز، اس کے باپ نے اسے جائیداد سے بے دخل کر دیا تھا۔ یہ بنگلہ، یہ کار، یہ ایک سابق ایم ایم اے سے تعلقات کا نتیجہ ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کس نے تمہارے کان بھرے ہیں۔ میں بات کرتی ہوں زینیا سے۔“ میں نے فوراً انہیں روکا۔

”اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔ بھلا چوراہی چوری تسلیم کرتا ہے۔ میں مکمل تھریوٹ کر کے یہ بات آپ سے کر رہا ہوں۔ آپ کی مرضی۔ یقین نہ کریں اور بیزار غرق کر لیں اس گھر کا، جو کی شرمین کی جانب سے روٹی تھی، وہ اب پوری ہو جائے گی۔“

میری وارننگ پر وہ ششکری بیٹھی رہ گئیں۔ ظاہر ہے انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ زانہ شناس نہ تھی مگر اچھے برے کی کچھ پہچان تو تھی۔ اور پھر اچھائی کی تو اپنی مہک ہوتی ہے۔ کیا یہ مہک انہوں نے زینیا سے محسوس نہ کی ہوگی۔ کی ہوگی تب ہی اپنے گنگے بیٹے

طرف ایک ماں ہونے کے خدشے تھے۔ وہ الجھنی تھیں۔

فی الحال میرے لیے اتنا کافی تھا، میری اگلی ضرب پہلے سے بڑھ کے کاری تھی۔ اور اس کا بھی میں نے پورا انتظام کر رکھا تھا، ایک جانے والے نوٹو گرافر کے ذریعے میں نے زینیا کی ان تصاویر کو، جو پچھلے بیوا پر فٹکشن میں لگی تھیں، ایسے ایسے انداز دیئے تھے کہ ای جان تو دیکھتے ہی اس بے لوث بیچ ویتیں۔ احتیاطاً میں نے ان تصاویر کی ایک کاپی باقی بھائی جان کے لیے بھی بھجوا دی تھی تاکہ ان کی غیرت کو بھی درج اہل تک لے آؤں۔ کل صبح تک ان تصاویر کو ای جان اور بھائی جان کے پاس پہنچانے کا مکمل انتظام کر کے میں بڑا مطمئن، بڑا فارغ سائبان کے زینیا کی طرف چل پڑا تھا۔

میں اسے یہ بتائیں سکتا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ میں اسے یہ بھی نہیں دکھا سکتا تھا کہ دیکھو میں جیت گیا، لیکن میں یہ دیکھ کے دل ہی دل میں ہنس تو سکتا تھا کہ مجھ سے ہارنے والی وہ عام ی لڑکی، خود کو مجھ سے جیتتا ہوا جان رہی ہے۔

☆☆☆

”کیسے آنا ہوا.....؟“

میں جو ناٹل طریقے سے اس سے ملنے کے ارادے باندھ بیٹھا تھا اس کے پہلے ہی سوال پہ گڑ بڑا گیا۔ دروازے کے پتھوں کچھ گھڑی وہ بڑی بے رخی سے مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

اس کے متنے جہرے پر کچھ پالنے کا یا حاصل کر لینے کا سرور نہیں تھا۔ جس کا میزے اندر طوفان سا اٹھا۔

”بات کیا ہے۔ تم اتنی اگڑی اگڑی کیوں ہو۔؟“ وہ خاموش رہی، لیکن ایک طرف ہٹ کے اس نے گویا مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اب وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی اپنی انگلیاں مسل رہی تھی، مجھے اپنے دل پہ چنگاں سی بھرنی محسوس ہوئیں۔ پتہ نہیں اس کی مسکراہٹ کا میرے ہاتھوں سے، اور اس کے ہاتھوں کا میرے دل سے یہ کیسا رابطہ تھا۔ سینہ سلتے ہوئے میں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”فاشر! اب ہم کسی اور رشتے سے وابستہ ہونے جا رہے ہیں، مجھے تمہاری کہنی میں کام کرنا مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا، اس لیے میں ریزائن کر رہی ہوں اور جب تک اس نئے رشتے کو واضح شکل نہیں مل جاتی ہمارا ملنا مناسب نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آخر ہم اچھے دوست ہیں۔ یہ بیارشتہ ہماری دوستی پہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان فیٹ میں تو تمہیں مبارکبادی دینے آیا تھا۔“ میں نے پراسرا

طریقے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دوستی گزرتے کل کی بات تھی۔“ اس کے زوٹھے انداز پہ میں نے تنگ کے پوچھا۔

”کیوں۔ یا پھر میں یہ سمجھوں کہ وہ دوستی آنے والے کل کو ہموار کرنے کے لیے کی گئی تھی۔“ وہ تڑپ اٹھی میرے الزام پہ۔

”میں تمہیں ایک اچھا انسان سمجھتی تھی، اس لیے تم سے.....“ وہ لب کاٹتے ہوئے رک گئی۔ پھر اس اچانک وقفے کے بعد سنبھل کے بولی۔ ”تم سے دوستی کر لی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر گھٹانے کے کردار کے مالک ہو۔“

”واٹ ڈو یو مین.....“ میں غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”اگر میں اتنا ہی گھٹانا ہوں تو پھر صرف میرے رشتے سے انکار کرنے پہ ہی کیوں اکتفا کیا۔ میرے بھائی کو بھی ٹھکرا دیتیں۔ لیکن نہیں زینیا عمر! تم ایک سودخور ذہنیت کی مالک عورت ہو۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں وہ اپنی ایک شخصیت بنا چکے ہیں، جب کہ میں ابھی تاہم چھ بارہ ماہوں۔ اور سود کے طور پر تمہیں ایک ایسا شو بہی مل رہا ہے جو تمہارے احسان کے جوہر تلے دب کے ہمیشہ تمہارے تلے جا چکا ہے گا۔“

”کو اس کر رہے ہو تم۔“ کہنی پار میں نے اسے اس قدر جارحانہ انداز میں دیکھا۔

”تم سے شادی نہ کرنے کی وجہ بھی اور کسی اور کسی باقر کے لیے ہائی بھرنے کی وجہ بھی اور ہے۔“

”تم اس قدر گندے، بددیانت اور کردہ انسان ہو کہ تم نے اپنے بھائی کی زندگی میں زہر گھولتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس نہ کی۔

ایک ایسی عورت سے ناچاز تعلقات رکھنے میں تمہیں کوئی خوف خدا نہ آیا۔ جو شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے تمہارے لیے محرم تھی۔ تم نے اپنے کردار کی گندگی چھپانے کے لیے اپنے اور اس کے رشتے کا اختلاف کے پورے ڈالے رکھے تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔ جس چار دیواری کے اندر اور جس چھت کے نیچے اپنے شرمناک کھیل کھیلے جاتے ہوں میں اس گھر میں جانے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتی۔

لیکن اگر میں باقر ملک کے لیے رضامند ہوئی ہوں تو صرف ہند کی وجہ سے۔ پہلے مجھے اس میں صرف اپنے ہند کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب خدا نے اسے میرے لیے پورے کا پورا فائدہ بنا دیا ہے۔ انسانیت کے ناتے صرف اور صرف انسانیت کے ناتے یہ شادی کر رہی ہوں تاکہ اس انسان کے ساتھ بے خبری میں اتنے سالوں تک جو خیانت ہوئی رہی اس کا کچھ تو ازالہ ہو سکے۔“

”کس نے کہا تم سے یہ سب۔ بولو۔ کس نے کہا۔ شرمین نے۔“

میں اس کی باتیں سن کر بھڑ گیا۔ جنونی انداز میں اس کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے پوچھا، وہ زرد ہو کے پیچھے بٹنی۔

”مجھے ہاتھ مت لگانا عاشر!....! میں شرین نہیں۔“

اس نے پاس بڑا اگلدان اٹھالیا، مجھے ایسے لگا جیسے اس نے مجھے تیل پینچ کیا ہو۔ میرے اندر سے زبردست تحریک اٹھی، اسے سسل دینے کی۔ اس کا غرور پکنا چور کر دینے کی..... مگر میرے پیر پیچھے کی سن وزنی برف کے تودوں میں تبدیل ہو گئے۔ میرے ہاتھ سن ہو کے میرے ہی پہلو میں گر گئے۔ میں نے آنکھیں پھیکا کے اسے دیکھا۔

”نہیں عاشر ملک! تم بھی یہ نہیں کر پاؤ گے۔ بھی نہیں، کسی کے ساتھ بھی نہیں، کم از کم زینیا کے ساتھ تو بھی نہیں۔“

میرے موہاں پہ پیپ بچنے لگی۔ ڈھیلے قدموں کے ساتھ پیچھے ہوتے ہوئے میں صوفے پر گر گیا۔ پیپ ابھی بھی بج رہی تھی۔

”تم نے بہت برا کیا زینیا، بہت برا، میں اچھا نہیں ہوں، مجھے اعتراف ہے۔ میں پوری سچائی اور ہمت کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن یہ اتنا گھناؤنا انحراف، اتنا بڑا جھوٹ۔“

”آج جب ضرب مجھ پہ پڑی تھی تو میں ترک پ گیا تھا۔

”کوئی عورت اتنا بڑا جھوٹ نہیں بولی سکتی عاشر! شرین نے مجھے یقین دلادیا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی تم سے محبت کرتی تھی، لیکن تم دونوں کی شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ تب تم اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ نہ تو کوئی اونچی کہاں تھی، نہ ہی اپنا کبھی بار ہوا تھا۔ ایسے سانحوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں، گم اٹھاتے ہیں خوابوں کی کرچیاں سمیٹتے ہیں اور پھر راسی برضا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سانحو تو یہ تھا عاشر ملک کہ تم نے قدرت سے راسی برضا ہونے سے انکار کر دیا۔

تم اپنے ماں اور بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے، اور وہ اپنے شوہر کا حق ماوی رہی۔ اس نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے، سب کچھ۔“

وہ ہنسی رہی اور میں بے حس و بے حرکت منتار ہا پیپ اب بھی وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔

”اس نے مجھے یہ نیک بتادیا ہے کہ فہد باقر کا نہیں، بلکہ تمہارا خون ہے، تمہارے اور شرین کے غلط مراسم کا نتیجہ۔“

یہ آخری الزام میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے ٹھیل پہ پڑی چیزوں کو ہاتھ کے

دھکے سے نیچے گر ڈالا اور وحشت سے چیخ اٹھا۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ ساری کائنات درہم برہم کر دوں۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اتنی گندی بات منہ سے نکالنے کی، وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، میرے بھائی کا بیٹا، ہاں وہ میرا خون ہے مگر.....“

میں بہت کچھ کہتا چاہتا تھا، بہت کچھ کرنا چاہتا تھا، لیکن لفظ میرے لبوں تک آ کے ٹوٹ ٹوٹ گئے۔

”اور وہ بچہ جسے وہ اپنا سوتیلی بھائی بتاتی ہے، اس کا اپنا ہے، جائز یا ناجائز یہ پتا نہیں۔“ میرے ہی کبے الفاظ نے میرے منہ پہ طمانچہ سید کیا۔ اب زینیا کے طمانچے کا درد

کم پڑ گیا۔

”وہی تو اس کے باپ کا خون تھا، جسے میں نے اسی کی اولاد کہہ دیا۔ کیا یہ کم گندی کا کافی تھی جو میں نے اسی بدلے میں، میں اس سے کہیں بڑھ کے ذلالت کا شوق تھا۔“

میں نے ساری عزائم ترک کر دی اور چپ چاپ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ میرے لبوں پہ ایسی مجرد جی مسکراہٹ تھی جیسے کسی سپاہی کے ہونٹوں پہ تب

اُجھڑ آئے جب اس کا ہتھیار اٹلنے کا ارادہ نہ ہو، مگر اس کے بازو بھی ہتھیاروں سمیت کٹ کے زمین پر آ رہیں۔

اب میں جان گیا تھا کہ میرے ساتھ جو رہا ہے وہ شرین نے نہیں کیا۔ میں جو سن رہا ہوں وہ زینیا نہیں کہہ رہی۔ یہ سب تو میرے اعمال کی سزا ہے۔

”اب خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی اور بھی کبھی گھڑ لو عاشر ملک!۔“

میرے موہاں کی پیپ پھر سے بچنے لگی۔ مجھے سب سٹائی دے رہا تھا۔ سب کچھ، زینیا کی لعنت ملاست بھی فون کی پیپ بھی۔ مگر یہ سب بس منظر میں گونج رہا تھا۔ میرے اندر سے سب سے بلند صدا گونجی وہ یہی۔

”عاشر ملک، آج تم چاروں خانے جت ہو گئے۔ جب تک تم صرف اپنے غرور کی تسکین کے لیے، اپنی آکر کے دُغم میں اور اپنی خود پسندی کے نشے میں چور، وہ چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں کرتے رہے، اللہ نے شاید تمہاری رذیہ دار کر رکھی تھی۔ یا پھر وہ جہیں کسی شریر اور نا اچھے بچے کی رعایت دیتے ہوئے درگزر کرتا رہا۔ لیکن جب تم نے خدا کے کام اپنے

ہاتھ لیے تو شروع کیے، تقدیر خود تم کرنے کے لیے قلم سنبھال لیے۔ تو یہ رسی تو اللہ نے کھینچنا ہی تھی۔ اب تم کچھ نہیں دھتے ہوئے ہو۔

وہ عامی لڑکی جس کی ہار کا تمنا شام دیکھنے آئے تھے، تم پہ تھوکر رہی ہے، وہ عورت

جسے تم نے محض اس لیے ٹریپ کیا کہ اس نے تم سے محبت کرنے کی جسارت کی۔ جنہیں اس کی اپنے بھائی سے بے وفائی پسند نہیں آئی اور تم نے فریب سے اسے بھائی کی زندگی سے دور کر دیا اور تمہاری یہ بات اللہ کو پسند نہیں آئی۔ مزادے گا اختیار تو صرف اس کو ہے وہ شر میں کو معاف کرتا، سیدھی راہ پر لاتا، ماسوا دیتا۔ یہ تو اس کی مرضی تھی۔

زینیا کو اپنانے کی تم نے ہر ممکن کوشش کی، اس کوشش کا اختیار اللہ نے ہی تمہیں دیا تھا لیکن اس اختیار کو غلط استعمال کرنے کی اجازت تو نہیں دی تھی تم ایک بار تو اسے محبت سے جیننے کی کوشش کرتے، اس کے انکار کی وجہ تو جاننے کی کوشش کرتے، شاید یہ بات پہلے کھل جاتی، تم اپنی صفائی پیش کر کے اس کا دل صاف کر لیتے۔

لیکن نا اعلیٰ، گڑبڑ کا نام تمہارے لیے مشکل تھا۔ یہ جو چنا آسان تھا کہ اگر وہ میری نہ ہو سکی تو کسی اور کا بننے بھی نددوں گا، تم تقدیر لکھنے چلے تھے تو اب تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانا ضروری تھا۔“

میں چپ چاپ آنکھیں بند کیے یہ طعنہ سنتا رہا۔ موبائل کی بیپ بھی اور زینیا کا سوال بھی۔

اجا یک اس کی نظر زمین پر پڑے مسلسل پکارتے موبائل پر پڑی وہ چونک اٹھی۔
”شر میں.....!“ اسکرین پر شاید شر میں کا نمبر آ رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھی۔

میں شیم وا آنکھوں سے بے جان بیٹھا اسے لپک کے زمین سے فون اٹھاتے اور کان سے لگاتے دیکھتا رہا۔ اس نے آن کرتے ہی چمکے کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر وہ کھٹکے کا کھلا ہی رہ گیا۔ شاید شر میں نے دوسری طرف سے آواز سننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اتنی دور بعد رابطہ قائم ہونے پر ایک سینکڑا کا انتظار کے بغیر شروع ہو گئی۔ نہجانے وہ کیا کہہ رہی تھی زینیا سنتی گئی۔ اور اس کی پیشانی سے پسینہ چھوٹا گیا۔ وہ سنتی گئی اور اس کی آنکھیں جھپکتی گئیں۔ وہ سنتی گئی اور اس کے لب کپکپاتے گئے۔ کچھ دور بعد اس نے موبائل آف کیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے سامنے والی نشست پر ٹپک لگائی۔ میں نے آنکھیں پھر سے موند لیں۔ مجھ میں نہ تو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ شر میں نے اس سے اب اور کیا کہا اور نہ ہی اٹھ کے یہاں سے جاننے کی ہمت تھی۔

میں تو ایک الگ ہی کیفیت میں تھا۔
”اللہ اللہ، میرے اللہ مجھے معاف کر دے۔۔۔ میں اسی قابل تھا مگر تو مجھے سنبھلے کا ایک موقع دے۔“ مجھے ندامت تھی۔

”یا اللہ، مجھے معاف کر دے۔ کل تک کوئی مجھے اس قابل نہ لگتا تھا کہ میں اسے اپنے لیے جانتا، آج میں اس قابل نہیں کہ کسی کا ہو سکوں۔“

کتنے ہی لمحے گزر گئے تھے، میں بھول ہی گیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا زینیا بھی یہاں موجود ہے لیکن کچھ ہی دور بعد مجھے اپنے ہاتھ پر کسی کیلے کیلے کا احساس ہوا۔ کا پتلی سی انگلیوں نے اسی طرح میرا ہاتھ سہلایا۔ جیسے بار بار سہلایا تھا۔ میں نے ذرا سی پکلیں کھول کے دیکھا۔ زینیا میرے سامنے کارپٹ پر دوڑا تو بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں پتہ نہیں کیوں دھندلی ہی ہو رہی تھیں، مجھے اس کے لبوں پر کوئی مسکراہٹ نظر نہ آئی، البتہ میرے ہاتھ پر وہ کس اچھی تک کلیاں چن رہا تھا۔ میں نے پکلیں جھپک کے پھر سے دیکھا۔ آنکھوں کی پتلیوں سے تیرے پھر تے گردے لے آئے پتلیوں کی سولی پر ٹپک گئے۔ منظر ذرا سا صاف ہوا۔ زینیا کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں مگر اس کے لب ساکت تھے۔ کسی پرس مسکراہٹ کی ہلکی سی رتق بھی نہ تھی۔

”تو پھر یہ کا پتلی انگلیاں، وہ سہلانا۔“ میں نے چونک کے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس پر زینیا کا ہاتھ دھرا تھا۔ میری روح پوری شدت سے کانپ رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دو عاشر!“ بڑی دقت کے ساتھ اس نے نندھے گلے سے یہ چند الفاظ ادا کیے۔ میں پھر سے کپکپا اٹھا۔

”کیا یہ کوئی نئی سزا ہے، اللہ معافی تو مجھے اس سے مانگنا ہے۔“
”میں اس قابل تو نہیں عاشر، لیکن مجھے معاف کر دو۔ مجھے دوستی کا کچھ تو مان رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر یقین کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔“

”تم تو یہ جان کر اس کی بات سننا چاہتی تھی کہ جنہیں مزید شرمندہ کر سکوں، لیکن پتا ہے دوسری طرف وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، عاشر میں نے تمہیں ہرا دیا۔ تم کبھی بار نہیں سکتے اس بات کا بوازم ہے کہ تمہیں۔ تم زینیا کو اپنانا چاہتے تھے۔ کیوں؟ اس میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں، میں نے اسے تم سے دور کر دیا۔ تم نے مجھے بھی اور میری محبت کو قبول نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس قابل کر دیا کہ کوئی تمہیں بول نہ کرے۔ تم اپنے بھائی کی زندگی سے مجھے اس لیے دور کرنا چاہتے تھے کہ تمہارے خیال میں میں نہ اچھی عورت ہوں، نہ اچھی بیوی، نہ اچھی ماں تو عاشر میں نے تمہارا اس بھائی سے یہ فر بھی چھین لیا

کہ وہ ایک باپ ہے۔ میں نے زینیا کو یہ یقین دلایا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان ناجائز تعلقات تھے، اور ان ہی تعلقات کا نتیجہ فہد ہے، کیوں عاشر ملک! جھوٹ کیا تم ہی بول سکتے ہو۔ دیکھو میں نے کس صفائی سے یہ جھوٹ بولے ہیں کہ زینیا جیسی اچھی غامی

مستقل مندر لڑی تھی اب بے بنیاد باتوں پر ایمان لے آئی۔“
شر میں کی ساری باتیں دہرا کر وہ خاموش ہو گئی۔

میں حیران تھا، کیا میری توبہ اتنی جلدی قبول ہوگی۔ کیا اللہ نے مجھے اتنی جلدی معاف کر دیا۔ کیا میرے دامن پہ لگا داغ اتنی جلدی مٹ گیا۔

”عاشر....! تم نے بھی مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم مجھ سے.....“

اب وقت آ گیا تھا، جب مجھے اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنا تھا، خدا کے آگے جھکنے کے بعد، گزر گزرنے کے بعد، مجھے احساس ہوا کہ معافی مانگ لینے میں تو نفع ہی نفع ہے۔ کیسے اللہ نے میری توبہ قبول کی اور مجھ پہ الزام لگانے والی نے خود اپنی زبان سے یہ الزام دھو بھی ڈالے۔ اب مجھے زینیا کے آگے بھی اپنا آپ کھول کے رکھ دینا تھا۔ سب کچھ بتا دینا تھا۔

”زینیا! بات اتنی سیدھی نہیں جتنی تم سمجھ رہی ہو۔“ کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد میں بولا تو مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

”شرمین نے تم سے سب کچھ جھوٹ بولا، لیکن کچھ جیج میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں، یہ فیک ہے کہ ہمارے درمیان نہ تو اس کی شادی سے پہلے کچھ تھا نہ بعد میں رہا۔ یہ بھی جیج ہے کہ فہد..... لیکن ایک جیج ہے کہ اس نے باہر بھائی جان سے طلاق میرے دنگلانے کے بعد ہی لی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس طلاق کے بعد میں اس سے شادی کر لوں گا۔“

میں رکا، وہ بے چینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرے ہاتھ پہ رکھا اس کا ہاتھ مجھے بولتے رہنے کی ہمت دلا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں وہ یہ ہاتھ مجھ سے اٹھانے لے۔

”لیکن اس کی ایک وجہ تھی، ایک شخص اور جا بڑ وجہ۔ وہ جس ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری کا شکار تھی۔ اس پہ اب میرا سمجھنا بھاننا بے اثر جاتا، میں نے اس کا علاج اسی کے طریقے سے کرنے کا سوچا۔“

مجھے سب سے پہلے یہ احساس دلانے والی تم تھیں کہ شرمین مجھ میں دلچسپی رکھتی ہے۔ میں نے سوچا تو مجھے تمہارا اندازہ درست معلوم ہوا۔ میرے ایک ہی بار پوچھنے پہ شرمین نے اپنا آپ عیاں کر دیا۔ زینیا اب اس کا میرے بھائی کے ساتھ رہتا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ٹھیک نہیں تھا۔ جب تک اس نے خود پہ بند باندھ رکھے تھے تب بھی وہ خود کو اور اپنی ازاد و اجی زندگی کو سنبھالتے میں ہری طرح ناکام رہی تھی، اور بات کھل جانے کے بعد، اظہار کو رستہ مل جانے کے بعد وہ کیسے خود پہ تنزول کر لی۔ زخم جب ناسور بن جانے تو اس پہ مرم نہیں لگتے۔ کاٹ ڈالنے ہیں۔ میں نے اسے اپنی باتوں سے یہ یقین دلادیا کہ اس کی طلاق کے بعد میں اس کی خواہش پوری کروں گا۔ اس نے طلاق لے لی، اب میرا بھائی ایک کمزور کردار کی عورت سے دور تھا اور میرا بھتیجا ایک فکس کی ماری ماں

سے محروم، یہی میرا مقصد تھا میں نے شرمین کے تقاضے پوری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے انعام سے بھرے یہ قدم اٹھالیا۔“

”اور میں کتنی بے وقوف، آسانی سے اس کی باتوں میں آ گئی۔“ وہ بے چین ہو کے اٹھ بیٹھی۔

”اور وہ اماشر! یہ میں نے کیا کر دیا۔ تم مجھے معاف کر سکتے ہو۔ بولو کیا میں معافی کے قابل ہوں۔“ وہ پھر سے میرے قریب بیٹھی۔ تاسف، بے قراری اور ملال نے اس پہ اکٹھا مل کر کر دیا تھا۔ معافی کے لفظ پہ میں مسکرا اٹھا۔

”غلطی تمہاری نہیں، یہ تو میرے اپنے اعمال تھے جو میرے آگے.....“

”کہتے کہتے میں زک سا گیا۔ مجھے اچانک یاد آ گیا کہ میرے اعمال میں صرف اتنا ہی درج نہیں، میں ابھی ابھی اور بھی بہت کچھ کر کے آ رہا ہوں وہ تصویریں، امی کے سامنے وہ زینیا کے بارے میں ہرزہ سرائی، سب مجھے یاد آئے لگا۔ میری ہڈیاں اندر سے تڑتڑا کے ٹوٹنے لگیں۔“

”میں نے اللہ سے معافی مانگی اور اس نے مجھے معاف کر دیا۔“

لیکن انسان سے بڑا جابر اور کون ہے، وہ ابھی ابھی جو کچھ میں کر کے آ رہا ہوں اس کا عمل تو مجھے کتنی صدیاں طے گا۔ اور پتا نہیں زینیا کو مجھے معاف کرنے میں کتنی صدیاں لگیں گی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ گلاب کھل رہے تھے۔

میں حیران سا ہو گیا۔

”عاشر....! تم نے میری اتنی بڑی غلطی کو اتنی آسانی سے بھلا دیا۔ تم جیج مجھ بہت اچھے انسان ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید مجھی نہیں معاف نہ کرنی۔ یہی دیکھ لو۔ ابھی بھی صرف شرمین کی باتوں میں آ کے میں کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی، حالانکہ میں تو ہمیشہ تم سے.....“ وہ پتا نہیں کیا کہنے جا رہی تھی۔ میرا دھیان تو اسی فقرے میں لنگ گیا۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں بھی معاف نہیں کرتی۔“

”میں نے ہمیشہ تمہیں چاہا ہے۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ کی تمنا کی ہے۔“

جنگی آنکھوں کے ساتھ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے سہلاتے ہوئے اس نے ایک مہکتا سا اقرار کر دیا۔ وہ اقرار جسے سننے کی میں ضد باندھے بیٹھا تھا۔ اور آج یہ ہمت اس نے کر ڈالی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی مسکراہٹ سے چھڑا لیا۔

”کیا وہاں.....؟“ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اور وہ ہر اس کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”عاشر.....! کیا تم ابھی تک ناراض ہو، میں مانگی ہوں کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کئی الزام لگائے۔ کچھ اچھالے۔ تو ڈکھ تو ہوتا ہے اور یہ ڈکھ تب ناقابل برداشت

ہو جاتا ہے جب یہ کچھ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو، جس سے آپ جیج محبت کرتے ہوں۔ عاشر اور مجھے اعتراف ہے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو مرجانی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی.... لیکن تم مجھ جیسے عام سے انسان تو نہیں عاشر تم مجھے معاف کر ہی سکتے ہو۔“

اس نے فریادی۔ میں ہلی بھر کھتا۔

”دکھو ہوتا ہے، اور یہ دکھ تب ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے جب یہ کچھ اس ہستی کی جانب سے پھینکا گیا ہو۔ جس سے آپ جیج محبت کرتے ہوں۔“ یہ فتویٰ ایسی ہی نے تو صادر کیا تھا۔ میں کیسے بھول جاتا۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں عاشر.....!“ اس کا یہ اقرار مجھے باورِ کار ہوا تھا کہ میرا دیا گیا یہ دکھا اسے کتنی نہیں دے گا۔ میں کیسے رک جاتا۔

”اور میں تمہاری جگہ ہوتی تو مرجانی لیکن تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔“ فیصلہ تو اس نے سنائی دیا تھا۔ میں کیا معافی مانگا، مجھے یہاں سے جانا ہی تھا اور میں چلا گیا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے عاشر؟“ ☆☆☆

میں جانتا تھا کسی نہ کسی دن مجھے اسی سوال کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے باوجود میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اس کا جواب کیا دوں گا۔ اور اب جب باقر بھائی جان مجھے گلے سے لگانے کے بعد یہ سوال کر رہے تھے تو مجھے اس کے سوا اور کچھ نہ سوچا کہ میں ایک بار پھر ان کے گلے لگ کے رونے لگا۔ انہوں نے بڑی حیرت سے میرے پرشمرہ چہرے پر پھیلنے آسوں کو دیکھا۔

”تمہیں ہو کیا گیا ہے عاشر! میرے بھائی، میرے بیٹے، آخر تم بتاتے کیوں نہیں۔ ہم سب سے کیا غلطی ہوئی تھی جو تم ہمیں چھوڑ کے چلے گئے؟“

میرے بیٹے، دل کی بات، دل میں رکھنے کی عادت کب چھوڑ گئے۔“ میں تب بھی کچھ نہ بولا۔ بس آٹھ ہاتھ پا۔

”تمہارے جانے کے بعد ہم لوگ کتنے پریشان ہوئے۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ان تکلیف دہ دنوں کا ذکر بھی میرے زور ٹھٹھے کھڑے کر دیتا ہے۔ میں نے ہر ہسپتال، تھانے کے پتھر لگائے۔ مایوسی کی آخری حد تک جا کے میں نے یہاں تک سوچا کہ کہیں.... خدا خواستہ تم کسی حادثے کا.... لیکن اہی جان نے مجھے ایسا نہ سونپنے دیا۔ انہیں یقین تھا کہ تم زندہ ہو۔ مگر نارض ہو۔ کسی نہ کسی بات پر زد و کوب کے چھپ بیٹھے ہو۔ وہ آخری دن تک تمہیں یاد کرتی رہیں۔ پکارتی رہیں، مگر تم نہ جانے کہاں چھپ بیٹھے تھے

کہ ان کی صدمہ تک پہنچ ہی نہ سکی۔

میرے آنسوؤں میں پہلے سے بڑھ کے شدت آ گئی۔

”لیکن ان کے جانے کے بعد بھی میں نے تمہارا انتظار نہیں چھوڑا۔“

پہلے اہی جان نے میرے اندر کسی نہ کسی دن تمہارے لوٹ آنے کی امید زندہ رکھی۔ پھر ان کے جانے کے بعد زینا نے میرے حوصلے نہ ٹوٹنے دیے۔ اہی جان تمہیں منانے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلی گئیں لیکن زینا ابھی بھی.....“

”زینا..... زینا عمر!“ میں ان کی بات کاٹ کر بے یقینی سے بولا۔

”ہاں زینا عمر، اے کی آخری وقت میں اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔ اسے پورا یقین ہے کہ ایک روز یہ دعائیں رنگ لے آئیں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے مجھ دیکھنے لگے۔ میں ہنوز ابھمن کا شکار تھا۔

”وہ ابھی.... اب بھی یہاں آئی ہے۔ اتنا سب ہونے کے بعد بھی۔“ میں حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا۔ گالوں پر بیٹھے میرے آنسو بھی حیران ہو کے تنہم گئے۔

”عاشر.....! یہ آنسو....“ بایک اور تھیلی ہے جو میں تم میں دیکھ رہا ہوں تم تو کہتے تھے، رونے ہی کی آخری حد کا اظہار ہوتا ہے۔ اور عاشر ملک کبھی بے بس نہیں ہو سکتا۔ اس کو چاہیے کوئی حد آخری نہیں ہو سکتی۔“

”بھائی جان! میں جان گیا ہوں کہ بے بسی اور عاجزی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ آخری حد جس کے نہ ہونے کا مجھے بڑا ذمہ تھا، اندھا دھند سر پٹ بھاگتے ہوئے اسی آخری حد سے ٹھوکر کھا کے میں نیچے گرا ہوں، اور اب تک نیچے گرا ان آنسوؤں سے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے خدا سے دعا مانگ رہا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے، میری خطا میں بخش دے۔ میری توبہ قبول فرمائے۔“ بھائی جان کچھ نہ سمجھے۔

”میرا خیال ہے تم آرام کرو، ہمدردی تمہیں سونے تو نہیں دیا ہوگا۔“ وہ کہتے ہوئے اُنکھ کھڑے ہوئے اور فہم کی سیٹھی کا اشارہ کیا۔ میں مسکرا دیا۔ اور فہم کا ہاتھ تھام کے اسے روک لیا۔ بھائی جان کی حیرانی بجاتی تھی۔ لیکن وہ گزرے گل کی بات تھی۔ اس گل کی، جس گل میں اس کے پاس بس ”میں“ ہی ”میں“ ہوتا تھا اور اب ان کے بھائی کی ”میں“ ہی تو ٹوٹ چکی تھی۔ اب تو بس ”تو ہی تو۔“ کہہ گیا تھا۔ اس ایک لمحے کے انکشاف نے مجھے سراپا بدل دیا تھا۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ اُنکھ کھلتے ہی میں نے خود پہ ہر طرح کی نعمتوں، آسائشوں کی برسات ہوئی دیکھی خدا کی ہر نعمت کا حراز خوب لوٹا، مگر اس سے انجان اور بے خبر رہے کہ اور جب اس ذاتِ واحد کو پہچانا تو خود سے ہی نفرت ہو گئی۔ اپنی

اس خود ساختہ جلا وطنی میں میں نے اپنے نفس کو بھوکا پیاسا رکھ کے ملامت اور پیچھے ہٹا دے کے ہزاروں کوڑے برساتے تھے۔ میں اپنے بھائی کے اس سوال کا کیا جواب دوں کہ میں کہاں رہا، میں نے کیا کیا۔ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ.....

پہلا لفظ تمام خدا کا، دووا لفظ جدائی
بعد کی گھنول وار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

☆☆☆

زینیا کے گھر پہنچے نکلے کے بعد مجھ میں اتنی ہمت تک نہ تھی کہ میں اپنے گھر جاپا تا۔ میرا پاسپورٹ، سرٹیفکیٹس، چیک بکس، سب آفس میں تھا۔ وہ سب لے کر میں سیدھا اسلام آباد چلا گیا۔ میرا امریکہ کا ویزا پچھلے سال ہی پانچ برس کی معیاد کا لگا تھا۔ نکلت لینے میں مجھے صرف دو دن لگے اور یہ دو دن میں نے ہوش کے بند کر کے میں خود کو یہ سمجھانے میں گزارے کہ معاف کر دینے والی، صرف خداوند کریم کی ہے۔ اگر مجھے معافی مانگنا ہے تو اسی سے مانگنا ہے۔ زینیا تو کہہ ہی چکی تھی کہ میں تمہاری جگہ ہوتی تو تمہیں بھی معاف نہ کرتی۔

بہی تو اللہ اور بندے کے درمیان رشتہ ہے۔ کہ ہزار نافرمانیوں کے بعد بھی اس کا دور بندے کے لیے کھلا ہی رہتا ہے جب کہ..... زینیا..... میں جب بھی یہ تصور کرتا کہ میرے جانے کے بعد کیا کیا ہوا ہوگا۔ میرے رو گئے کھڑے ہو جاتے۔ جب امی جان اور باقر بھائی جان کو وہ تصاویر ملی ہوں گی جن میں زینیا کسی انجان شخص کے ساتھ حدود درجہ بے تکلفی سے قریب ہے تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ امی جان تو فوراً یہ تصاویر زینیا کے منہ پہ مارنے چلی گئی ہوں گی۔

اور زینیا نے خود جب یہ تصاویر دیکھی ہوں گی تو اس کی اپنی حالت کیا ہوگی۔ اور جب امی جان اسے بتائیں گی کہ عاشر اس کے کروتوتوں سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ حرکت بھی میری ہے۔ ویسے بھی اس کی یہ تصاویر میرے ہی آفس کے کنکشن میں لی گئی تھیں اور ان کے ٹیکسٹ بھی میرے ہی پاس تھے۔ میرے علاوہ اور کون ان ٹیکسٹوں کو غلط مقاصد سے استعمال کر سکتا ہے۔

اور میرا راز کھل جانے کے بعد اس نے..... بس اس سے آگے میں اپنے تصور کو روک لیتا۔ سوچوں کے دروازے مضبوطی سے بند کر لیتا، ابھی اس جلا وطنی کو بڑھ سال کا عرصہ ہی گزر تھا، کہ میرے دل کو اچانک ایک بے گلی نے آن گھیرا۔ وہ ہمک ہمک کے پاکستان کی طرف لپکتے لگا۔

بے تاب ہو کے میں نے چوری چھپے کچھ اور ذرائع سے وہاں کی خبریں لیتا چاہی اور

پہلی خبر جرمی وہ چچی کہ امی جان کی وفات کو پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اٹھارہ مہینوں کے بعد میں نے خود چارویں چار ڈرامی سرکے باہر دیکھنا چاہا تھا اور اسی ڈرامی اوٹ سے اتنی گرم لو کے چمیز سے بڑے کہ میں نے گھبرا کے خود کو اور ڈھانپ لیا۔ اور کئی سال تک مجھ دوبارہ کوئی خبر لینے کی کوشش نہ کی۔

اسی روز پہلی کے عالم میں کئی سال گزر گئے کہ ایک دن اچانک نوید سے ملاقات ہوئی۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ اس کی خوبصورت بیوی اور پیاری سی بیٹی بھی اس کے ہمراہ تھی اس لیے ایک حد میں رہتے ہوئے وہ مجھے چشتی کا لیاں دے سکا۔ اس نے ویں میں ڈر رہا تھا کہ اس کے سوا لوں کے جواب کیا دل کا، لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ البتہ زبردستی میرا ایڈریس ضرور لیا۔ میں نے اس کی منتیں کی۔ ”تمہیں قسم ہے نوید بھائی جان کو میرا پتا مت دینا۔ میں امی جان کی وفات تک پتو وہاں جانے سکا۔“

اور اس نے وعدہ بھی کر لیا، بلکہ شاید کسی حد تک نبھایا بھی۔ اس نے بھائی جان کو میرے امریکہ میں ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اس کے پاکستان جانے کے صرف ایک مہینے بعد ملنے والے زینیا کے خط نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اسے میرا ایڈریس کہاں سے۔ مگر اس خط نے مجھے کچھ ایسا الجھایا کہ میں جہی کی فرصت میں پاکستان پہنچنے کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکا۔

”میں نے سرخ گلابوں کا انتظار شروع کر دیا ہے۔“ اور ساتھ ہی مجھے اس کے وہ الفاظ بھی یاد آئے۔

”سرخ پھول تو دو ہی مواقع پہنچتے ہیں، یا شادی یا یامیت پہ.....“ اور شاید وہ شادی ہی کر رہی تھی اور مجھے میرا عہد یاد دلانے کا بھی اس کا بھی یہی مقصد رہا ہوگا کہ وہ مجھے یہ جتنا کہ کسی کے لاکھ برا چاہئے ہے برا ہو تو نہیں جاتا اور میں اس کے ساتھ کچھ اچھا ہونے کی دعائیں کرتا تو فوراً کیا۔ کیا دوسرے موقع..... میں نے سر جھٹک دیا۔ ایسے کیا ہو سکتا ہے مجھے باقر بھائی جان کی بات بھی ڈسٹرب کر رہی تھی۔ ”آخری وقت اس نے ان کی بڑی خدمت کی اور بہت دعائیں لیں۔“

فہد نے بھی اس کے بارے میں چشتی باتیں کی۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ گزرے سالوں نے اسے زینیا کے اور خرب کردیا تھا وہ تو اس پچاسی حد تک انحصار کرنے لگا تھا۔ اگلے روز جب میں نوید سے ملنے اس کے آفس گیا تو جیسی میرا بھی آفس تھا تو وہ مجھے دیکھ کے نہ چونکا۔ نہ حیران ہوا

”آؤ عاشر! میں کئی روز سے تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کے

مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ اس کی گرجوٹی نے مجھے گلے کرنے پر مجبور کیا۔

”نوید، زینیا کو میرا ایڈریس تم نے دیا۔“

”ہاں۔“ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس نے اقرار کر لیا۔

”مگر کیوں۔“ میں احتجاجاً جج اٹھا۔

”پہلے تم یہ کہو کہ تم کیوں چھپتے پھر رہے ہو۔۔۔۔۔؟ کس بات کی سزا دے رہے ہو زینیا کو، اپنے بھائی کو۔۔۔۔۔؟“

”تم نہیں جانتے نوید، تم کبھی نہیں جانتے۔ اگر تم جان جاؤ تو میرے لیے اس سے کڑی سزا بخو کر دے۔“ ہاں یہ سزا میں خود ہی کو دے رہا ہوں۔“

”نہیں یہ سزا تم ان سب کو دے رہے ہو، جو تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور ہاں عاشر میں جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔“ اس نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔ میں پہلے حیران ہوا، پھر شرم سے زمین میں گر گیا۔

”تو کیا زینیا نے تمہیں بھی سب کچھ بتا دیا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں بلکہ اصل میں تو میں نے زینیا کو۔۔۔۔۔؟“ وہ زکا پھر کی جین اٹھا کے مجھے بھی اشارہ کیا۔

”چلو اٹھو، باہر نکلے ہیں، آفس میں ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔“ میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔

”جانتے ہو اس روز، اس روز جب تم جانے سے پہلے مجھ سے آخری بار ملے تھے۔“ اس نے اپنی کارڈ بوس روڈ سے نکال کر ریگیل چوک پر ڈال دی۔

”ہاں لیکن تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ میں کچھ گھنٹوں بعد کس طویل سفر پہ نکلنے والا ہوں۔“

”لیکن میں آدھ گھنٹے بعد ہی جان گیا تھا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔“ اب کار چوری جی سے ٹرن لے کر فیروز پور روڈ پہ آ گئی تھی۔

”کیا مطلب۔؟“

”یاد ہے اس دن تم نے مجھے دو لفافے بٹکوائے تھے اور کہا تھا کہ دو بچے، کوریئر سروس کا نمائندہ آ کے یہ لفافے کب کب لگے گا۔ تم نے مجھے اس کی خاص حفاظت کی تاکہ یہ کبھی۔۔۔ میں نے الٹ بلیٹ کے دیکھا ایک یہ تمہارے گھر کا ایڈریس تھا، دوسرے پہ باہر بھائی جان کے آفس کا۔ لیکن دوسری طرف بھیجنے والے کا کوئی نام وہ یہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی حیرت سے تم سے اس راز داری کی وجہ دریافت کی اور تم نے بڑے پراسرار طریقے سے سکرٹ کرے ہوئے کہا کہ تم انہیں کوئی سر براڈ دینا چاہتے ہو۔ میں نے بھی زیادہ نہ کر دیا

تمہاری اوٹ پنا گم سب پھر ہی حرکتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔“

کارا بد وحدت روڈ سے گزر رہی تھی۔ میری خالی خالی نظریں جانے پہچانے سائن بورڈز کو سرسری سا دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ منوں دن پوری سفاکی کے ساتھ ذہن کے پردے پر میری تمام تر منوں حرکات کے ساتھ ابھرا تھا۔

”اس دن تصاویر بیک کرنے کے بعد میں نے اپنی مخصوص کوریئر سروس کو فون کیا۔ اسے دو بجے آنا تھا۔ جب کرا بھی۔۔۔ میں نے ناہم دیکھا اور سوچا کہ کہیں اس کے انتظار میں دیر نہ ہو جائے۔ میں آج ہی زینیا سے آخری ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ آفس نہیں آئی تھی۔ کل تک بہت دیر ہو جاتی کچھ گھنٹوں بعد میں اسے ہرانے والا تھا اور مجھے تو اس کو مارنے سے کچھ دیر پہلے دیکھنا تھا۔ میں نے تصاویر والا لفافہ نوید کے حوالے کیا اور خود زینیا کے گھر چلا گیا۔ نوید کی ذمہ دارانہ فطرت پہ مجھے یقین تھا اور کوریئر سروس کی بروقت سروس پہ بھی بھروسہ تھا۔

پہلے جس وقت میں شکستگی سے دو چار شرم اور ذلت سمیٹے اس کے گھر سے نکلا۔ اس نے پچھلے انداز سے وہ مطابق وہ تصاویر اپنے مقام پہ پہنچ چکی تھیں اور میں چوروں کی طرح اپنا من چھپا کے دیاں سے بھاگ نکلا۔ ”کیا وہ تصاویر۔۔۔۔۔؟“ میں نے گردن موڑ کے نوید کو دیکھا۔ کارا بچ زانو پا پھل کے آگے سے گزر رہی تھی۔

”وہ لفافے میرے بالکل سامنے تھے اور میں نیوز پیپر کا مطالعہ کرتے ہوئے کافی بی رہا تھا کہ اچانک مجھے نہیں کیسے کافی میرے ہاتھ کے بالکل قریب رکھے لفافے پہ چٹک لگی۔ یہ تمہارے گھر کے ایڈریس والا لفافہ تھا۔ کافی کچھ اس بری طرح چٹکی تھی کہ ایڈریس تقریباً چھپ ہی گیا تھا اور مشکل سے بھی بڑھانہ جا رہا تھا۔ میں نے وہ لفافہ تبدیل کرنے کا سوچتے ہوئے سائیڈ دروازے ایک نیا لفافہ نکالا اور اس پہ تمہارے گھر کا ایڈریس لکھا، جیسے ہی اس لفافے کے اندر موجود تمہارا ”سر براڈ“ نکالنے کے لیے میں نے اسے چاک کیا، چند تصاویر پھیل کے میری گود میں آ کر گریں۔ ان چار تصاویروں میں سے تین کی پشت میری جانب تھی جب کہ ایک تصویر میں زینیا، بائیں گروپ آف انڈسٹریز کے بہروز کے گلے کا ہار بھی مجھے حیرت زدہ کر گئی۔

حیرت کی ایک وجہ تو زینیا عمر جیسی لڑکی کی ایسی تصویر کا ہونا تھا۔

حیرت کی دوسری وجہ ان تصاویر کا تمہارے پاس ہونا تھا۔

اور حیرت کی تیسری وجہ یہ تھی کہ ان تصویروں کو تم اپنے ہی گھر کیوں بھیج رہے تھے۔ میں نے جس کا شکار ہو کے دوسرا لفافہ بھی کھول لیا اس میں بھی یہی کچھ تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن میری سوچ کو کوئی سراہا تھا نہ لگ رہا تھا، ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی

تھی جس کو بنیاد بنا کے تم ایسا کرتے۔ میں نے وہ تصاویر کو برسرِ مدرسہ والے کے حوالے نہ کیں۔ میں تم سے بات کرتا چاہتا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے تم کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو۔ تمہارے ذاتی معاملے کا مجھ سے لینے پہ چاہے مجھے تمہاری کتنی ہی بری محلی کیوں نہ ہو۔ میں تم سے اصل بات اگلوں کے رہوں گا۔ آخر یہ ایک لڑکی کی عزت کا معاملہ تھا۔ تو مجھے ان تصاویر کی حقیقت کے بارے میں ہی شک و شبہ تھا اور بالفرض اگر ایسا سچ بھی ہوتا تو تمہیں اس کو مشتہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تمہاری کچھ نہ گنتی تھی۔ تمہارا اس کی اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

میں تمہارا انتظار کرتا رہا مگر تم نہیں آئے، نہ اس دن نہ اس سے اگلے دن، میرا انتظار لہسا ہوتا چلا گیا۔ باقر بھائی اور چچی کی بار بار مجھ سے پوچھنے آئے۔ میں کیا کہتا۔ میں خود لاعلم تھا۔ دوسری طرف زینیا کی عروغ پہ پہنچی بے تابی مجھے اور حیران کر رہی تھی۔ اسے تمہارا انتظار کیوں تھا۔ ”نوید نے اسلیک رنگ ٹھمایا۔ گاڑی کی پیس کی نہر کے کنارے سبک خراشی سے رواں دواں تھی۔

”کچھ روز بعد چچی سے بھی علم ہوا کہ باقر بھائی کے لیے زینیا میں انٹرنلڈ تھیں، لیکن زینیا نے پہلے اقرار اور پھر انکار کر کے یہ باپ ہی ختم کر دیا۔ یہ انکشاف مجھے کچھ اور حقیقت پہ مجبور کر لیا۔ زینیا نے ریزائن دے دیا تھا مگر وہ قوتار سے تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مجھ سے مسلسل رابطے میں تھی۔ ایک روز میں نے اسے دھڑلایا۔ وہ بے حد کمزور ہو رہی تھی۔ جذباتی طور پر بھی اور نفسیاتی طور پر بھی، زیادہ مزاحمت نہ کر سکی اور اس نے میرے سامنے اقرار کر لیا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور اسی سے کسی بات پر ناراض ہو کے تم نے خود کو لاپتا کر لیا ہے۔“ اتنا کہنے کو نوید نے میری طرف دیکھا۔

”کیا اب بھی میں نہ سمجھتا۔ تم اسے چاہتے تھے اور وہ تمہیں اگر چچی کی وجہ سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو رہی تھی تو اسے طریقے سے بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ تم ان سے بات تو کر کے دیکھتے، کیا وہ تمہاری نہانتیں۔ آخر تم نے یہ کیوں کیا کہس لیے۔ اگر وہ تصاویر.... سوچو ذرا زینیا پہ کیا گزرتی آخر اتنی سیدی سادی کہانی میں تم نے اتنی پیچیدگیاں کس لیے پیدا کیں۔“ بات اتنی سادہ نہیں تھی۔ ”میں نے کہا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ کچھ پیچیدگیاں میں نے خود پیدا کیں اور کچھ خود بخود پیدا ہوئی چکی گئیں۔

”کیوں نہیں تھی۔ تم اس سے محبت کر رہے تھے۔ ہے نا۔ بس اتنا کہہ دیتے چچی سے۔ اس فضول حرکت کی کیا وجہ۔ یہ محبت کا کون سا انداز ہے۔“

”محبت..... میں نے محبت کب کی نوید۔ میں تو پلاننگ کرتا رہا ایک نفع بخش

سودے کے لیے دو درود چار کرنے کی سوچتا رہا۔ جب مجھے خسارے کا اندیشہ ہوا تو میں نے بے ایمانی کر کے منافع خوری کا سوچا۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”تمہیں عاشر! یہ محبت ہی تھی۔ تمہیں پتا بعد میں چلا، احمق انسان تمہیں اس سے محبت نہ ہوتی تو اس کے لیے ایک بار بار سوچ لینے کی غلطی تمہیں اتنا نہ ستاتی کہ تم یوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اب بھی وقت سے لوٹ جاؤ اس کے پاس وہ تمہارے انتظار میں ”لوٹ جاؤں، اس کے پاس۔ وہ میرے انتظار میں ہے۔ اگر میں تمہارے اس دلاسے کو کچھ بھی جان لوں تو نوید جب وہ میری سچائی جان لے گی تو تب۔ تب کیا اسے اپنے اس انتظار پہ افسوس نہ ہوگا۔“

”کیسے جانے گی۔ کون بتائے گا اسے؟“ چچی اور بھائی جان تک یہ سارا معاملہ کبھی پہنچایا نہیں۔ میں..... میں وہ تصاویر ایسی دلی جلا بیٹھا تھا جس دن زینیا کے اقرار پہ میں نے یہ ساری تسلی سمجھ لی تھی اور کون ہے۔ کیا تم یہ تم پر گزرا ہے یہ نہیں بتاؤ گے ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ وہ پہلے تو ہنی ہوئی ہے۔ ہمیری ہوئی ہے اسے یہ غلط فہمی ہے کہ تم اس کی غلطی معاف نہیں کر پائے۔ وہ وہ خود پیچہ تادوں میں گھری ہوئی ہے۔“

”کیا واقعی اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے۔ کیا واقعی..... مجھے اس نے معاف کر دیا ہے، نوید میں نے سوچا تھا جب میں اپنی زندگی میں کوئی خوش کن خبر سنوں گا تو جان باؤں گا۔ میرے بچوں سے رائیگاں نہیں گئے۔ میری دعائیں قبول ہوئیں۔ اور اس سے ڈی خوش خبری، میرے لیے اور کیا ہو سکتی کہ وہ گناہ جس کے کرنے کے میں تمام ارادے کر آیا تھا، خدا نے وہ گناہ میرے نصیبوں میں ہونا لکھا ہی نہیں تھا۔

”وہ اللہ ہے عاشر..... اللہ..... ستر ماؤں سے بڑھ کے پیار دینے والا، تم نے نجانے کس دل سے اسے یاد کیا کہ اس نے اپنی رحمت سے تمہارے دامن پہ گمناہ کا یہ داغ گلے پہ نہ دیا۔ اور اتنے سال..... درمیان کے نہ اتنے سال شاید تمہیں لکدن بتانے کے لیے تھے، پہلے بھی تم نے محبت کی تھی۔ اب بھی تم محبت کرتے ہو لیکن اب تم صرف محبت کر ہی نہیں سکتے۔ اسے بھابھی سکتے ہو۔ تم نے خوب سزا بھگت لی۔ اور انجانے میں اس لڑکی کو بھی دے دی۔ اب لوٹ چلو..... اور اس کی سزا بھی ختم کر دو..... اس کے دل سے یہ کچھ تاد جاتا رہے کہ وہ تمہارا دل دکھانے کا سبب بنی۔“

”کتنی عجیب سی بات ہے نا نوید۔ میں تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس سے من چھپانے پھر رہا تھا۔ اس سے معافی نہ ملنے کا خوف مجھے بھگا لے رکھا اور وہ..... وہ بھی اتنے ہی سال اسی آگ میں جلتی رہی، اسے بھی یہی پیچہ تادے تھے۔ کتنی عجیب سی بات ہے ہم دور رہے، انجان رہے۔ لیکن ہمارے جذبات ہمارے احساسات ایک رہے۔“

میں نے پرسکون ہو کے اپنا سر ٹیک لیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ نوید نے کیمپس سے اب کار ڈاکٹرز ہاسپٹل۔“ کی طرف موڑ لی تھی۔ یہ وہی ہاسپٹل تھا جہاں سے واک کرتے ہوئے میں زینیا کو پہلی بار اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ میں سمجھ گیا، نوید مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

اداسی تم اسے کہنا
اکیلا تو نہیں دکھ میں
تیرا کچھڑا ہوا
اُجڑے ہوئے شہروں میں اکثر بھاگتا پھرتا ہے
اکثر بھاگتا پھرتا ہے

اور اداسی

تم اسے کہنا
تسہی دکھ میں نہیں ہو
ہم بھی اپنی راہ
ہاتھوں میں لیے
سسکیاں لیتی ہوئی۔

تہائیوں کے بال کھولے بین کرتے ہیں

”بس اب..... بس کر یہ تہائیوں کے نوچے، اداسیوں کی باتیں۔“ نوید نے میری خود کلامی پہ مجھے ٹوکا۔

”بو تھا درست کر لے اور جیسا میں نے کہا ہے ویسے ہی کر، جب اللہ کو تیرا پردہ منظور ہے تو کیوں اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھے کھودتا ہے۔ وہ صرف رحیم و کریم ہی نہیں، ستار و غفار بھی ہے۔ تمام عیوب ڈھک دینے والا، خبردار جو تم نے کوئی حماقت کرنے کی کوشش کی۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے اسے روکا۔ ”ذرا یہاں سے ٹرن لینا۔“ وہ اس اسٹریٹ میں مڑنے ہی والا تھا جب میں نے اسے سامنے کی مارکیٹ تک جانے کا اشارہ دیا۔
”وہاں کیوں؟“ وہ چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ میرے لبوں پہ عرصے بعد..... یا شاید پہلی بار ایک کچی مسکراہٹ کی دھوپ پھیلی۔

”وہاں..... فلاور شاپ پہ..... مجھے گلاب لینے ہیں۔ سرخ گلاب.... زینیا کے لیے۔ سارے کے سارے گلاب.....“

